جنوری تا مارچ 2024ء

فیضانِ ادب (سہ ماہی)

بین الاقوامی علمی، ادبی اور تحقیقی جریدہ

جلد نمبر: 9 شمارہ: 1



مدیر (اعزازی)

ڈاکٹر فیضان حیدر



Rs:250

ادارہ تحقیقات اردو و فارسی، پورہ معروف، کرتھی جعفرپور، مئو، یو. پی. 275305

فیضانِ ادب (سہ ماہی) جنوری تا مارچ 2024ء ڈاکٹر فیضان حیدر

RNI: UP/URD/2018/74924 ISSN: 2456-4001

Quarterly

FAIZAN-E-ADAB

An International Refereed Research Value Journal with Impact Factor: 3.49

Vol. IX, Issue: I, January to March 2024

For latest issues of FAIZAN-E-ADAB visit at www.uprorg.in

Editor (Honorary)

Dr.FAIZAN HAIDER

Printed and published by Dr. Faizan Haider on behalf of Urdu And Persian Research Organization, and printed at Scrino Printers, Farooqui Katra, Sadar Bazar, Maunath Bhanjan, and published at Urdu And Persian Research Organization, Purana Pura, Kurthi Jafarpur, Mau, U.P. 275305, Editor: Dr. Faizan Haider, E-Mail: faizanhaider40@gmail.com

سہ ماہی

فیضانِ ادب

بین الاقوامی علمی، ادبی اور تحقیقی جریدہ

جلد نمبر 9 شمارہ 1

جنوری تا مارچ 2024ء

مدیر (اعزازی)

ڈاکٹر فیضان حیدر

ادارۂ تحقیقات اردو و فارسی، پورہ معروف، کرتھی جعفرپور، مئو، یوپی 275305

Quarterly *FAIZAN-E-ADAB*
An International Refereed Research Value Journal with
Impact Factor: 3.49
Vol. IX, Issue: I, January to March 2024
RNI: UPURD/2018/74924 —— ISSN: 2456-4001
Website: www.uprorg.in

قیمت: فی شمارہ 250 روپے ☆ سالانہ: 1000 روپے (صرف رجسٹرڈ ڈاک سے)

تخلیقات اور مضامین faizaneadab@gmail.com اور info@uprorg.in پر روانہ کریں۔

ممبر شپ کے لیے بار کوڈ کے ذریعہ یا بینک اکاؤنٹ میں آن لائن رقم ٹرانسفر کی جاسکتی ہے۔

Account No.: 735801010050190, Name: FAIZAN E ADAB, Union Bank of India, Kurthi Jafarpur Branch, Ifsc : UBIN0573582, UPI ID: 8707337737@uboi



- مقالہ نگاروں کی آرا سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔
- مقالوں کی ایڈیٹنگ میں ادارہ آزاد ہے۔
- 'فیضان ادب' کے مکمل حوالے کے ساتھ مضامین یا اقتباسات نقل کیے جاسکتے ہیں۔
- تمام تر قانونی چارہ جوئی صرف مئو کی عدالت میں ہی ممکن ہے۔

فہرست

اداریہ

احتجاج کسے کہتے ہیں؟ یہ سوال اکثر و بیشتر ہمارے ذہن میں ابھرتا ہےلیکن اس کا تشفی بخش جواب نہیں مل پاتا۔ احتجاج کی تعریف میں کہا گیا ہے کہ بالا دست یا کسی خاص گروہ یا فرد کی کسی ناپسند بات یا عمل کے خلاف تقریراً یا تحریراً ناراضگی کا اظہار کرنا۔یعنی اگر کوئی گروہ یا فرد کسی گروہ یا فرد پر ناجائز الزام لگائے یا آئین کے خلاف کوئی حکم نافذ کرے تو اس کے خلاف ڈٹ کر مقابلہ کرنے کا عمل احتجاج کہلاتا ہے۔ یہ مقابلہ تحریر، تقریر یا ناراضگی کی صورت میں ہوسکتا ہے۔

کسی بھی واقعے ، حادثے یا بات کے درست ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کرنے کے لیے عقل وشعور کا ہونا لازمی ہے۔ کیوں کہ جب کوئی بات کسی پر نافذ کی جائے تو کم از کم یہ جاننا ضروری ہے کہ یہ بات آئینی ہے یا نہیں اور اگر آئینی نہیں ہے تو اس کے خلاف احتجاج کرنے کا حق ہر ایک کو حاصل ہے۔

جب ہم انسانی جذبات و احساسات اور خواہشات کا باریکی سے مطالعہ کرتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ محبت ونفرت، خوشی وغم اور اس قسم کے جذبات واحساسات کی طرح احتجاج بھی ایک ایسا جذبہ ہے جو انسانی سرشت میں ودیعت کیا گیا ہے۔ جب کوئی کسی پر ظلم کرے یا کسی کا جائز حق مار لے تو فوراً ہمارے دل میں اس کے تئیں نفرت کے جذبات ابھرتے ہیں اور ہم اپنی بساط بھر اس کے ظلم و جور کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ احتجاج انسان کے لاشعور کی حد تک جاگزیں ہوتا ہے جس سے کسی بھی حالت میں فرار ممکن نہیں ہے۔

تاریخ کے اوراق کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہر دور میں لوگوں نے اپنا جائز حق حاصل کرنے کے لیے احتجاج کیا ہے۔ تاریخ اسلام کا عظیم سانحہ جسے سانحۂ کربلا کے نام سے جانا جاتا ہے، وہ بھی درحقیقت مطلق العنانیت اور ظلم و بربریت کے خلاف احتجاج تھا جس میں مٹھی بھر افراد حق کو بچانے کا جذبہ لے کر ہزاروں کے لشکر کے ساتھ معرکہ آرا ہوئے اور تپتے ہوئے صحرا میں یہ بتا دیا کہ جب ظلم و جور اور مطلق العنایت اپنے شباب پر پہنچتی ہے تو خود نبی کا نواسہ اس کے خلاف اپنے انصار اور اعزا و اقربا کے ساتھ سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر کھڑا ہوجاتا ہے اور حق کا پرچم بلند کرنے کے لیے نہ صرف اپنی قربانی پیش کرتا

ہے بلکہ اپنے انصار اور اعزا کی بھی جان کی بازی لگا دیتا ہے۔ تاریخ عالم کا یہ عظیم سانحہ آج بھی لوگوں کے لیے نمونۂ عمل ہے۔ شعرا و ادبا نے بھی اپنے اشعار اور تحریروں میں اس سانحے کو بطور استعارہ پیش کیا ہے۔

ہم نے اپنے پیارے ملک کو فرنگیوں سے آزاد کرانے کی کیوں ٹھانی تھی؟ اس کی بنیادی وجہ فرنگی حکام کی ہمارے عوام پر ظلم و جبر اور بڑھتی ہوئی بربریت تھی۔ چنانچہ ہمارے بزرگوں نے اس ظلم و جبر کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور جان تک کی بازی لگا دی تاکہ ہم چین اور سکون سے زندگی گزار سکیں۔ ایسے ان گنت شہیدانِ آزادی ہیں جن کے نام تک ہم تک نہیں پہنچے۔ ہمیں ان گم نام شہیدانِ آزادی کو عوام سے روشناس کرانا چاہیے اور آنے والی نسلوں کو یہ درس دینا چاہیے کہ جب ظلم و جبر اور بربریت اپنے شباب پر پہنچتی ہے تو ایسے الٰہی اسباب پیدا ہوجاتے ہیں جن سے بانیان ظلم و جبر و بربریت کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔

تاریخ انسانیت میں ایسے کئی حکمراں ملیں گے جنھوں نے عدل و انصاف اور امن کے قیام کے لیے کوششیں کیں اور ان کا نام آج بھی زندہ ہے۔ اسی طرح تاریخ کے اوراق میں ہم نے ایسے بہت سے حکمرانوں کو پڑھا ہے جنھوں نے مظلوم عوام کو ظلم و جبر و تشدد کا نشانہ بنایا، لیکن مظلوم کی آہ ظالم کے غرور کو کچل دیتی ہے اور اس کے خوابوں کے محل تباہ و برباد کر دیتی ہے۔ شاید اسی لیے ساحر لدھیانوی نے کہا تھا۔

ظلم پھر ظلم ہے بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے   خون پھر خون ہے ٹپکے گا تو جم جائے گا

....

جنوری تا مارچ ۲۰۲۴ء کا شمارہ آپ کی نظروں کے سامنے ہے۔ ہمیں خوشی ہورہی ہے کہ مجلّے نے اپنی کامیابی کے آٹھ سال مکمل کر لیے اور اب نویں سال میں داخل ہوگیا ہے۔ زیر نظر شمارے میں قارئین کی ادبی تسکین کا سامان جمع کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی ہے۔ 'تحقیق و تنقید' کے تحت کئی اہم مضامین شامل کیے گئے ہیں جن میں وسیم حیدر ہاشمی کا 'اردو ادب میں رام کتھا' اور ڈاکٹر نور اشرف کا 'شیخ عبدالرحمن چشتی اور تذکرۂ مرآۃ مسعودی' خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ 'نقش ہائے رنگ رنگ' ساجدؔ جلال پوری، نسیم بانو تمنّاؔ اور ڈاکٹر غضنفر اقبال کی تحریروں سے مزین ہے۔ 'قند مکرر' میں علامہ محمد اقبال کی مشہور زمانہ نظم 'جبریل و ابلیس' شامل کی گئی ہے۔ اسی طرح 'طاق نسیاں سے' کے تحت ڈاکٹر سید نقی عباس (کیفی) کا مضمون 'کتاب خانۂ ملی تاجیکستان میں برصغیر کے فارسی مخطوطات' کو جگہ دی گئی ہے۔ مجلّے کا آخری حصہ تعارف و تبصرہ پر مشتمل ہے۔

یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ اب تک جو بھی مضامین موصول ہوتے رہے ان میں سے اکثر میں تلخیص اور کلیدی الفاظ نہیں تھے جس کی وجہ سے یہ بار گراں حقیر کو ہی اٹھانا پڑا۔ اس لیے گزارش ہے کہ مضامین تلخیص اور کلیدی الفاظ کے ساتھ ہی ارسال کیے جائیں۔ بصورت دیگر مضامین کی اشاعت ممکن نہ ہوگی۔

(فیضان حیدر معروفی)

وسیم حیدر ہاشمی
کریم کنڈ، شوالہ، وارانسی۔ رابطہ نمبر:9451067040

اردو ادب میں رام کتھا

(’رامائن کا ایک سین‘ از پنڈت برج نرائن چکبست کا مطالعہ)

تلخیص:

مضمون کا ہدف اردو ادب میں رام کتھا کے ساتھ چکبستؔ کی ایک مشہور زمانہ نظم ’رامائن کا ایک سین‘ کے مطالعہ کے علاوہ اس نظم کے توسط سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ چکبستؔ، میر انیسؔ کی شاعری سے اس درجہ متاثر تھے کہ انھوں نے اپنے کلام اور خاص طور سے متذکرہ مسدس پر میر انیسؔ کی زبان اور روزمرہ ہی نہیں بلکہ ان کے اسلوب کا بھی زبردست اثر قبول کیا ہے۔ کہیں کہیں ان کے کلام پر انیسؔ کے کلام کا دھوکا ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر چکبستؔ کا انتقال اتنی کم عمری میں نہ ہو گیا ہوتا تو شاید موصوف پوری رام چرِت مانس کا ترجمہ اردو نظم میں کر ڈالتے، جو اردو شاعری کے ذخیرے میں ایک بڑا اور مہتم بالشان اضافہ ہوتا۔ اس مضمون میں شروع سے اخیر تک یہی کوشش کی گئی ہے کہ چکبست میر انیس سے حد درجہ متاثر تھے۔ چنانچہ مثال کے طور پر جہاں جہاں بھی چکبستؔ کے اشعار پیش کیے گئے ہیں، وہاں وہاں میر انیسؔ کے مراثی کے وہ بند بھی نقل کر دیے گئے ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے موصوف کی متذکرہ نظم میر انیسؔ سے استفادہ کا نتیجہ ہے، جس میں موصوف حد درجہ کامیاب رہے ہیں۔ چکبستؔ کا ایک شعر ’’زندگی کیا ہے۔۔۔‘‘ کے بارے میں یہ بتانے کی کوشش کہ متذکرہ شعر ہندی کے دو اشعار کا اردو میں لائق داد و تحسین ترجمہ ہے، جس کے سبب بے ثباتی عالم کے ضمن میں یہ شعر منفرد حیثیت کا حامل بن گیا۔

کلیدی الفاظ:

رام چرت مانس، مِتّن لعل، کاشی اِستُتی، چشمۂ رحمت، پرمیشور، بالمیکی رامائن، مریادا پُرشوتم، بن باس، دشرتھ، کوشلیا، کیکائی، ہنومان، تلسی داس، چکبستؔ، پنچ بھوت، راون، انیسؔ، بید، تصویر سنگ۔

بھگوان شری رام کی عظمت اور بڑکپن کی قبولیت کے سلسلے میں آج ہزاروں تحریری ثبوت کتابی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ اپنی ایک چھوٹی سی نظم میں ان کو ڈاکٹر اقبال جس پیار، بڑکپن اور عظمت کے ساتھ یاد کرتے ہوئے خراج عقیدت پیش کرتے ہیں وہ ہر نہج سے لائق داد و تحسین ہے۔ موصوف کے خیال کو ان کی ایک چھوٹی مگر نہایت جاذب و جالب نظم میں ملاحظہ فرمائیں۔

لبریز ہے شرابِ حقیقت سے جامِ ہند — سب فلسفی ہیں خطۂ مغرب کے رامِ ہند
یہ ہندیوں کی فکر فلک رَس کا ہے اثر — رفعت میں آسماں سے بھی اونچا ہے بام ہند
اِس دیش میں ہوئے ہیں ہزاروں ملک سرشت — مشہور جن کے دم سے ہے، دنیا میں نام ہند
ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز — اہل نظر سمجھتے ہیں اُن کو امام ہند
اعجاز اس چراغ ہدایت کا ہے یہی — روشن تر از سحر ہے زمانے میں شام ہند
تلوار کا دھنی تھا، شجاعت میں فرد تھا — پاکیزگی میں، جوش محبت میں فرد تھا

اردو میں رام کتھا کے تعلق سے اس مضمون میں راقم الحروف جن اہم کتب کا ذکر کرنے جا رہا ہے ان میں سب سے پہلے ایک ایسی کتاب کا نام لینا چاہوں گا جو ۱۸۷۳ء میں بنارس کے لائٹ پریس سے شائع ہوئی تھی۔ تعجب یہ ہے کہ راقم کی معلومات کے مطابق ملک میں چند لوگ ہی ایسے ہیں جس نے یہ کتاب دیکھا یا اس کے بارے میں سنا ہوگا۔ اس کتاب کا نام ’کاشی اِستُتی‘ ہے، جو کلاسیکی فارسی کے تقریباً ۱۴۰۰ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں کاشی کی ایسی عمدہ تعریف کی گئی ہے کہ جس کے بارے میں مُنشی بشیشر پرساد متخلص بہ وارؔ، فرماتے ہیں کہ ایسی نظم نہ تو کسی نے آج تک دیکھی نہ سنی ہوگی۔ کاشی استت کے شاعر کا نام لالہ مِتّن لعل اور تخلص آفریںؔ ہے، جو کہ پریاگ راج (الہ آباد) کے مستقل باشندہ تھے۔ موصوف ایک حادثہ کے سبب ثم بنارسی ہو گئے تھے۔ کتاب کے حاشیہ پر لکھے تذکرے کے مطابق ان کے ایک جواں سال بیٹے، جس کا نام کاشی پرساد تھا، کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس کا غم غلط کرنے کے لیے آفریںؔ بنارس آ گئے تھے اور اپنا زیادہ تر وقت پوجا پاٹھ، گنگا اشنان اور مندروں کے درشن میں گزارنے لگے۔ متذکرہ مثنوی، جس کا نام ’کاشی استت‘ ہے، وہ انھوں نے اپنے اسی فوت شدہ بیٹے کاشی پرساد کی یاد میں لکھی تھی۔ تذکرہ نگار مُنشی بشیشر پرساد وارؔ نے کاشی اِستُت کے شاعر کے تعلق سے جو کچھ لکھا ہے وہ اسی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

’’۔۔۔افصح الفصحا، ابلغ البلغا، مرکز محیط کیاست، معدن دانائی و فراست، شاعر شیریں زبان،

موجد نسخائے نو آئین، لالہ متن لعل متخلص بہ آفرین، مصنف مثنوی کتاب کاشی استت آن کہ بندۂ خاکسار بشیشر پرساد متخلص واراز جین بدست آمدن ۔۔۔ باد فقط۔'' [ص ۲]

اپنی کاشی اِستُت کے آغاز کے دو اشعار میں آفرینؔ، بسم اللہ کے بعد بھگوان رام کا تعارف جس طرح کرواتے ہیں وہ لائق ستائش ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

قشقہ بر رویش خط لوح قدیم   بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(ترجمہ: لوح قدیم پر جو نشان بنا ہوا ہے، وہ ماتھے پر لگے ہوئے قشقہ (تِلک) کے مانند ہے، جس کا آغاز بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے ہوا ہے۔) متذکرہ مثنوی کا اگلا شعر کچھ اس طرح سے پیش کیا ہے کہ لفظ 'رام' کے وجود اور وسعت کا ذکر بڑے قرینے اور فخر ومباہات کے ساتھ کیا گیا ہے۔ وہ شعر ملاحظہ فرمائیں۔

بنام آن کہ نام اوست ہر نام   بہ فرمانش زمین و آسمان رامؔ

(ترجمہ: اُسی خدا کے نام سے کہ جس کا نام 'اوم' ہے، اُسی کے حکم سے زمین سے آسمان تک رام کا وجود قائم ہے)

اس مضمون کی تیاری کے سلسلہ میں مَیں مختلف لائبریوں کے علاوہ یہاں وہاں بھی بھٹک رہا تھا کہ ایک روز اچانک میرے ایک عزیز دوست منصور احمد خان کا پریاگ راج (الہ آباد) سے فون آیا۔ خان صاحب پریاگ راج کے 'دولت حسین مسلم انٹر کالج' میں مدرس ہیں۔ وہ اکثر مجھے اردو ادب سے متعلق اچھی اور نئی جانکاریاں موبائل فون کے WhatsApp پر ارسال کیا کرتے ہیں۔ کچھ دنوں قبل موصوف نے اردو میں ترجمہ شدہ ایک ایسی رامائن کے بارے میں جانکاری دی، جو میرے لیے قطعی نئی اور معلوماتی تھی۔ یہ جانکاری پاکر میں بہت خوش ہوا۔ موصوف سے راقم السطور کو جو معلومات موصول ہوئیں اس کا عنوان 'غازی پور میں شری رام اور بالمیکی رامائن' از عبید الرحمٰن صدیقی (تاریخ نگار اور مصنف) ہے۔ موصوف نے راقم کو جو معلومات ہندی (دیوناگری رسم خط) میں ارسال فرمائی ہیں اس کے اردو ترجمہ کے مطابق ''۱۸۶۹ء میں قائم شدہ 'چشمۂ رحمت اورینٹل کالج' کے کتب خانہ میں بہت سے فارسی، اردو، سنسکرت اور عربی کے مخطوطات محفوظ ہیں۔ اس میں اردو رسم خط میں ایک بالمیکی رامائن ۱۸۶۷ء میں شائع شدہ ہے، جو لکھنؤ کے پریس نول کشور سے شائع ہوئی ہے، جس میں کل ۵۲ ۳/صفحات ہیں۔ دراصل غازی پور کے محلہ میاں پور کے باشندہ ڈپٹی کلکٹر دیبی پرساد صاحب کے کہنے پر محلہ رائے گنج کے باشندہ ہر بخت گیانی پرمیشور دیال سے اردو زبان میں ترجمہ کروایا گیا تھا۔ جیسا کہ کتب کے تحفظ کے لیے آج ISBN نمبر لیا جاتا ہے، اس وقت کتب کی رجسٹری ہوا کرتی تھی۔ اس اردو بالمیکی رامائن کے سرورق پر تحریر ہے کہ ''حقوق بحق مصنف رہے،

اسی خیال سے اس کتاب کی رجسٹری حسب ایکٹ ۲۵، ۱۸۶۷ء نومبر ۱۰ کے تحت کروائی گئی ہے تاکہ دوسرا کوئی اس کو شائع نہ کرواسکے، ورنہ قانونی چارہ جوئی کی جائے گی۔''

ہندو عقائد میں مروجہ پُرشوتّم شری رام کا کردار جاننے اور سمجھنے کے لیے پہلے مدرسوں اور گروکلوں کے نصاب میں شامل تھا۔ اس رامائن کا اب ایک نسخہ مدرسہ چشمۂ رحمت کے کتب خانے میں موجود ہے۔ اس کے مطالعہ سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ تھیٹر آرٹ میں بھی اس کا استعمال کیا جاتا تھا۔ اس کتاب کا ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ اس میں اردو زبان کے ساتھ ہی کہیں کہیں سنسکرت اور ہندی زبان کا بھی استعمال کیا گیا ہے۔ اس میں رام کتھا کے پلاٹ بہت دلچسپ ہیں۔ اس میں ایک مقام پر بیٹے کے تصور کا ذکر کیا گیا ہے جو سبھی کا پیارا ہے اور پوری طرح سے مثالی کردار ہے۔ فخر اور عزم کی ذمہ داری نبھانے کے لیے گھر سے نکلنے سے قبل اپنی ماں کی دعاؤں کے علاوہ اپنے ساتھ اور کچھ نہیں لے جاتا۔ بس، اتنا کہتا ہے کہ جب تک خدا کی مہربانی قائم رہے گی تب تک وہ جنگل کے ماحول میں بھی اپنی والدۂ گرامی قدر کی موجودگی محسوس کرتا رہے گا۔

اُس کا کرم شریک اگر ہے تو غم نہیں
دامان دشت، دامنِ مادر سے کم نہیں

اور اخیر میں۔

رسم و رواجِ رام سے عاری ہیں شر پسند
راون کی نیتیوں کے پجاری ہیں شر پسند

غازی پور کی کچہری میں ہر بخت گیانی پرمیشور دیال صاحب مختار تھے اور فارسی، اردو کے ساتھ سنسکرت زبان کے بھی مہتم بالشان عالم تھے، جنھوں نے شری رام، ماتا سیتا، لکشمن، راون، ہنومان کے کرداروں کے ساتھ مختلف سیاق و سباق بھی بحُسن و خوبی بیان کیے ہیں۔ بعد ازآں کتاب کے سفید اور سیاہ سرورق کے علاوہ ایک عدد درمیانی صفحہ کی رنگین تصویر پیش کی گئی ہے۔ درمیانی رنگین صفحہ کے عنوان کی جگہ 'رامائن بالمیکی' درج ہے۔ داہنی جانب مہارشی بالمیکی ایک چھوٹی سی چوکی پر براجمان ہیں اور ان کے سامنے پانچ دیگر افراد بیٹھے ہیں۔ بائیں کونے پر 'ساتواں کانڈ' لکھا ہوا ہے۔ یہ سب کچھ متذکرہ نصف صفحہ کے اوپری حصہ میں ہے اور اس کے نیچے کے نصف صفحہ پر جو تصویر بنی ہوئی ہے اس کے دائیں اور بائیں جانب بنے برامدے کے اوپر ہنومان جی اپنے کاندھے پر گدا رکھے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔ اس صفحہ کے درمیانی حصہ میں اردو میں جو سطریں درج ہیں، وہ ذیل ہیں:

''ہر بھگت جنوں اور مہاتماؤں کے رام چرتر سننے کے لیے مُنشی دیبی پرشاد صاحب بہادر

ڈپٹی کلکٹر غازی پور نے ہری بھگت گیانی پر میشور دیال صاحب مختار سے اردو بھاشا میں ترجمہ کروایا بجانب محتشم عالیہ ۔۔۔حق ترجمہ، اس کے پہلے چند بار مطبع مُنشی نول کشور پریس میں طبع ہوئی اور اب بسر پرستی عالی جناب مُنشی تیج کمار صاحب بھارگو مالک مطبع دوم اقبالہ بااہتمام ڈی۔ ایم۔ مصرا سپرنٹنڈنٹ، مطبع تیج کمار وارث نول کشور پریس لکھنؤ بہ حسن وخوبی طبع ہوئی۔''

اعلان: اس کتاب کی رجسٹری ایک ۲۵، ۱۸۵۷ءنمبر، ۲۱۰ آج از جانب مطبع مُنشی نول کشور ہوگئی ہے،جس پر کوئی صاحب اس کتاب کو چھاپنے کا قصد نہ فرمائیں۔ درج بالاتصویر بہت صاف سُتھری اور اس کا رنگ جاذب نظر ہے۔

ہمارے ایک دوست اجے مالویہ ہیں، جو اس وقت پریاگ راج (الہ آباد) کے اینگلو بنگالی کالج میں اردو درس وتدریس کے کام میں منہمک اور مشغول ہیں، انھوں نے اردو میں رام کتھا پر ایک کتاب رقم فرمائی ہے۔ آج سے دو روز قبل ڈاکٹر مالویہ کی اسی کتاب پر پریاگ راج کے ایک ہندی اخبار 'ہندوستان' میں کچھ ضروری معلومات شائع ہوئیں تھیں، جس کے مطابق''۔۔۔بھگوان رام کی مہتم بالشان شخصیت سے مسلم حکمراں بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے تھے۔ تاریخ کی طرف رخ کریں تو پائیں گے کہ آج سے ۴۳۵ برس قبل بادشاہ اکبر نے فارسی میں رامائن کا ترجمہ کروایا تھا۔ ۱۵۷۶ء میں جب گوسوامی تلسی داس نے رامائن کا ترجمہ اودھی زبان میں کیا تو تقریباً اسی زمانے میں بادشاہ اکبر کے حکم پر ۱۵۸۹ء میں ملا قادر بدایونی نے فارسی زبان میں رامائن کا ترجمہ کیا۔ اس کے بعد شاہجہاں کے دور حکومت میں رامائن کے دو خاص تراجم فارسی میں ہوئے۔ ایک ترجمہ ملا سعد اللہ مسیح کرانوی نے اور دوسرا ترجمہ گِردھر داس نے کیا۔ اردو زبان کے سینئر ادیب اور اردو اکادمی، نئی دہلی کے سابق ممبر ڈاکٹر اجے مالویہ کے مطابق اب تک فارسی زبان میں تقریباً ۵۰ رام کتھا، ہندو اور مسلمانوں نے لکھی ہے۔ اردو زبان میں پہلی رام کتھا گنگا وِشن نے ۱۷۶۶ء میں لکھی تھی۔ یہ مخطوطہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مولانا آزاد کتب خانے میں محفوظ ہے۔ اس رام کتھا کو بنارس کے راجا نے ۱۸۵۲ء میں شائع کروایا تھا۔ اس کے بعد سے تقریباً تین سو کویوں اور لیکھکوں نے پربھو شری رام کی شان کا بیان کیا ہے۔ کسی مسلمان عالم نے رامائن پہلی مرتبہ ۱۹۱۵ء میں شائع کی۔ یہ کتاب ہندوستانی اکادمی، پریاگ راج میں محفوظ ہے۔'' (ہندوستان اخبار سے بصد شکر) ڈاکٹر اجے مالویہ صاحب نے پہلے ایسے کئی اردو شاعروں کا نام گنوایا ہے جنھوں نے رامائن کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے

عبدالصمد یار خاں ساغر نظامی کی کہے ہوئے چار خوب صورت مصرعے شائع کیے ہیں، جو مریادا پرشوتّم بھگوان رام چندر جی کی شان اور وقار کے مطابق ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں ؎

زندگی کی روح تھا، روحانیت کی شان تھا
وہ مجسم روپ میں انسان کا عرفان تھا
ہندیوں کے دل میں باقی ہے محبت رام کی
مِٹ نہیں سکتی قیامت تک حکومت رام کی

شری رام کتھا جسے عام بول چال کی زبان میں رامائن کہا جاتا ہے، تقریباً تمام ہندوستانی زبانوں میں موجود ہے۔ ان میں سے مضمون نگار نے جن رام کتھاؤں کو دیکھا ہے وہ ذیل ہیں: (کتب کے سرورق پر جو کچھ چھپا ہے، اُسے من وعن نقل کیا گیا ہے۔)

(۱) رامائن مہدی نظمی، ہندوستان پبلی کیشنز، غازی آباد

(۲) رامائن بالمیکی، ملک الشعرا دُرگا پرساد (۱۸۸۲ء-۱۹۳۱ء)

(۳) رامائن منظوم، پریم پال اشکؔ، مشورہ بک ڈپو، دہلی، ۱۹۱۶ء بھاشا اردو، صفحات ۱۵۰

(۴) رامائن مکمل، باتصویر، بابو شیوبرت لال برمن، پبلشر، لاج پت رائے، پرتھوی راج سہانی پبلی کیشنز وتاجران کتب، لوہاروخواجہ، لاہور۔ تار کا پتا ''publicationslahore1922''

(۵) رامائن یک قافیہ منظوم افق از تصنیف منیف، ملک الشعرا مُنشی دُرگا پرساد صاحب افقؔ بیکُنٹھ باسی، بااہتمام بابو منوہر لال، بھارگو پرنٹرس، مطبع مُنشی نول کشور واقع چوک میں چھپی۔

(۶) رامائنِ فراقی، جلد اول (بالمیکی کی رامائن کا منظوم اردو ترجمہ) رائے سدھ ناتھ بلی فراقی دریا آبادی، اُتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، پہلا ایڈیشن ۱۹۸۳ء، تعداد ۶۰۰/ قیمت ۳۳/روپیہ۔

(۷) رامائن منظوم، تلسی داس کی رامائن کا منظوم اردو ترجمہ از حکیم وِئسرائے وہمیؔ، مقام اشاعت حیدرآباد دکن، نام مطبع رفیق مشین پریس، سنہ طباعت، مارچ ۱۹۶۰ء، باراول، قیمت ۵/روپے۔ (اس رامائن کے پہلے صفحہ پر جو کوائف درج ہیں اس کے مطابق اوم- میں مہاراج تلسی داس جی کی رامائن مقدس کے اس ترجمہ کو عالی جناب ڈاکٹر بی۔ راما کرشن راؤ صاحب، گورنر، کیرلا کے نام نامی سے معنون کرنے کی عزت حاصل کرتا ہوں۔ جن کی سیاسی بصیرت میں مذہب، اخلاق اور ادب کو کافی دخل ہے۔

(۸) رامائن منظوم در بحر ریختہ، بکاؤلی، طویل راگنی، غزلیات، سحر مسدس، مخمس، چوپائی، مقدمہ گوری شنکر صاحب، صاحب الارشاد، مُنشی بندرابن صاحب۔ مطبوعہ: این۔ ڈبلیو۔ پریس، میرٹھ۔ اخبار

میگزین ہند (میرٹھ) ماہواری جنرل، جس میں مضامین علمی، طبی، مارل، سوشل، فوٹو گرافی، ہارمونیم، سائنس، سوانح عمری، لطائف، شعر وسخن، صادر تجارتی حالات اور تازہ خبریں وغیرہ وغیرہ بہ کوزہ درج ہوتی ہیں۔ ایک اخبار سے تمام باتیں حاصل ہوسکتی ہیں۔ قیمت سالانہ پیشگی ۴؍روپے۔

(۹) اوم- بچوں کے لیے رامائن: ہندوؤں کی مشہور کتاب رامائن آسان عبارت میں، جسے صاحب ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم، پنجاب نے سرکولر نمبر سیریل ۱۱۰۸۹ مجریہ ۱۵؍دسمبر ۱۹۲۴ء کی رو سے لائبریوں اور انعامات کے لیے منظور فرمایا۔ مصنفہ فطرت نگار سُدرشن صاحب پبلشر، پنجاب پرنٹنگ ورکس بک ڈپو لاہور۔ دوسری دفعہ ۵۰۰۰، قیمت فی جلد ۔۔۔۔ رامائن کے مضمونوں کی فہرست: دیباچہ صفحہ ۳۔ پہلا باب: پیدائش، بچپن، بیاہ صفحہ ۹۔ دوسرا باب: ۱۴؍سال کی فقیری، دشرتھ کی وفات، بھرت کا ایثار صفحہ ۴۱۔ تیسرا باب: سروپ، نکھار، کھر دوکھن، راون صفحہ ۸۳۔ چوتھا باب: سوگریو سے دوستی، بالی کا قتل، سیتا کی تلاش صفحہ ۱۲۸۔ پانچواں باب: سیتا کا سُراغ، بھبھیشن سے ملاقات، لنکا پر چڑھائی صفحہ ۱۴۸۔ چھٹا باب: حملہ، جنگ، فتح صفحہ ۱۷۳۔ ساتواں باب: (لو اور کُش) صفحہ ۲۰۱۔

10.Ramayan in Urdu script Hand written on hand made paper from late Rahas Bihari Lal Srivastav 1880-1949 Zameendar Jhansi U.P. India

کتاب کا آغاز (اردو میں) شری گنیس جی سدا سہائے سے کیا گیا ہے۔

(۱۱) اردو مثنوی رامائن از محمد امتیاز الدین، جملہ حقوق محفوظ ہیں، پہلا ایڈیشن ۱۹۸۴ء، قیمت دس روپے۔ کتابت: قربان علی، طباعت اسرار کریمی پریس، الہ آباد۔ ملنے کا پتا: محمد امتیاز الدین خاں، ایڈوکیٹ، شوکت منزل، پرتاپ گڑھ۔

(۱۲) راجا جی کی رامائن: بال کانڈ (رام جنم سے سیتا سویمبر تک) ترجمہ پروفیسر یونس اگاسکر، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹؍گولا مارکٹ، دریا گنج، نئی دہلی، ۱۱۰۰۰۲، ۲۰۰۵ء، قیمت ۱۰۰؍روپے۔

پنڈت برج نرائن چکبستؔ

(’رامائن کا ایک سین‘ کا خاص مطالعہ)

چکبست کا تعارف: چکبست کا شمار برصغیر کے بڑے شعرا میں ہوتا ہے۔ چکبست کا پورا نام پنڈت برج نرائن تھا جو کشمیری برہمن تھے۔ شاعری کے لیے انھوں نے چکبست تخلص اختیار کیا تھا۔ ان کے والد کا نام پنڈت اُدِت نرائن چکبست تھا، جن کی ولادت ۱۸۴۳ء میں لکھنؤ میں ہوئی تھی۔ موصوف کی ولادت

۱۹؍جنوری ۱۸۸۲ء کو اتر پردیش کے فیض آباد ضلع میں ہوئی تھی۔ ان کی وفات ۱۲؍فروری ۱۹۲۶ء کو اتر پردیس کے ضلع رائے بریلی میں ۴۴؍برس کی قلیل عمر میں ہوئی۔ چکبستؔ نے ۱۹۰۵ء میں لکھنؤ سے بی۔اے کیا اور ۱۹۰۷ء میں وہیں سے ایل ایل بی کی تعلیم مکمل کر کے وکالت کا پیشہ اختیار کیا، جس میں انھیں اچھی کامیابی حاصل ہوئی۔ وہ ڈپٹی کلکٹر بھی ہوئے۔ چوں کہ شاعری انھیں وراثت میں ملی تھی اس لیے لکھنؤ کا ادبی ماحول انھیں خوب راس آیا اور وہ اردو شاعری میں اپنے جوہر دکھلانے لگے۔ انھوں نے شاعری کا آغاز ۱۸۹۴ء میں کیا۔ ان کا تعلق صرف شاعری سے نہیں بلکہ اردو نثر سے بھی تھا۔ ان کے منفرد اندازِ تکلم کے سبب اردو نثر اور شاعری میں ان کا نام دور دور تک پھیل گیا۔ ان کی شادی ۱۹۰۵ء میں ہوئی لیکن ۱۹۰۶ء ان کی اہلیہ کا انتقال ہوگیا۔ ان کی دوسری شادی ۱۹۰۷ء میں ہوئی۔ موصوف چوں کہ اچھے شاعر اور ادیب تھے اس لیے انھوں نے کم عمری میں ہی اردو کے بڑے بڑے شعرا کے کلام سے استفادہ کیا جس سے انھیں بہت فائدہ پہنچا۔ وہ اردو کے بڑے بڑے شعرا مثلاً مرزا غالبؔ، میر انیسؔ اور خواجہ حیدر علی آتشؔ سے بہت متاثر تھے۔ ویسے تو موصوف نے اردو کی کئی اصناف پر قلم اٹھایا مگر انھیں نظم کہنا زیادہ پسند تھا اس لیے وہ قارئین کے درمیان نظم نگار کی حیثیت سے زیادہ مشہور تھے۔ موصوف نے نظموں کے علاوہ ڈراما، مثنوی اور تقریباً پچاس غزلیں بھی کہی ہیں۔ وہ ایک اچھے سیاست داں بھی تھے۔ وہ چوں کہ ’ہوم رول‘ کے حمایتی تھے اس لیے انھوں نے ہوم رول موومنٹ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ہوم رول کی حمایت میں لکھی گئی ان کی ایک نظم ’ہوم رول‘ ان کے زمانے میں خوب مشہور ہوئی۔ موصوف کی تخلیقات اس طرح ہیں: ’خاکِ وطن‘، ’رامائن کا ایک سین‘، ’نالۂ درد‘ اور ’نالۂ یاس‘ (شعری مجموعے) اور ’کملا‘ ان کا واحد ڈراما ہے۔ اردو کے مشہور ادیب اور غالب شناس، پروفیسر کالی داس گپتا رضاؔ نے چکبستؔ کے یومِ ولادت کے موقع پر ۱۹۸۳ء میں ان کے کلام کو ’کلیاتِ چکبست‘ اور تحقیقی مقالات کو ’مقالاتِ چکبست‘ کے عناوین سے شائع کروایا تھا، جو آج بھی دستیاب ہے۔ کشمیریوں کی مہمان نوازی کے ضمن میں موصوف کا ذیل شعر بہت مشہور ہے۔

ذرہ ذرہ ہے مرے کشمیر کا مہماں نواز
راہ میں پتھر کے ٹکڑوں نے دیا پانی مجھے

میر ببر علی انیسؔ اور پنڈت برج نرائن چکبستؔ: میر انیسؔ کی شاعری سے زیادہ متاثر شعرا میں چکبستؔ کا نام بڑی اہمیتوں کا حامل ہے۔ دیگر بڑے شعرا کی مانند چکبستؔ کی شاعری میں بھی وہ تمام شاعرانہ خواص موجود ہیں جسے زیادہ تر بڑے شعرا کا حصہ گردانا جاتا ہے۔ چکبستؔ نے تو کچھ ایسے بھاری بھرکم شعر بھی کہے ہیں جن کے موازنے کے لیے اردو کے بڑے بڑے شعرا کے کلام کھنگالنے ہوں گے۔ مثال

کے طور پر موصوف کا ایک ہی شعر کافی ہے، جسے زندگی اور موت کی سائنسی تعریف کی شکل میں آج بھی اردو شاعری میں میل کا پتھر گردانا جاتا ہے، جو درست بھی ہے۔وہ شعر ملاحظہ فرمائیں۔

زندگی کیا ہے، عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے، انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

ویسے تو زندگی اور موت کا ذکر بہت سے اردو شاعروں نے اپنی شاعری میں نہایت جاذب وجالب طریقہ سے کیا ہے لیکن کوتاہ نظر راقم کو اب تک اردو شاعری میں موت اور زندگی کی ایسی بھر پور سائنٹفک تعریف دیکھنے کو نہیں ملی۔راقم کے خیال کے مطابق چکبستؔ نے اپنے درج بالا شعر کی تخلیق میں درج ذیل دو ہندی اشعار سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کا اردو میں ایسا ترجمہ کر دیا کہ جو اردو شاعری میں دوام پا گیا۔یہ راقم کا دعوہ نہیں بلکہ قیاس ہے۔ملاحظہ فرمائیں۔

درج بالا شعر کا پہلا مصرعہ:

زندگی کیا ہے، عناصر میں ظہور ترتیب = شتی، جل، پاوک، گگن سمیرا
پانچ تتو یہ ادھم سریرا

درج بالا شعر کا دوسرا مصرعہ:

موت کیا ہے، انھیں اجزا کا پریشاں ہونا = یہ پنچ بھوت میں نَشُوَرتَن
نشور بھوتوں میں لین ہوا

شاعری میں اس قسم کا کرشمہ چکبستؔ اور ان جیسے ذہین شعرا کی دین ہے۔شاعری میں سہل ممتنع کے متعلق علامہ شبلی نعمانی فرماتے ہیں:

’’۔۔۔چوں کہ نظم کا درحقیقت سب سے بڑا کمال یہی ہے کہ اگر اس کو نثر کرنا چاہیں تو نہ ہو سکے اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب شعر میں الفاظ کی وہی ترتیب باقی رہے جو نثر میں عموماً ہوا کرتی ہے۔اس بنا پر شاعر کو کوشش کرنا چاہیے کہ اگر اصلی ترتیب پوری پوری قائم نہیں رہ سکتی تو بہر حال اس کے قریب قریب پہنچا جائے۔جس قدر اس کا لحاظ رکھا جائے گا اسی قدر شعر زیادہ صاف، برجستہ، رواں اور ڈھلا ہوا ہوگا، اور اردو میں جہاں تک ہم کو معلوم ہے یہ صفت میر انیس صاحب سے زیادہ کسی کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔‘‘(موازنۂ انیس و دبیر، علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۰۴ء، ص ۳۶-۳۷)

چکبستؔ کے کلام کا مطالعہ اگر بغائر کیا جائے تو قارئین کو اندازہ ہوگا کہ موصوف کے کلام میں وہ

خوبی موجود ہے جسے علامہ ’سہل ممتنع‘ کے نام سے یاد فرماتے ہیں۔چوں کہ شاعری کے تعلق سے علامہ کی نگاہ میں یہ بڑی خوبی ہے اس لیے اس مقام پر انھیں چکبستؔ کا بھی ذکر ضرور کرنا چاہیے تھا۔شاید موصوف نے ایسا اس لیے نہیں کیا پھر انھیں اسی قسم کے متعدد شعرا کے نام گنوانے پڑتے، اسی خیال سے موصوف صرف اتنا کہہ کر آگے بڑھ گئے کہ ’’جہاں تک ہم کو معلوم ہے۔۔۔‘‘

اس ضمن میں چوں کہ چکبستؔ کی ’رامائن کا ایک سین‘ بہت خاص ہے، اس لیے تبصرے کے لیے راقم نے اس کو اپنا ہدف بنایا ہے۔چکبستؔ کی ’رامائن کا ایک سین‘ موازنہ کرتے وقت اگر بھگوان شری رام چندر، راجا دشرتھ، ماتا کوشلیا کے ناموں کو چھپا کر ان کی جگہ پر اگر علی اکبر اور ان کے والد حضرت امام حسین اور ماں اُم لیلیٰ کے نام لکھ دیے جائیں تو ایسا محسوس ہوگا کہ جیسے بھگوان شری رام چندر جی بن باس پر جانے کے لیے اپنے والد راجا دشرتھ کے بعد اپنی ماں کوشلیا سے آخری رخصت کے لیے نہیں بلکہ حضرت علی اکبر اپنے والد حضرت امام حسین کی اجازت حاصل کرنے کے بعد اپنی والدہ اُم لیلیٰ یا اپنی پھوپھی حضرت زینب علیا مقام سے جہاد کے لیے اجازت طلب کرنے آئے ہوں، جہاں انھیں تن تنہا اسلام کے لاکھوں دشمنوں سے جہاد کرتے ہوئے شہید ہو جانا ہے۔چکبستؔ کی شاعری پر میر انیسؔ کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے اردو کے اہم ناقد ڈاکٹر ارشد اریب اپنی کتاب ’اردو مرثیہ کی سرگذشت‘ میں رقم طراز ہیں:

’’بیسویں صدی کے چار بڑے شاعر ایسے ہیں جنھوں نے مرثیہ نگاری کے اس چراغ سے چراغ جلایا اور مرثیہ نے مسدس کی جو تاثیر دکھائی تھی، اس کا پورا پورا اثر لیا۔چکبستؔ اور نوبت رائے نظرؔ نے تو نہ صرف ہیئت کو من و عن اپنایا بلکہ اسلوب بھی وہی اختیار کیا جو میر انیسؔ اور ان کے معاصرین کا تھا۔قومی نظموں تک میں اس روِش کو برقرار رکھا، مذہبی مسدس، خصوصاً رام چندر جی کے بن باس اور جنازہ پسر والی نظموں کو تو میر انیسؔ کے مرثیہ کی زبان اور مرثیہ کے اسلوب میں بالکل مدغم کر دیا۔‘‘(اردو مرثیے کی سرگذشت، ص ۷۱-۷۲)

انیسویں صدی کے اخیر اور بیسویں صدی کے شروع میں لکھنؤ کے جو بڑے شاعر میر انیسؔ سے زیادہ متاثر ہوئے ان میں پنڈت برج نرائن چکبستؔ کا نام سرفہرست ہے۔چکبستؔ نے بھی متعدد مراثی اور نظمیں مسدس میں لکھیں۔انھوں نے بہت سے مراثی اور تعزیتی نظمیں اپنے دوستوں، مشہور ہستیوں اور عزیزوں کی موت پر لکھیں لیکن ان نظموں سے انھیں وہ نام و نمود حاصل نہیں ہو سکا جس کی انھیں امید تھی۔چکبستؔ کے ذہن پر میر انیسؔ کے مراثی نے جو اثرات چھوڑے تھے، اس کے تحت موصوف کوئی ایسا مسدس لکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے جس میں میر انیسؔ کی شاعری کے خواص پوری طرح ابھر کر سامنے آئے

ہوں۔میر انیسؔ کی مانند ہی چکبستؔ کے پاس بھی شاعری کے لیے رامائن کی شکل میں ایک بہت وسیع میدان تھا۔راقم کا خیال بڑے میدان سے یہ ہے کہ مذہبی شاعری کا کینوس ادب میں مقابلے بہت چھوٹا ہوتا ہے لیکن میر انیسؔ نے کربلا کی غمگین داستان کو اپنا کر جس طرح اس میں شاعری کے تمام خواص کو ضم کر دیا وہ اب تک انھیں کا حصہ ٹھہرا۔راقم کا خیال ہے کہ میر انیسؔ کی شاعری کو اپنے ذہن میں رکھ کر چکبستؔ نے بھی ’رامائن کا ایک سین‘ لکھنے کا فیصلہ کیا ہوگا کیوں کہ چکبستؔ کے پاس بھی شاعری کے لیے رامائن جیسا ایک وسیع داستانوی پلاٹ تھا۔اس لیے یہ اندازہ ہونا فطری ہے کہ چکبستؔ نے بھی رامائن کو مسدس کی شکل میں پیش کر کے ایک بڑے کام کی بسم اللہ کی ہوگی۔ یہ چکبستؔ کا وہ کام ہوتا جس میں اردو مراثی کی مانند بڑی وسعت تھی۔گمان ہوتا ہے کہ اسی خیال کے تحت چکبستؔ نے رامائن کے ایک سین کو اپنی شاعری کے امتحان کے لیے لکھتے ہوئے اس میں اپنی شاعری کے تمام جوہر سمو دیئے ہوں گے۔چکبستؔ کی شاعری کے اسی عمدہ نمونے کو پڑھ کر قارئین کو اندازہ ہوگیا کہ ان کی شاعری پر میر انیسؔ کا گہرا اثر ہے۔مثال کے طور پر۔

رخصت ہوا وہ باپ سے لے کر خدا کا نام
راہ وفا کی منزل اوّل ہوئی تمام

میر انیسؔ کی شاعری میں زبان اور بیان کی جہاں درجنوں خوبیاں موجود ہیں وہیں ان کی شاعری پورے ہندوستانی ماحول کی عکاسی کا عمدہ نمونہ بھی ہے۔ان کی شاعری میں لاتعداد مقامات پر ہندوستانی رسم ورواج کو اس طرح برتا گیا ہے کہ جیسے ان کی شاعری عرب کا نہیں بلکہ ہندوستانی ماحول کا حصہ ہے۔ان کی شاعری میں شادی بیاہ کے موقعوں، مہندی، شادی کا جوڑا، کنگنا، ہاتھوں کو جوڑنا، پیروں پر گرنا وغیرہ رسم و رواج کا ذکر ملتا ہے جو خالص ہندوستانی ہیں۔ان کی شاعری میں ہر قسم کے رسم ورواج میں عرب نہیں بلکہ ہندوستان (لکھنؤ) کا ماحول نظر آتا ہے، جو ان شاعری کی کمزوری نہیں بلکہ حسن اور طاقت ہے۔اگر میر انیسؔ نے ایسا نہ کیا ہوتا تو ان کی شاعری آج اتنی زیادہ پسند نہیں کی جاتی۔

اگر غور کیا جائے تو عام طور پر ہر دور کی صنف سخن میں ایک بات کم وبیش ایک جیسی یہ نظر آئے گی کہ الگ الگ شعرا اور ادبا تقریباً ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے نظر آئیں گے۔ہر دور کے اکثر بڑے شعرا کے کلام کا اثر اُس دور کے دوسرے عام شعرا کے کلام پر ضرور نظر آتا ہے۔عام طور پر یہ اثرات ضمنی اقسام کے ہوتے ہیں جسے قاری و نقاد، استفادہ کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں مگر کبھی کبھار یہ اثرات سرقے کی حد تک دیکھنے کو ملتے ہیں، جسے معیاری ادبا کے درمیان ناقابل معافی سمجھا جاتا ہے چہ جائے کہ اس قسم کے اثرات معیاری ادبا میں عنقا نظر آتے ہیں۔کوئی شاعر ہو یا عام آدمی، ہر کسی کے پاس لفظوں کا محدود خزانہ ہوتا ہے

جس کی مدد سے وہ اپنے جذبات دوسروں تک پہنچاتا ہے۔

میر انیسؔ کے مقابلے چکبستؔ کے لفظوں کا خزانہ محدود تھا جس کی وجہ سے وہ اپنے کلام میں وہ حسن اور جولانیت پیدا نہیں کر سکے جو تشبیہ، استعارے، کنائے اور دیگر شعری صنعتیں انیسؔ نے پیدا کرلیں۔گو کہ انیسؔ بذات خود ایک مستند لغت تھے۔کم وبیش اتنے ہی الفاظ کا استعمال تو نظیرؔ اکبرآبادی نے بھی کیا ہے لیکن وہ میر انیسؔ سے اس معنی میں بہت پیچھے ہیں کیوں کہ انھوں نے صرف الفاظ کا استعمال کیا ہے، شاعری میں انیسؔ جیسی نزاکت، ندرت اور حسن نہیں پیدا کر سکے اس لیے شاعری کے معاملے میں ان لوگوں کا موازنہ غیر جانب دارانہ نہ ہوگا، جب کہ پروفیسر کلیم الدین احمد کا خیال ہے کہ ’’نظیرؔ اکبرآبادی ادب کے آسمان کا درخشاں ستارا ہے‘‘ اور ’’میر انیس اچھے شاعر تھے ہی نہیں‘‘ تو اس سے میر انیسؔ کی شاعری کے بڑکپن میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اردو شاعری میں مرثیہ وہ واحد صنف سخن ہے جسے سب سے زیادہ عروج انیسویں صدی میں میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے توسط سے ملا۔اردو مرثیہ کو میر انیسؔ نے تحت الثریٰ سے اٹھا کر سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچا دیا جو اردو شاعری کا اہم ترین جزو بن گیا۔انیسؔ کے نوک قلم نے اردو مرثیہ کو اتنا عروج بخشا کہ نصاب میں اس کی شمولیت ناگزیر ہوگئی۔علامہ شبلی نعمانی نے موازنے میں اردو شاعری کی جو تعریف کی ہے وہ ساری کی ساری مراثی انیسؔ کا ہی محور نظر آتی ہے۔اردو شاعری کی کسی بھی صنف کو اٹھا کر دیکھ لیجیے، ہر ایک میں وہی خوبیاں صاف نظر آئیں گی جو علامہ نے بیان کی ہیں۔غزل، قصیدہ، رباعی اور نظم، گو کہ ہر صنف سخن میں آپ کو کہیں مسرت، کہیں غم، کہیں غیظ وغضب تو کہیں شادابی ضرور نظر آئے گی مگر مرثیہ اردو شاعری کی وہ واحد صنف سخن ہے جس میں اقتباس بالا کا ہر ٹکڑا کہیں نہ کہیں ضرور مل جائے گا جو کہ حقیقتاً میر انیسؔ کی قوت متخیلہ اور قوت اختراع کا کمال ہے۔اردو مرثیہ کے اتنے عروج کی واحد وجہ صرف یہی ہے کی میر انیسؔ نے ان تمام اجزا کو اس طرح بتدریج یکجا کر کے پیش کیا کہ ان کے کلام میں کہیں بھی فصاحت، بلاغت، روانی، تسلسل، سلاست اور شیرینی کا دامن چھوٹنے نہیں پایا۔اسی بنا پر اردو مرثیہ ہر دل عزیز بن گیا اور وہ لوگ جنھیں شیعہ مسلک سے کوئی واسطہ نہ تھا وہ بھی مرثیہ سے لطف اندوز ہوتے رہے۔مرثیہ کی انھیں خصوصیات نے اردو کو عالمی ادب کی صف میں لا کر کھڑا کر دیا۔یہ اردو مرثیہ ہی تھا جس نے اردو کو چھنولال دلگیرؔ جیسے مرثیہ گو شعرا اور پروفیسر گوپی چند نارنگ جیسے نقاد دیئے۔

بھلے ہی چکبستؔ کے کلام میں لفظوں کی وہ ترکیبیں نہ ملیں یا کم ملیں جو انیسؔ کے یہاں ملتی ہیں مگر جابجا جو فصاحت، روانی، انداز بیان ملتا ہے وہ میر انیسؔ کے کلام سے اس قدر مشابہ ہے کہ اس پر اکثر

میر انیسؔ کا دھوکا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر چکبستؔ کی 'رامائن کا ایک سین' خاص طور سے قابل ذکر ہے جسے پڑھنے کے بعد قاری کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ (اگر رامؔ، کوشلیا اور دشرتھؔ کے نام چھپا دیئے جائیں) گویا رامؔ بن باس جانے کے لیے اپنی والدہ کوشلیاؔ سے نہیں بلکہ حضرت علی اکبر اپنی پھوپھی حضرت زینب یا والدہ ام لیلیٰ سے میدان قتال میں جانے کی اجازت طلب کر رہے ہیں۔ میں پہلے میر انیسؔ کے مرثیہ کا ایک بند پیش کروں گا تاکہ مفہوم کو بخوبی واضح کیا جاسکے۔

حضرت نے مسکرا کے نظر کی سوئے پسر نعلین عرش سایہ جھکایا پسر نے سر
فرمایا کیا ارادہ ہے اے غیرت قمر کی عرض اذن دیجیے یا شاہ بحر و بر
عباس کے فراق نے مارا غلام کو
بس اب نہیں ہے صبر کا یارا غلام کو

اسلام کے اصولوں میں ایک یہ بھی ہے کہ جہاد کے لیے رسولؐ یا امام وقت کی اجازت ضروری ہے، اسی لیے علی اکبر کا حضرت امام حسین کی خدمت میں پیش ہونا ضروری تھا۔ شری رامؔ کو چوں کہ ان کے والد راجا دشرتھؔ نے ہی بن باس کا حکم دیا تھا اس لیے اب ان سے اجازت کا سوال ہی نہ تھا۔ چنانچہ بھگوان شری رامؔ چندر جی صرف اپنے والد سے مل کر واپس آجاتے ہیں، جسے چکبستؔ صرف اتنا کہہ کر تمام کر دیتے ہیں۔

رخصت ہوا وہ باپ سے، لے کر خدا کا نام راہِ وفا کی منزل اول ہوئی تمام

یہاں پر اس سے زیادہ کی ضرورت بھی نہیں تھی کیوں کہ والد کے حکم کے بعد شری رامؔ کے پاس زیادہ کچھ کہنے کو رہ ہی نہیں گیا تھا چہ جائے کہ بیٹے کو بن جانے کا حکم سنا چکنے کے بعد ان پر بیٹے کی جدائی کے غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ اس لیے اب شری رامؔ کو سیدھے والدہ کی خدمت میں پیش کرنا برمحل تھا جب کہ علی اکبر کو شرعاً امام حسین سے اجازت طلب کرنا تھی۔ حضرت امام حسین اپنے بیٹے علی اکبر کو کچھ اس طرح اجازت دیتے ہیں۔

شہ نے کہا خوشی ہے بہر حال خاکسار تم سے جو سو پسر ہوں تو اس راہ میں نثار
پر میں نہ دوں گا رخصت میدان کارزار اس امر میں تمہاری پھوپھی کو ہے اختیار
راضی ہوں وہ تو داغ انھیں دے کے جایئے
پالا ہے جس نے اس سے رضا لے کے جایئے

اب ذہن میں علی اکبر کے تصور کو رکھ کر چکبستؔ کے طریق اظہار پر غور فرمایئے تو محسوس ہوگا کہ یہ رامؔ جی کوشلیاؔ سے نہیں بلکہ علی اکبر اپنی ماں یا پھوپھی سے آخری رخصت کو تشریف لائے ہیں۔

رخصت ہوا وہ باپ سے، لے کر خدا کا نام راہ وفا کی منزل اوّل ہوئی تمام
منظور تھا جو ماں کی زیارت کا اہتمام دامن سے اشک پوچھ کے دل سے کیا کلام
اظہار بے بسی سے ستم ہو گا اور بھی
دیکھا ہمیں اُداس تو غم ہو گا اور بھی

دل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ نونہال خاموش ماں کے پاس گیا صورت خیال
دیکھا تو ایک در میں وہ بیٹھی ہے خستہ حال سکتہ سا ہوگیا ہے، یہ ہے شدت ملال
تن میں لہو کا نام نہیں، زرد رنگ ہے
گویا بشر نہیں، کوئی تصویر سنگ ہے

نہ جانے کس خیال میں، گم تھی وہ بے گناہ نور نظر پہ دیدۂ حسرت سے کی نگاہ
جنبش ہوئی لبوں کو، بھری ایک سرد آہ لی گوشہ ہائے چشم سے اشکوں نے رخ کی راہ
چہرے کا رنگ حالت دل کھولنے لگا
ہر موئے تن، زباں کی طرح بولنے لگا

آخر اسیر یاس کا قفل دہن کھلا افسانۂ شدائد رنج و محن کھلا
اک دفتر مظالم چرخ کہن کھلا وا تھا دہانِ زخم، کہ باب سخن کھلا
درد دل غریب، جو صرف بیاں ہوا
خون جگر کا رنگ، سخن سے عیاں ہوا

رو کر کہا، خموش کھڑے کیوں ہو میری جاں میں جانتی ہوں، کس لیے آئے ہو تم یہاں
سب کی خوشی یہی ہے تو صحرا کو ہو رواں لیکن میں اپنے منھ سے نہ ہرگز کہوں گی ہاں
کس طرح بن میں آنکھ کے تارے کو بھیج دوں
جوگی بنا کے راج دلارے کو بھیج دوں

دنیا کا ہو گیا ہے یہ کیسا لہو سفید اندھا کیے ہوئے ہے، زر و مال کی امید
انجام کیا ہو؟ کوئی نہیں جانتا یہ بھید سوچے بشر، تو جسم ہو لرزاں مثال بید
لکھی ہے کیا حیات ابد ان کے واسطے
پھیلا رہے ہیں جال یہ کس دن کے واسطے

لیتی کسی فقیر کے گھر میں اگر جنم ہوتے نہ میری جان کو سامان یہ بہم

ڈستا نہ بن کے سانپ مجھے شوکت وحشم   تم میرے لال تھے مجھے کس سلطنت سے کم
میں خوش ہوں پھونک دے کوئی اس تخت وتاج کو
تم ہی نہیں تو آگ لگادوں گی راج کو

کن کن ریاضتوں سے گزرتے ہیں ماہ وسال   دیکھی تمہاری شکل جب اے میرے نونہال
پورا ہوا جو بیاہ کا ارمان تھا کمال   آفت یہ آئی مجھ پہ ہوئے جب سفید بال
چھٹتی ہوں ان سے جوگ لیا جن کے واسطے
کیا سب کیا تھا میں نے اسی دن کے واسطے

ایسے بھی نامراد بہت آئیں گے نظر   گھر جن کے بے چراغ رہے آہ عمر بھر
رہتا مرا بھی نخل تمنا جو بے ثمر   یہ جائے صبر تھی کہ دعا میں نہیں اثر
لیکن یہاں تو بن کے مقدر بگڑ گیا
پھل پھول لا کے باغ تمنا اجڑ گیا

پھر عرض کی یہ مادر ناشاد کے حضور   مایوس کیوں ہیں آپ الم کا ہے کیا وفور
صدمہ یہ شاق عالم پیری میں ہے ضرور   لیکن نہ دل سے کیجیو صبر و قرار دور
شاید خزاں میں شکل عیاں ہو بہار کی
کچھ مصلحت اسی میں ہو پروردگار کی

راحت ہو یا کہ رنج، خوشی ہو کہ انتشار   واجب ہر ایک رنگ میں ہے شکر کردگار
تم ہی نہیں ہو کشتۂ نیرنگ روزگار   ماتم کدہ ہے، دہر میں لاکھوں ہیں سوگوار
سختی سہی نہیں کہ اٹھائی کڑی نہیں
دنیا میں کیا کسی پہ مصیبت پڑی نہیں؟

ماں باپ منہ ہی دیکھتے تھے جن کا ہر گھڑی   قائم تھیں جن کے دم سے امیدیں بڑی بڑی
دامن پہ جن کے گرد بھی اڑ کر نہیں پڑی   ماری نہ جن کو خواب میں بھی پھول کی چھڑی
محروم جب وہ گل ہوئے، رنگ حیات سے
ان کو جلا کے خاک کیا، اپنے ہات سے

یہ حقیقت ہے کہ بے ثباتی عالم بھی مرثیہ کا اہم ترین جزو ہے۔ بے ثباتی کو میر انیسؔ کے ہی مانند چکبستؔ نے بھی اپنی زیر بحث نظم میں ایسی خوب صورتی سے ضم کیا ہے کہ کہیں بھی نہ تو جھول آنے دیا نہ ہی

تسلسل میں کمی۔ مثال کے طور پر چند بند ملاحظہ ہوں۔

کہتے تھے لوگ دیکھ کے ماں باپ کا ملال   ان بیکسوں کی جان کا بچنا ہے اب محال
ہے کبریا کی شان، گزرتے ہی ماہ وسال   خود دل سے درد ہجر کا، مِٹتا گیا خیال
ہاں کچھ دنوں تو نوحہ و ماتم ہوا کیا
آخر کو رو کے بیٹھ رہے، اور کیا کیا؟

پڑتا ہے جس غریب پہ رنج ومحن کا بار   کرتا ہے اس کو صبر عطا، آپ کردگار
مایوس ہو کے ہوتے ہیں انساں گناہگار   یہ جانتے نہیں کہ ہے دانائے روزگار
انسان اس کی راہ میں ثابت قدم رہے
گردن وہی ہے امر رضا میں جو خم رہے

اور آپ کو تو کچھ بھی نہیں رنج کا مقام   بعد سفر وطن میں ہم آئیں گے شاد کام
ہوتے ہیں بات کرنے میں چودہ برس تمام   قائم امید ہی سے ہے، دنیا ہے جس کا نام
اور یوں کہیں بھی رنج و بلا سے مفر نہیں
کیا ہو گا دو گھڑی میں کسی کو خبر نہیں

اکثر ریاض کرتے ہیں پھولوں پہ باغباں   ہے دن کی دھوپ رات کی شبنم انھیں گراں
لیکن جو رنگ باغ بدلتا ہے ناگہاں   وہ گل ہزار پردوں میں ہوتے ہیں رائگاں
رکھتے ہیں جو عزیز انھیں اپنی جاں کی طرح
ملتے ہیں دست یاس وہ برگ خزاں کی طرح

لیکن جو پھول کھلتے ہیں صحراں میں بے شمار   موقوف کچھ ریاض پہ ان کی نہیں بہار
دیکھو یہ قدرتِ چمن آرائے روزگار   وہ ابر و باد و برف میں رہتے ہیں برقرار
ہوتا ہے ان پہ فضل جو رب کریم کا
موج سموم بنتی ہے جھونکا نسیم کا

اپنی نگاہ ہے کرم کردگار پر   صحرا چمن بنے گا، وہ ہے مہرباں اگر
جنگل ہو یا پہاڑ، سفر ہو کہ ہو حضر   رہتا نہیں وہ حال سے بندے کے بے خبر
اس کا کرم شریک اگر ہے تو غم نہیں
دامان دشت، دامن مادر سے کم نہیں

''راہِ وفا کی منزل اول ہوئی تمام'' معرکہ کربلا کے سلسلہ میں جتنی بھی تاریخیں اور بیانات دستیاب ہیں ان میں چند باتیں سبھی میں ایک سی نظر آتی ہیں۔ وہ ہے امام حسینؑ کے ساتھیوں کی وفاداری، خدا پرستی، ذات رب العزت پر یقین کامل، حق کی پرستاری، باطل سے انحراف۔ ان میں حضرت امام حسینؑ کے تمام ساتھیوں کی 'وفا' بالا بالا نظر آتی ہے۔ ان تمام چیزوں کو مصنّفین اور شعرا نے اپنے اپنے انداز سے بیان کیا ہے جب کہ سب کا ماحصل ایک ہی ہے۔ یہاں پر چکبستؔ نے بھی لفظ 'وفا' کو شری رامؔ جی کی وفاداری سے منسوب کیا ہے۔ دامن سے اشک پوچھ کر دل سے کلام کرنا بھی میر انیسؔ کا ہی خاص انداز بیان ہے۔ ''دل سے کہا کہ ہے لب بام اب یہ آفتاب'': (مرثیہ: ہوتے ہیں بہت رنج مسافر کو سفر میں)۔ دل سے کہنا، مراد کسی بات کو سوچ کر اس پر عمل کرنے کے ارادے سے ہے۔

حضرت امام حسینؑ چوں کہ امام تھے اور شری رامؔ بھگوان، اس لیے دونوں کے خواص ایک جیسے ہونا لازمی ہیں۔ اسی لیے میر انیسؔ نے سینکڑوں مقام پر امام حسینؑ کو 'بے کس' تو کہا مگر 'بے بس' نہیں کہا کیوں کہ امام ہو یا بھگوان، حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں، وہ بے کس تو ہو سکتا ہے مگر بے بس نہیں۔ انیسؔ کی ہی مانند چکبستؔ نے بھی اس کا خاص لحاظ رکھنا چاہا ہوگا مگر ان حالات میں جب کہ والد کا حکم سرفہرست ہو اور وعدے کو وفا کرنا عین مقصد، اور ماں کی مامتا کچھ اور ہی چاہتی ہو۔ مجبوراً یہاں پر چکبستؔ کو ''اظہار بے بسی'' لکھنا پڑا جب کہ شری رامؔ چندر جی کے لیے لفظ بے بسی قطعی مناسب نہیں تھا۔

تشبیہات کے لحاظ سے چکبستؔ، میر انیسؔ کے پائے کو تو نہیں پہنچتے مگر انیسؔ ہی کی طرح فصاحت کو قربان ہونے سے جگہ جگہ بڑی خوب صورتی سے بچا لیتے ہیں اور ایسی تشبیہات پیش کرتے ہیں جن پر میر انیسؔ کا رنگ صاف جھلکتا ہے۔ یہ مصرعے دیکھیے۔

گویا بشر نہیں، کوئی تصویر سنگ ہے
ہر موئے تن زباں کی طرح بولنے لگا
سوچے بشر تو جسم ہو لرزاں مثال بید
جس طرح چاندنی کا ہو شمشان سے گزر
ماری نہ جن کو خواب میں بھی پھول کی چھڑی
آخر کو رو کے بیٹھ رہے، اور کیا کیا؟
گردن وہی ہے، امر رضا میں جو خم رہے

اس کے علاوہ زیر بحث نظم میں کم از کم ایک بند تو ایسا ہے جس کی مثال چکبستؔ کے پورے دیوان

میں عنقا ہے۔ سلاست، روانی، فصاحت اور بلاغت کا دامن شروع سے آخر تک ہاتھوں سے چھوٹنے نہیں پایا ہے اور شعریت بھی ایسی کہ غور کو دعوت دے اور دل عرصہ تک محظوظ ہوتا رہے۔ ہر لفظ اور ترکیب سے انسیت جھلکتی ہے۔

آخر اسیر یاس کا قفل دہن کھلا — افسانۂ شدائد رنج و محن کھلا
اک دفتر مظالم چرخ کہن کھلا — وا تھا دہانِ زخم کہ باب سخن کھلا
دردِ دلِ غریب جو صرف بیاں ہوا
خون جگر کا رنگ سخن سے عیاں ہوا

اس قسم کی بندشیں اور تسلسل میر انیسؔ کے یہاں عام ہیں۔ ''سوچے بشر تو جسم ہو لرزاں مثال بید'': یہ بھی انیسؔ کا ہی انداز ہے جو ان کے یہاں عام ہے: ''مانند بید عضو بدن تھرتھراتے تھے'' (مرثیہ: طے کر چکا جو منزل شب کاروان صبح)۔ چوں کہ شری رامؔ چندر جی کا بیاہ سیتاؔ جی کے ساتھ ہو چکا ہے اس لیے رامؔ جی کی والدہ، کوشلیاؔ کچھ یوں ہم کلام ہوتی ہیں جس طرح ہندہ حضرت زینب سے ہم کلام ہوتی ہے:

کوشلیاؔ: ''پورا ہوا جو بیاہ کا ارمان تھا کمال''
ہندہؔ: ''شہر بانو کے بھی ہے دیکھنے کا شوق کمال''
(مرثیہ: جب سنی ہند کے آنے کی خبر زینب نے)

انھیں باتوں کو میر انیسؔ نے دوسرے مقامات پر کچھ یوں رقم کیا ہے۔

سہرا دکھا کے مادرِ پر غم کو چھوڑیو — آلے دلہن تو صدقے گئی ہم کو چھوڑیو
مرتے ہیں اشتیاق میں وہ دن خدا دکھائے — یہ دائی اپنے ہاتھوں سے دولہا تمھیں بنائے
غل ہو کہ لو حسین، دلہن گھر میں بیاہ لائے — اچھا نہ ہم سے آنکھ ملانا، وطن تو آئے
جیتے ہیں گر تو حسرت دل یوں نکالیں گے
اب ہم تمہاری طرح سے پوتے کو پالیں گے
ایسے ہنسے نہ تھے کہ ہمیں تم رلاتے ہو — شادی کے دن جو آئے تو مرنے کو جاتے ہو

کوشلیاؔ جی اپنے بیٹے شری رامؔ چندر جی کو کچھ یوں سمجھاتی ہیں: (چکبستؔ)

کیا سب کیا تھا ہم نے اسی دن کے واسطے

جب کہ انیسؔ نے اسی بات کو مندرجہ ذیل طریقے سے نظم کیا ہے:

پالا تھا میں نے کیا تمھیں اس دن کے واسطے

چکبستؔ کا یہ مصرعہ بھی من وعن میر انیسؔ جیسا ہی ہے یا اگر یوں کہا جائے کہ یہ انیسؔ کی ترجمانی ہے تو غلط نہ ہوگا۔ میر انیسؔ جا بہ جا صبر و رضا کے دامن کو تھامے رہنے کی تلقین کرتے نظر آتے ہیں۔ داستان کربلا جس محور پر گھومتی ہے وہ حق اور صبر ہے اور چکبستؔ نے بھی اسی کے زیر اثر صبر کی تلقین کچھ اس طرح سے کی ہے:

چکبستؔ: ''لیکن نہ دل سے کیجیو صبر و قرار دور'' اس مصرعے میں بھی خاص انیسؔ کا ہی انداز نظر آتا ہے۔ اسی بند کی بیت میں چکبستؔ نے شری رامؔ پر پڑنے والی افتاد کو خدا کی مصلحت سے تعبیر کیا ہے جو ہو بہ ہو میر انیسؔ کا ہی انداز ہے: ''کچھ مصلحت اسی میں ہو پروردگار کی۔'' اپنے مراثی میں درجنوں مقام پر حضرت امام حسین پر پڑنے والی مصیبتوں کو خدا کی مرضی اور مصلحت سے تعبیر کیا ہے اور کہیں پر بھی کسی سے شاکی ہونے کے بجائے صبر اور خدا کا شکر ادا کرتے نظر آئے ہیں۔

شکر خدا مسافر راہ ثواب ہیں　　　صابر خدا کی راہ میں ہے فاطمہ کا لال
(میر انیسؔ)

اس کے بعد چکبستؔ کو ملاحظہ فرمایئے، لکھتے ہیں کہ۔

واجب ہر ایک رنگ میں ہے شکر کردگار
کچھ مصلحت اسی میں ہو پروردگار کی
مایوس ہو کے ہوتے ہیں، انساں گناہگار

درج بالا تینوں مصرعوں میں خالص درس اسلامی کے ساتھ چکبستؔ نے انیسؔ جیسا ہی انداز اپنایا ہے۔ اس کے علاوہ درج بالا تراکیب اور لفظوں کا امتزاج بھی میر انیسؔ سے ہی استفادہ کی طرف اشارہ ہے۔ راہ وفا، دامن سے اشک پوچھنا، دل سے کلام کرنا، تصویر سنگ ہونا، دیدۂ حسرت سے نگاہ کرنا، زیارت، بے کسی، ایک گوشہ میں غمگین اور اداس ہو کر بیٹھنا، گوشۂ چشم سے آنسوؤں کا رخ کی راہ لینا، موئے تن کا ہم کلام ہونا، مثل بید لرزنا، کردگار کا شکر ادا کرنا، صبر کرنا، مایوسی کا گناہ ہونا، خدا کی راہ میں ثابت قدم رہنا، خدا کے امر میں گردن کو خم رکھنا، (خالص درس اسلامی) موج سموم کا جھونکا، وفور یاس وغیرہ بھی میر انیسؔ کی ہی خاص ترکیبیں ہیں۔ ان سب کے علاوہ کم از کم ایک مقام پر تو چکبستؔ تشبیہ کے معاملے میں ایک دم سدرۃ المنتہٰی پر نظر آتے ہیں۔

جس طرح چاندنی کا ہو شمشان سے گزر

ہر چند کہ انداز بیان اور ترکیب انیسؔ جیسی ہی ہے مگر ایسی تشبیہ اور اس طرح کے استعارے میر انیسؔ کے یہاں بھی بہت کم ہیں۔ یہ مصرعہ فصاحت و بلاغت کا سرچشمہ ہے۔ دل کی بے بسی کا چہرے سے ظاہر ہونا، دل کی مردنی نگاہوں میں آجانا، مامتا کی آنچ کی خبر نہ ہوتا (ہر چند کہ رامؔ چندر جی شادی شدہ تھے مگر ان کو اب تک اللہ تعالیٰ نے اولاد کی دولت سے نہیں نوازا تھا جب کہ علی اکبر کی تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی تھی) چنانچہ یہ کلمہ میر انیسؔ نے یوں ادا کیا۔

دیتا اگر تمھیں کوئی فرزند ذوالجلال　　　ہوتی پدر کی قدر، سمجھتے ہمارا حال
رخصت کا باپ سے یوں ہی کرتا وہ جب سوال　　　تب جانتے کہ دیتے اسے رخصت جدال
کیا جانے وہ مزہ جسے اس کا ملا نہیں
اچھا سدھارو، تم سے ہمیں کچھ گلا نہیں

ذکر بے ثباتی عالم کے لیے مرثیہ ایک وسیع میدان ہے اور اس ضمن میں میر انیسؔ نے بڑے پائے کے اشعار کہے ہیں۔ پھر بھلا اس موقع کو چکبستؔ اپنے ہاتھوں سے کیوں کر جانے دیتے۔ چنانچہ انھوں نے بھی اپنی اسی نظم میں بے ثباتی عالم پر کئی اچھے اشعار کہے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں۔

اور یوں کہیں بھی رنج و بلا سے مفر نہیں
کیا ہو گا دو گھڑی میں کسی کو خبر نہیں

اکثر ریاض کرتے ہیں پھولوں پہ باغباں　　　ہے دن کی دھوپ رات کی شبنم انھیں گراں
لیکن جو رنگ باغ بدلتا ہے ناگہاں　　　وہ گل ہزار پردوں میں ہوتے ہیں رائگاں
رکھتے ہیں جو عزیز انھیں اپنی جاں کی طرح
ملتے ہیں دست یاس وہ برگ خزاں کی طرح
لیکن جو پھول کھلتے ہیں صحرا میں بے شمار　　　موقوف کچھ ریاض پہ ان کی نہیں بہار
دیکھو یہ قدرت چمن آرائے روزگار　　　وہ ابر و باد و برف میں رہتے ہیں برقرار
ہوتا ہے ان پہ فضل جو رب کریم کا
موج سموم بنتی ہے جھونکا نسیم کا

''کیا ہو گا دو گھڑی میں کسی کو خبر نہیں'' یہ تو لکھنؤ کی انیسویں صدی کا وہی پرانا انداز ہے جو انیسؔ کے بیشتر ہم عصروں نے اپنایا ہے مگر بعد کے دونوں بند پر غور کیجیے تو ان میں ایک الگ سی کیفیت محسوس

ہوگی۔ پہلے بند میں تو وہی ذکر ہے کہ پرورش و پرداخت میں والدین کسی قسم کی کمی نہیں اٹھا رکھتے مگر ہزار خیال رکھنے اور کوششوں کے باوجود اولاد چشم زدن میں موت کی نذر ہو جاتی ہے جب کہ اس کے برعکس وہ لوگ، جن کا پرسان حال کوئی نہیں ہوتا، وہ خداوند کریم کے زیر سایہ ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے پروان چڑھتے ہیں اور حیرت انگیز طور پر، پھلتے پھولتے رہتے ہیں۔ یہ سب اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب خدا نگہبان ہو۔

اب میں پھر اپنے موضوع کی طرف گریز کرتا ہوں۔ کوشلیاؔ جی سے شری رامؔ چندر جی کی رخصت پڑھ لینے کے بعد لازم ہے کہ اب میر انیسؔ کے انداز سخن پر بھی دوسرے طریقے سے غور کیا جائے تا کہ اس بات کا فیصلہ بھی ہو سکے کہ دونوں کے انداز اور سوچنے کے طریقوں میں کتنی مماثلت ہے۔

خیمے میں آئے روتے ہوئے اکبرِ حزیں　　چھاتی لگایا ماں نے، پھوپھی نے بلائیں لیں
اک آہ سرد بھر کے یہ بولا وہ مہ جبیں　　نرغے میں ظالموں کے اکیلے ہیں شاہِ دیں
روتے ہیں غیر، سیدِ والا کے حال پر
اماں، مقامِ رحم ہے بابا کے حال پر

انیسؔ اور چکبستؔ، دونوں کے ہیرو اپنی اپنی ماؤں کے پاس طلب رخصت کے غرض سے حاضر ہوتے ہیں۔ ایک کو والد کے حکم کی تعمیل میں محل شاہی اور بادشاہت چھوڑ کر چودہ برس کے لیے 'بن باس' کو جانا ہے۔ ماں کی حیثیت سے اجازت دینا جتنا گراں کوشلیاؔ جی کو گزرتا ہے اس کی عکاسی چکبستؔ نے بالکل فطری انداز میں انیسؔ کے مانند کی ہے اور عام طور پر الفاظ اور ترکیبیں بھی ہو بہ ہو وہی استعمال کی ہیں جو ایسے مواقع پر انیسؔ کے یہاں ملتی ہیں۔ مگر انیسؔ نے علی اکبر کی اجازت والا جو حصہ نظم کیا ہے اس کی صورت قدرے مختلف ہے جب کہ نہج دونوں کا ایک ہی ہے۔ کوشلیاؔ جی کو اگر چہ خود سے بھگوان شری رامؔ چندر جی کو چودہ برس کے لیے نظروں سے دور کرنا ہے۔ بیٹے سے اتنی لمبی جدائی کے باعث ان کی جان بھی جا سکتی ہے تو ام لیلیٰ یا حضرت زینب کو علی اکبر کو شہادت کے لیے میدان جنگ کی اجازت دینا مقصود ہے۔ اب چوں کہ یہاں اجازت دینے کے بعد بیٹے کی زندگی کا تصور ہی فوت ہو جاتا ہے اور ہر گھڑی کڑیل جوان کی لاش آنے کا انتظار ہوگا تو کیفیت کافی بدلی ہوئی ہوگی جس کی عکاسی انیسؔ نے بھی ہو بہ ہو ویسی ہی کی ہے جیسا فطرت کا تقاضا ہے۔ چکبستؔ نے انیسؔ کے طور پر اکثر بھگوان رامؔ چندر جی کے بچھڑنے کو علی اکبر جیسا پیش کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ چکبستؔ بھی انیسؔ کی مانند اس طرح کی پیش کش میں پوری طرح کامیاب رہے۔

انیسؔ نے علی اکبر کے اجازت طلب کے لیے خدا کے دین اور امام باپ کی نصرت کا حوالہ دیا جس کے بعد ان کی ماں اور پھوپھی خاموش ہو جاتی ہیں لیکن چکبستؔ کے پاس اس طرح کا کوئی عضر نہ تھا اس لیے انھوں نے شری رامؔ چندر جی سے جو عضر پیش کروائے ہیں اس میں ''مجبور کر دیا مجھے وعدے نے باپ کے'' اور اس کے بعد وہ کوشلیاؔ جی کو بے ثباتی عالم کا حوالہ دیتے ہیں اور ان سے رخصت پانے میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔ یہ چکبستؔ کی بڑی کامیابی ہے۔

ماں باپ منہ ہی دیکھتے تھے جن کا ہر گھڑی　　قائم تھیں جن کے دم سے امیدیں بڑی بڑی
دامن پہ جن کے گرد بھی اڑ کر نہیں پڑی　　ماری نہ جن کو خواب میں بھی پھول کی چھڑی
محروم جب وہ گل ہوئے، رنگ حیات سے
ان کو جلا کے خاک کیا، اپنے ہات سے

اس مقام پر بھی چکبستؔ نے انیسؔ کے مانند بے ثباتی عالم کا ذکر نہایت خوش اسلوبی سے کیا ہے۔ اس کی بیت مخصوص ہے جہاں اس بات کا ذکر ہے کہ ہندو مذہب کے مطابق جب اولاد کا انتقال ہو جاتا ہے تو اسے ''مکھا گنی'' (لاش کو جلانے کا آغاز) باپ کا عین مذہبی فریضہ ہوتا ہے۔ درج بالا بند کی یہ بیت ہندو عقیدے کے پیش نظر بے ثباتی عالم کا بے مثل نمونہ ہے جو حقیقتاً چکبستؔ کا ہی حصہ ہے جسے انھوں نے بحسن و خوبی نبھایا ہے۔ بے ثباتی عالم کے ضمن میں اگر آپ انیسؔ کے درج ذیل بند پر غور فرمائیں تو اندازہ ہوگا کہ چکبستؔ نے یہاں پر بھی انیسؔ سے ہی استفادہ کیا ہے بلکہ کہیں کہیں پر تو وہ انیسؔ کے انداز بیان کی ترجمانی بھی کرتے نظر آئیں گے۔

ہاں مدتوں سے ہے یہی نیرگ روزگار　　ہر گل پہ ایک دن ہے خزاں، ایک دن بہار
میر انیسؔ

اب شری رامؔ چندر جی کے جواب میں ان کی ماں کوشلیاؔ جو کچھ کہتی ہیں اس میں بھی آپ کو جا بہ جا میر انیسؔ جیسا ہی انداز نظر آئے گا۔

یہ گفتگو ذرا نہ ہوئی ماں پہ کارگر　　ہنس کر وفور یاس سے لڑکے پہ کی نظر
چہرے پہ یوں ہنسی کا نمایاں ہوا اثر　　جس طرح چاندنی کا ہو شمشان سے گزر
پنہاں جو بے بسی تھی، وہ چہرے پہ چھا گئی
جو دل کی مردنی تھی نگاہوں میں آگئی

اس بند میں بھی تسلسل اور سلاست کے ساتھ فصاحت اور بلاغت بھی میر انیسؔ کے ہی پائے کی

ہے۔ درج بالا بند کے چوتھے مصرعے میں چکبستؔ نے کوشلیا جی کے حسن کی تعریف میں جس پاکیزگی کے ساتھ تشبیہ دی ہے وہ نایاب اور خاص ہے۔ انیسؔ نے بھی اپنے مراثی میں جا بہ جا جناب زینب کی خوب صورتی کا بیان اسی طرح کی پاکیزگی کو مدنظر رکھ کیا ہے۔ تمام حالات سے واقفیت کے باوجود سمجھانا اور اس دکھ بھرے ماحول میں اس موقع کے لحاظ سے اس سے بہتر تشبیہ ہو ہی نہیں سکتی۔ کوتاہ نظر راقم نے جہاں تک انیسؔ کو پڑھا ہے، ان حالات میں وہ بھی شہر بانو، جناب زینب یا ام لیلیٰ کے غمگین چہرے کے لیے کہیں بھی اس طرح کی تشبیہ نہیں پیش کر سکے ہیں جہاں دل میں پژمردگی ہو اور بظاہر مخاطب کا دل بہلانے کے لیے چہرے سے خوشی کا اظہار ہو رہا ہو اور وہ ہنسی شمشان میں چاندنی کے گزر کی تشبیہ کے ساتھ پیش کی جائے۔ تشبیہ کے لحاظ سے چکبستؔ کے تمام دیوان میں یہ مصرعہ انوکھا اور بے مثل ہے۔ یہ بات اور ہے کہ جذبات نگاری میں کوئی بھی اردو شاعر میر انیسؔ کو نہیں پہنچ سکا۔ مثلاً حضرت زینب کے دونوں بیٹوں کی لاشیں ان کے سامنے پڑی ہیں۔ اس غم کے زیر اثر ان کا چہرہ زرد ہو چکا ہے۔ وہ کون ماں ہوگی جس کے چہرے پر ان حالات میں خوشی کی سرخی نظر آئے۔ ملاحظہ ہو انیسؔ کی یہ پیش کش جب عون و محمد کی لاشیں ان کی ماں حضرت زینب کے سامنے آتی ہیں تو امام حسین بچوں کی تعریف میں فرماتے ہیں ۔

تیغوں میں یہ تیزی، یہ صفائی نہیں دیکھی　　　یہ ضرب، یہ پُھرتی، یہ لڑائی نہیں دیکھی
شیروں سی یہ پُرزور کلائی نہیں دیکھی　　　اعدا میں یہ ہلچل، یہ دُہائی نہیں دیکھی
صفّینؔ و جملؔ میں بھی رن ایسے نہ پڑے تھے
تم پوچھ لو، عباس تو نزدیک کھڑے تھے

یہ سُنتے ہی، سُرخی سی رخِ زرد پہ آئی　　　حضرت سے کہا، آپ کا صدقہ ہے یہ بھائی
کونین میں عزّت مِرے دلبندوں نے پائی　　　اب شاد ہوئی اِن سے، یداللہ کی جائی
آقا، مجھے پیار آتا ہے اقبال پہ ان کے
بیکس ہیں، خدا رحم کرے حال پہ اِن کے

حضرت زینب یا ام لیلیٰ یا حضرت امام حسین سے علی اکبر کے اجازت طلب کرنے کے سلسلہ میں اکثر مقامات پر مکالمے انیسؔ کے کلام میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ علی اکبر کا طرح طرح سے عضر پیش کر کے میدان کی اجازت طلب کرنا اور ماں، باپ یا پھوپھی کا مجبور ہو کر اجازت دینے سے انکار کرنا اور بعد میں اجازت دے دینا۔ اس طرح کے منظر بھی انیسؔ کے یہاں عام ہیں۔ ایسے مواقعے پر جب ماں، باپ یا پھوپھی مجبور ہو جاتے ہیں تو ان کے تاثرات جو انیسؔ کے یہاں ملتے ہیں قریب قریب وہی سارا نقشہ چکبستؔ

نے بھی کھینچا ہے ۔

پھر یہ کہا کہ میں نے سنی سب یہ داستان　　　لاکھوں برس کی عمر ہو، دیتے ہو ماں کو گیان
لیکن جو میرے دل کو ہے درپیش امتحان　　　بچے ہو، اس کا علم نہیں تم کو بے گمان
اس درد کا شریک تمھارا جگر نہیں
کچھ مامنا کی آنچ کہ تم کو خبر نہیں

آخر ہے عمر، ہے یہ مرا وقت واپسیں　　　کیا اعتبار، آج ہوں دنیا میں، کل نہیں
لیکن وہ دن بھی آئے گا، اس دل کو ہے یقیں　　　سوچو گے جب کہ روتی تھی کیوں مادر حزیں
اولاد جب کبھی تمھیں صورت دکھائے گی
فریاد اس غریب کی تب یاد آئے گی

ان آنسوں کی قدر تمھیں کچھ ابھی نہیں　　　باتوں سے جو بجھے، یہ وہ دل کی لگی نہیں
لیکن تمھیں ہو رنج، یہ میری خوشی نہیں　　　جاؤ، سدھارو، خوش رہو، میں روکتی نہیں
دنیا میں بے حیائی سے زندہ رہوں گی میں
پالا ہے میں نے تم کو تو دکھ بھی سہوں گی میں

بچوں سے والدین کی محبت اور انھیں یہ کہہ کر سمجھانا کہ چوں کہ تم ابھی اولاد والے نہیں ہو اس لیے والدین کے دل میں لگی ہوئی آگ کو محسوس نہیں کر سکتے۔ جب تم بھی صاحب اولاد ہو گے تب تم کو اس بات کا احساس ہوگا کہ ہمارے دل پر کیا گزری۔ ان باتوں کو جس طرح میر انیسؔ نے بیان کیا ہے ٹھیک وہی سب تاثرات چکبستؔ کے یہاں بھی اسی انداز سے نظر آتے ہیں۔ اس سلسلہ میں چکبستؔ کے بالا بیان کے علاوہ درج ذیل دو اور بند ملاحظہ ہوں ۔

دیتا اگر تمھیں کوئی فرزند ذوالجلال　　　ہوتی پدر کی قدر، سمجھتے ہمارا حال
رخصت کا باپ سے یونہی کرتا وہ جب سوال　　　تب جانتے کہ دیتے اسے رخصت جدال
کیا جانے وہ، مزہ جسے اس کا ملا نہیں
اچھا سدھارو، تم سے ہمیں کچھ گلا نہیں

نشتر تھے رامؔ کے لیے یہ حرف آرزو　　　دل ہل گیا، سرکنے لگا جسم سے لہو
سمجھے جو ماں کے دین کو ایمان و آبرو　　　سننی پڑے اسی سے خجالت کی گفتگو
کچھ بھی جواب بن نہ پڑا فکر و غور سے

قدموں پہ ماں کے گر پڑا، آنسو کے طور سے

جسم سے لہو سرکنا، ماں کے دین کو اپنا ایمان و آبرو سمجھنا اور آنکھ سے ٹپکے ہوئے آنسو کے مانند ماں کے قدموں پر گرنے کے بیان کا یہ طریقہ انیسؔ سے کیا گیا استفادہ ہے۔ اگر اسی ضمن میں انیسؔ کے مراثی پر نظر ڈالیں تو بات کی تصدیق ہو جائے گی۔ بھلے ہی چکبستؔ کے یہاں وہ روانی نہ ملے جو انیسؔ کے یہاں ہے۔ یہ بات بھی درست ہے کہ یہاں چکبستؔ نے فصاحت کو بچانے کے لیے بلاغت کو ہدف بنا دیا مگر شعریت میں کمی نہ آنے دی۔

جاتا کہیں نہ چھوڑ کے قدموں کو آپ کے
مجبور کر دیا مجھے وعدے نے باپ کے

یہاں بن باس کے سلسلہ میں ماں سے جدائی کی مجبوری کو چکبستؔ نے اس طرح بیان کیا ہے کہ ایک بیٹا، ماں کی محبت میں گرفتار اس کے قدموں کو چھوڑ کر ہٹنا نہیں چاہتا مگر اسے اپنے باپ سے کیے گئے اس وعدے کا پاس بھی رکھنا ہے جو شری رامؔ چندر جی کے والد نے اپنی تیسری بیوی (کیکائیؔ) سے کیا تھا۔ بھلا رامؔ جیسی شخصیت یہ کب گوارا کر سکتی تھی کہ ان کے والد کا وعدہ شرمندۂ تعبیر نہ ہو۔ باپ کے اسی وعدے کے وفا کے لیے ایک بیٹا، ماں سے اجازت طلب کرتا ہے۔ میر انیسؔ کے یہاں بھی یہی سب کچھ من وعن بیان کیا گیا ہے مگر وہاں پر فرق صرف یہ ہے کہ حضرت امام حسین کی نصرت اور دین اسلام کو بچانے کی غرض سے علی اکبر اپنی ماں اور پھوپھی سے وداع چاہتے ہیں، جسے نبھانے کے لیے ایک فرماں بردار بیٹا اجازت چاہ رہا ہے۔ دونوں مقام پر مقصد صرف ماں سے دور جانے کی اجازت کا ہے۔ اس کا بیان انیسؔ کے یہاں کچھ اس طرح سے کیا گیا ہے:

(مرثیہ: اے مومنوں مرنے کے لیے جاتے ہیں اکبر)

کہنے لگے سن کر یہ سخن سید ابرار   بیٹا تری تقریر سے ہم ہو گئے لاچار
پھر گرنے لگا باپ کے قدموں پہ وہ دلدار   لپٹا کے گلے سے شہ والا نے کیا پیار
فرمایا کہ رُلواؤ نہ مجھ سوختہ جاں کو
اچھا یہی مرضی ہے تو راضی کرو ماں کو
رو کر کہا اکبر نے کہ اے مادرِ غم خوار   مانگو یہ دعا زندہ رہیں سید ابرار
اب دودھ ہمیں بخشو کہ ہیں مرنے کو تیار   اس پیاس میں ہیں جامِ شہادت کے طلبگار
کوکھ اپنی بچانے کا نہ سامان کرو ماں

زہرا کے پسر پر ہمیں قربان کرو ماں
بانو نے کہا صبر تو آتا نہیں واری   تم نے تو چھری ماں کے کلیجے پہ ہے ماری
مرجاؤں گی اے لال میں فرقت میں تمہاری   خیر اب یہی مطلب ہے تو منگواؤ سواری
پر میں کوئی حسرت تو نکالوں علی اکبر
آؤ تمھیں دولہا تو بنالوں علی اکبر

ان مکالمات میں چند باتیں ایسی ہیں جو سامعین کو بہت متاثر کرتی اور ان کے دل پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ جیسے علی اکبر کا رخصت طلب کرتے ہوئے ماں سے دودھ بخشنے کی التجا کرنا، جسے میر انیسؔ نے بالا بند میں بڑے پُر اثر طریقے سے بیان کیا ہے۔ چوں کہ ہندو مذہب میں ماں سے دودھ بخشوانے کا کوئی تصور نہیں ہے ورنہ میر انیسؔ کے اس خیال سے بھی چکبستؔ نے استفادہ ضرور کیا ہوتا اور قریب قریب اسی انداز سے اس مضمون کو پیش بھی کیا ہوتا جس طرح انیسؔ نے پیش کیا ہے۔ بند ملاحظہ ہو:

(مرثیہ: مومنوں مرنے کو ہم شکل نبیؐ جاتا ہے)

سن کے یہ بانو نے، فرزند سے پوچھا رو رو   کیا کہا چاہتے ہو، ماں سے تو اے لال کہو
ہاتھ کیوں جوڑے ہو، ان ہاتھوں کے ماں صدقے ہو   کہا اکبر نے، رضا مرنے کی اماں ہمیں دو
صبر فرماؤ کہ اب تم سے جدا ہوں گے ہم
دودھ بخشو ہمیں بابا پہ فدا ہوں گے ہم
یہ سخن سنتے ہی فرزند سے، ماں ہو گئی زرد   دھیان آیا کہ چلا ہائے پسر بہر نبرد
مُردنی چھا گئی چہرے پہ، اٹھا دل میں درد   دیکھ منہ بیٹے کا کہنے لگی بھر کر دمِ سرد
تم سے بچھڑوں گی میں واری تو کدھر جاؤں گی
پھر نہ رخصت کا سخن کہنا کہ مر جاؤں گی

اگر چہ میر انیسؔ نے میدان کربلا کے حالات کے پیش نظر علی اکبر سے جس طرح سے عذر پیش کروائے ہیں، ٹھیک اسی طرح وقت و حالات کے پیش نظر چکبستؔ نے بھی شری رامؔ چندر جی کے ذریعے ماں سے اسی طرح کے عذر پیش کرائے ہیں۔ میر انیسؔ کے ہی مانند چکبستؔ کے یہاں بھی کلام کی درستگی، چستی اور فصاحت کا خاصا خیال رکھا گیا ہے۔ اب شری رامؔ کے عذر پر بھی غور فرمائیے اور فصاحت کلام کی داد دیجیے۔

آرام زندگی کا دکھاتا ہے سبز باغ   لیکن بہار عیش کا مجھ کو نہیں دماغ
کہتے ہیں جس کو دھرم، وہ دنیا کا ہے چراغ   ہٹ جاؤں اس روش سے تو کُل میں لگے گا داغ

بے آبرو یہ بنس نہ ہو، یہ ہراس ہے
جس گود میں پلا ہوں، مجھے اس کا پاس ہے

بن باس پہ خوشی سے جو راضی نہ ہوں گا میں — کس طرح منھ دکھانے کے قابل رہوں گا میں
کیوں کر زبانِ غیر سے طعنے سنوں گا میں — دنیا جو یہ کہے گی، تو پھر کیا کہوں گا میں
''لڑکے نے بے حیائی کو نقشِ قدم کیا؟
کیا بے ادب تھا، باپ کا کہنا نہیں کیا!''

چکبستؔ کے درج بالا دونوں بند کی بیت فصاحت کا بہترین نمونہ ہے۔ ٹھیک اسی طرح کی ترکیبیں، وہی نداز بیان جو میر انیسؔ کے یہاں قدم قدم پر نظر آتا ہے، چکبستؔ کے یہاں بھی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔ خاص طور پر دوسرے بند کی بیت کا ثانی مصرعہ ''کیا بے ادب تھا، باپ کا کہنا نہیں کیا''۔ میر انیسؔ کے کمالات میں ان کے اُس روز مرہ کا بھی بڑا دخل ہے جس پر انھیں بہت ناز تھا۔ غور فرمائیں تو صاف ہو جائے گا کہ میر انیسؔ کا روز مرہ چکبستؔ کے کلام میں بھی عام ہے۔ میر انیسؔ جیسے روز مرہ کے استعمال کی بدولت چکبستؔ میر انیسؔ کے کافی قریب نظر آتے ہیں۔ درج ذیل، اخیر کے دو بند میں کوشلیاؔ جی نے شری رامؔ چندر جی کو جس انداز میں قدموں سے اٹھا کر رضامندی پیش کی گئی ہے، اس طرح کا انداز بیان انیسؔ کے یہاں بھی جا بہ جا موجود ہے۔ اس انداز سے استفادہ کرتے ہوئے چکبستؔ نے کوشلیاؔ جی سے رامؔ چندر جی کو اجازت دلائی ہے۔

تاثیر کا طلسم تھا معصوم کا جواب — خود ماں کے دل کو چوٹ لگی، سن کے یہ جواب
غم کی گھٹا سے مٹ گئی تاریکیِ عتاب — چھاتی بھر آئی، ضبط کی باقی رہی نہ تاب
سرکا کے پانوں، گود میں سر کو اٹھا لیا
سینے سے اپنے لختِ جگر کو لگا لیا

دونوں کے دل بھر آئے، ہوا اور ہی سماں — گنگ و جمن کی طرح سے آنسو ہوئے رواں
ہر آنکھ کو نصیب یہ اشک وفا کہاں — ان آنسوؤں کا مول اگر ہے تو نقدِ جاں
ہوتی ہے اِن کی قدر فقط دل کے راج میں
ایسا گہر کہاں کوئی دشرتھ کے تاج میں

ہر چند کہ چکبستؔ کی نظم بہت جذباتی اور انیسؔ کے اثرات سے لبریز نظر آتی ہے مگر غور کیا جائے تو صاف ہوگا کہ چکبستؔ نے حفظ مراتب کا خیال اس طرح سے نہیں رکھا جس طرح میر انیسؔ نے ہر بند اور ہر

مصرعے میں رکھا ہے۔ چکبستؔ نے اپنی اس نظم میں شروع سے اخیر تک یہ کوشش کی ہے کہ رامؔ جی کو ان کے کردار کے مطابق ایک نہایت فرماں بردار فرزند اور بردبار شخص کی حیثیت سے ماں کے حضور پیش کریں مگر اس نظم میں کم از کم ایک ایسا مقام ضرور آیا ہے جہاں پر چکبستؔ بری طرح سے چوکے ہیں۔ وہ بند مندرجہ ذیل ہے، جسے غور سے پڑھنے پر وہ کمی نمایاں ہوتی ہے۔

راحت ہو یا کہ رنج، خوشی ہو کہ انتشار — واجب ہر ایک حال میں ہے شکر کردگار
تم ہی نہیں ہو کشتۂ نیرنگ روزگار — ماتم کدے میں دہر کے، لاکھوں ہیں سوگوار
سختی سہی نہیں کہ اٹھائی کڑی نہیں
دنیا میں کیا کسی پہ مصیبت پڑی نہیں؟

چکبستؔ کے اس بند پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ شری رامؔ چندر جی جیسے فہمیدہ، منکسر مزاج، بلند و بالا شخصیت کے مالک، دھرم کے تاجدار، ادنیٰ اور حقیر سے بھی نرمی سے گفتگو کرنے والے، بزرگوں کی بزرگی کے پاسدار، اپنی ماں کو ہموار کرنے کے لیے طرح طرح سے کوشش کی۔ باپ کے وعدے کا دھیان دلایا، اپنی خودداری اور خاندان کے وقار کے طرف اشارہ کیا، اس گود کی بلندی کا واسطہ دیا جس میں وہ پلے تھے۔ اخیر میں بے ثباتی عالم کا ذکر کر کے انھیں ہموار کرنے کی کوشش کی، جو سب کچھ بھگوان شری رامؔ چندر جی کے معیار کے مطابق ہے مگر بالا بند میں شری رامؔ چندر جی کی زبان سے ادا ہوا یہ کلمہ کہ ''دنیا میں کیا کسی پہ مصیبت پڑی نہیں''؟ خاصا معیوب لگتا ہے، دونوں مصرعے جو کہ اپنی جگہ پر درست ہیں مگر شری رامؔ چندر جی کی زبان سے ماں کے ضمن میں گستاخی محسوس ہوتے ہیں۔ یہ بہترین بند پوری نظم میں کھٹکتا ہے۔ اس بند کو اگر نثر میں لکھا جائے تو غالباً اس کی اصل صورت یہی ہوگی ''خوشی اور بے فکری کا دور ہو یا رنج و غم کا ماحول، انسان کو ہر حال میں پروردگار کا شکر گزار ہونا چاہیے کیوں کہ زندگی کے ہر نشیب و فراز خداوند کریم کی مرضی ہوتے ہیں۔ ایک تم ہی نہیں ہو جو کہ حالات کی جادوگری کا شکار ہو گئی ہو یا صرف تم ہی نہیں جسے یہ برا دن دیکھنا پڑ رہا ہے بلکہ دنیا کے اس ماتم کدے میں لاکھوں سوگوار ہیں۔ دنیا میں کون ایسا ہے جس نے زمانے کی سختیاں نہیں برداشت کی ہیں یا کڑی مصیبت سے دوچار نہیں ہوا ہے۔ یہ حال تو تمام عالم کا ہے، تمھیں دیکھ کر تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے آج تک کسی پر مصیبت ہی نہ پڑی ہو۔'' یہاں پر چکبستؔ نے حفظ مراتب کو فراموش کر دیا اور ان کا انداز بھی مودبانہ نہیں ہے۔ کم از کم دو مصرعوں سے تنبیہ صاف جھلکتی نظر آتی ہے جو بھگوان شری رامؔ چندر جی جیسی شخصیت کے شایان شان ہرگز نہیں ہے۔ پھر بھی اس نظم میں جو خوبیاں ہیں اس کے پیش نظر یہ معمولی سی خامی چاند میں لگے داغ کی طرح ہی محسوس کی جانی چاہیے۔

اس ایک کمی کے علاوہ بھی چکبستؔ کی اس نظم میں جگہ جگہ تعقید لفظی اور حشو وزوائد کا استعمال قاری کے لیے گرانبار ضرور ہے مگر یہ کمیاں ایسی نہیں جو اس نظم کی خوب صورتی اور خوب سیرتی پر بھاری پڑ سکیں کیوں کہ تعقید لفظی سے تو خود کو دنیا کا کوئی بھی شاعر بچا نہیں سکا ہے اور حشو بھی صف اوّل کے بہتیرے شعرا کے یہاں حسن اور عیب، دونوں شکلوں میں بہ کثرت نظر آتے ہیں۔

چکبستؔ کی اس نظم کے ضمن میں اخیر میں اتنا اور کہوں گا کہ اگر خداوند کریم نے انھیں صرف اتنی سی زندگی اور عطا کی ہوتی کہ وہ ’رام چرِت مانَس‘ کے منظوم اردو ترجمے کو پورا کر پاتے تو شاید یہ بھی اردو ادب میں ایک بڑا اضافہ ہوتا اور مسلمانوں میں مراثی انیسؔ کے ہی مانند ہندوؤں کے درمیان اس بیش بہا خزانے کی بڑی اہمیت ہوتی اور یہ اردو ادب کے لیے بھی بہت مفید ہوتا۔ اردو میں میر انیسؔ وہ واحد شاعر ہیں جنھوں نے اردو میں Epic کی کمی کو پورا کیا۔ اگر چکبستؔ نے بھی پوری ’رام چرت مانس‘ کو اردو میں نظم کر دیا ہوتا تو انیسؔ کے ساتھ ان کے ایپک پارے بھی بلند و بالا مقام پر ہوتے۔ چکبستؔ کی ناوقت موت کی وجہ سے اردو ادب میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے اس کا پر ہونا شاید ممکن نہیں۔

☆☆☆

پروفیسر ندیم احمد
شعبۂ اردو، کلکتہ یونیورسٹی، کولکاتا

شہناز نبی کی نظم ’میں کیوں مانوں‘ کا تجزیاتی مطالعہ

تلخیص:
حقیقت اساس مستقبل اور اپنے Futuristic رویے کے لحاظ سے یہ نظم جدید تر شعرا کی گرفت میں آنے والے مناظر اور محسوسات کی دنیا سے بہت آگے کی چیز معلوم ہوتی ہے۔ انسانی صورت حال کی ناکامی اور اپنے اردگرد پھیلے ہوئے کائناتی نقص کو اس نظم کے متکلم نے بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ برہمی اور نیم فلسفیانہ غم آلودگی کے چاک سے آنے والی روشنی اس نظم کو ایک ایسی حسیت عطا کرتی ہے جسے کسی نئی اصطلاح کی عدم موجودگی میں ہم نو ترقی پسند حسیت کا نام دے سکتے ہیں۔
یہ دراصل کسی وسیع تر اثبات کی تلاش سے عبارت ہے۔ نفی اور اثبات کی کشمکش کو روح کی گہرائیوں میں محسوس کرنے والا یہ متکلم اس Radical ترقی پسند کی یاد دلاتا ہے، جسے نعروں کے شور میں ہم کہیں پیچھے کھو آئے ہیں۔ معاشرتی ٹوٹاؤ اور تمام تر اخلاقی قدروں کی پامالی کے اس دور میں جتنا کچھ اور جیسا کچھ اثبات فن کار سے ممکن ہو سکتا ہے، وہ یہاں موجود ہے۔ حالات کی ناسازگاری اور وقت کے جبر کے باوجود نظم کا متکلم آخر تک زندگی کا دامن نہیں چھوڑنا چاہتا۔ اسے خوب پتا ہے کہ آرٹ بنفسہٖ زندگی کی جستجو اور ایک نئے توازن کی تلاش کا نام ہے۔

کلیدی الفاظ:
شہناز نبی، میں کیوں مانوں، حقیقت اساس مستقبل، ترقی پسندی، جدیدیت، اقدار، جمالیاتی اقدار

حقیقت اساس مستقبل اور اپنے Futuristic رویے کے لحاظ سے یہ نظم جدید تر شعرا کی گرفت میں آنے والے مناظر اور محسوسات کی دنیا سے بہت آگے کی چیز معلوم ہوتی ہے۔ انسانی صورت حال کی ناکامی اور اپنے اردگرد پھیلے ہوئے کائناتی نقص کو اس نظم کے متکلم نے بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ برہمی اور نیم

فلسفیانہ غم آلودگی کے چاک سے آنے والی روشنی اس نظم کو ایک ایسی حسیت عطا کرتی ہے جسے کسی نئی اصطلاح کی عدم موجودگی میں ہم نو ترقی پسند حسیت کا نام دے سکتے ہیں۔ ترقی پسندی ایک نیا طرزِ زندگی تخلیق کرنے اور اس کی معنویت کو دریافت کرنے سے عبارت ہے کم از کم میں تو اس لفظ کا یہی مطلب سمجھتا ہوں۔ سیاسی قوتوں کا آلۂ کار بن کر ایک خاص قسم کا ادب پیدا کرنا نہ تو ترقی پسندی ہے اور نہ ہی صرف اُداس بھیڑوں کا ادب پیدا کرنا اصل جدیدیت۔ روحانی مایوسیوں اور جنگ کے بغیر اوپر سے تھوپی ہوئی شکست اس نظم کے متکلم کو تھوڑی دیر کے لیے ہلا تو ضرور دیتی ہے لیکن ان منفی عناصر کے پہلو بہ پہلو جو اثبات اسے حاصل ہوتا ہے وہ موت کے خلاف اس کی جدوجہد کا نشان بھی ہے اور نئی طرزِ زندگی تخلیق کرنے کا پیش خیمہ بھی:

میں کیوں مانوں ایسا ویسا

میں کیوں ہاروں کھیل سے پہلے

میری رگوں میں گرم لہو کا رقص

ابھی تک تابندہ ہے

تیروں کا ہوا میں رستہ بھولنا، آسمان پر روشن ستاروں کا ایک ایک کر کے ٹوٹنا، نرم مٹی کا پتھر میں بدل جانا اور آندھی کا کھیتوں کو چاٹ جانا، جیسے مظاہر نظم کو بے احتیاطی سے پڑھنے والوں کے لیے منفی تاثر خلق کریں گے لیکن اس نظم کا بنیادی استعارہ 'میں کیوں مانوں' اگر گرفت میں آجائے تو یہ حقیقت بھی صاف ہو جائے گی کہ یہ ساری نفی:

میرا سیارہ گہنایا

میری بستی گونگی بہری

چوپالوں کا راج ہے چوپٹ

میرا قبیلہ نامردوں کا

میرا اک آنگن مرگھٹ

دراصل کسی وسیع تر اثبات کی تلاش سے عبارت ہے۔ نفی اور اثبات کی کشمکش کو روح کی گہرائیوں میں محسوس کرنے والا یہ متکلم اس Radical ترقی پسند کی یاد دلاتا ہے، جسے نعروں کے شور میں ہم کہیں پیچھے کھو آئے ہیں۔ معاشرتی ٹوٹاؤ اور تمام تر اخلاقی قدروں کی پامالی کے اس دور میں جتنا کچھ اور جیسا کچھ اثبات فن کار سے ممکن ہو سکتا ہے، وہ یہاں موجود ہے۔ حالات کی ناسازگاری اور وقت کے جبر کے باوجود نظم کا متکلم آخر تک زندگی کا دامن نہیں چھوڑنا چاہتا۔ اسے خوب پتا ہے کہ آرٹ بنفسہٖ زندگی کی جستجو اور ایک

نئے توازن کی تلاش کا نام ہے۔ اس توازن کو حاصل کرنے میں اسے بہت سی ایسی چیزوں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے، جسے معمولی اعصاب کا آدمی دیکھتے ہی ڈھیر ہو جائے:

میرے سارے تیر ہوا میں رستہ بھولے

آسمان پر جگمگ کرتے

تارے اک اک کر کے ٹوٹے

معمولی فن کار تو خیر کیا بچتے ہیں بعض بڑے لوگ بھی اپنے عہد کی مجبوریوں اور معذوریوں کے آگے یا تو سپر ڈال دیتے ہیں یا اس ریاضت سے تھک کر کسی نظریے کے سائے میں جا بیٹھتے ہیں۔ سپر ڈالنا تو بہت دور کی بات ہے، اس نظم کا کردار/متکلم تو یہ ماننے کو تیار ہی نہیں کہ ناکامی اس کے دروازے تک آ پہنچی اور اخلاقیات کا مکمل انحطاط ہو چکا ہے:

میں کیوں مانوں

میرے کھیتوں کو اک آندھی چاٹ رہی ہے

میرے پاؤں کے نیچے دلدل

میرے سر پر کالا سایہ

میرے سورج چاند ہیں جھوٹے

میرا سیارہ گہنایا

نظم کا عنوان ہی اس مثبت ترقی پسند رویے Positive Progressive Approach کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو ناکامی کے بجائے مسلسل زندگی کے چیلنج قبول کرنے کا نام ہے۔ جس تعجب اور تحیر سے بھرے سوال کی ابتدا نظم کے عنوان سے ہوتی ہے اس کا جواب نظم کی انتہا پر ملتا ہے:

میں کیوں مانوں ایسا ویسا

میں کیوں ہاروں کھیل سے پہلے

میری رگوں میں گرم لہو کا رقص

ابھی تک تابندہ ہے

میرے ذہن میں سوچ کی لہریں

اب بھی لیتی رہتی ہیں کروٹ

میرے دل میں دھڑکن زندہ

دھڑکن کا زندہ رہنا بے زاری اور موت کی شکست کا اعلان نامہ ہے۔ گرم لہو کا رقص اور ذہن میں سوچ کی کروٹیں لیتی ہوئی لہریں استعارہ ہیں دراصل اس بسیط زندگی کا جو اپنی ناپائیداری کے باوجود اپنے ہونے کے احساس سے پرے ہے۔ حسرت، مایوسی، تشکک اور آس پاس کے ماحول کا ٹوٹتا ہوا طلسم نظم کرنے کے لیے جو ابتدائی فضا خلق کرتے ہیں وہ سیلاب کی قوت سے گرجتی ہوئی زندگی کی ندی کو روکنے کا عزم نہیں رکھتی اور راستے ہی میں چیں بول جاتی ہے۔ انفعالیت اور زندگی سے منھ چھپاتے ہوئے تجربات اس نظم میں راستہ نہیں پاتے۔ یہاں تو زندگی دروازے توڑ توڑ کر اندر گھستی چلی آئی ہے۔ اس نظم کا متکلم تو مجھے فورسٹر کا وہ خیالی ناول نویس معلوم ہوتا ہے جس کے لیے سب سے اہم چیز اپنی انگلیوں کے درمیان قلم کا احساس ہے تاکہ وہ زندگی کے اثبات کو اپنے پورے جلال کے ساتھ پیش کر سکے۔ زندگی کا کوئی نقش اس کی دسترس سے دور نہیں ہے۔ ذہنی اور جذباتی خود اعتمادی اور طاقت کا جیسا روشن اظہار اس نظم میں ہوا ہے، اردو کی معاصر شاعری میں اس کی صرف دو مثالیں کم سے کم اس وقت مجھے یاد آ رہی ہیں۔ افضال احمد سید اور ذیشان ساحل کی نظمیں۔ یہ شعرا قائم تو ہوئے ہیں جدید رویے کے ذریعہ لیکن تقلید کے زور میں یہ لوگ یرمیاہ کی طرح اس دن پر لعنت نہیں بھیجتے جس دن وہ پیدا ہوا تھا۔ ذیشان ساحل پر لکھتے ہوئے شمیم حنفی نے یہی بات کہی تھی کہ اس شاعری کی اساس جن رویوں پر قائم ہے، وہ پہلی جنگ عظیم کے بعد کے یورپی کلچر کی تہ سے رونما ہونے والی برہمی اور نیم فلسفیانہ غم آلودگی کے بعد کا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے یہاں تقلیدی جدیدیت کے زور نے نئے لکھنے والوں کی توجہ آواں گارد میلانات کے تاریخی سیاق سے یا تو ہٹا دی یا پھر اتنی کم کر دی کہ نئی شاعری سے مستقل بینی کا عنصر تقریباً معدوم ہو گیا۔ ان حالات میں وہ نظمیں جو زندگی کو اپنی بے پناہ وسعتوں کے ساتھ سمیٹنے کا عزم رکھتی ہیں بذات خود اپنے وجود کا جواز ہیں۔ اس نظم کا پہلا مصرع ہی اس بات کی دلیل ہے کہ متکلم کے اندر زندگی ابھی مری نہیں ہے۔ وہ زندگی کو اپنی رونقوں کے ساتھ محسوس کر رہا ہے۔ حالات کی ابتری اور انتشار کے باوجود وہ ایک ایسی زندگی کا متلاشی ہے جو جہد اور عزم سے پُر ہے۔ زر پرستانہ اقدار نے بنیادی تعلقات کے مظاہر یعنی سماجی اداروں میں جو کھوٹ ملا دیا ہے اس کا شدید احساس اس نظم کے متکلم کو ہے:

میری بستی گونگی بہری
چوپالوں کا راج ہے چوپٹ
میرا قبیلہ نامردوں کا
میرا اک اک آنگن مرگھٹ

لیکن سوچ کی لہریں اسے روحانی بالیدگی اور بلند ہمتی کے ایسے مقام پر فائز کر دیتی ہیں جہاں وہ زندگی کو اپنی اصلی شکل میں دیکھ رہا ہے اور اسے ہر حال میں برقرار رکھنے پر تلا ہے۔ انسانی اور اخلاقی تعلقات کی سماج میں جو اقدار رائج ہیں، وہ اسے شبہہ کی نظر سے تو ضرور دیکھتا ہے لیکن وہ ان سے اس حد تک بیزار نہیں کہ موت کی تمنّا کرے۔ زندگی اسے عزیز ہے کیوں کہ یہ برسوں کی تہذیبی اور معاشرتی جدوجہد کے بعد اسے حاصل ہوئی ہے۔ اپنی جمالیاتی قدر و قیمت کے علاوہ یہ نظم اسی زندگی کو بحال رکھنے کی ایک فن کارانہ کوشش ہے۔ ایک ایسی کوشش جو اپنے وجود کے اعتبار سے مختلف بھی ہے اور بہت مالا مال اور متنوع بھی۔

☆☆☆

ڈاکٹرمحمد شہنواز عالم
اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو، اسلام پور کالج، اسلام پور، مغربی بنگال۔رابطہ نمبر:9874430252

حلقۂ ارباب ذوق اور میراجی

تلخیص:

بیسویں صدی میں جو تحریکات اور میلانات ادبی منظرنامے کا حصہ بنے ان میں حلقۂ ارباب ذوق کا نام بہت نمایاں ہے۔ترقی پسند ادبی تحریک نے ادب اور سماج کے رشتوں کو ہموار کرنے کی پرزور کوشش کی جب کہ حلقۂ ارباب ذوق کے حامیوں نے سماجی جمود کے بجائے ادبی انجماد کی بت شکنی کی۔یعنی اردو زبان و ادب کو مادی آلائشوں سے بلند اور انسان کے داخلی اسرار و افکار کو عرفان حیات کی جانب مائل کیا۔ترقی پسند تحریک کا عمل خارجی اور ہنگامی تھا جب کہ حلقۂ ارباب ذوق کا طریقۂ کار داخلی۔
حلقۂ ارباب ذوق نے ایک ایسے رجحان کی پرورش کی جس کی بنا پر جدید نئ شاعری کا وجود عمل میں آیا۔حلقۂ ارباب ذوق کے شعرا و ادبا اس شعری رویے پر زور دیتے ہیں کہ اظہار و بیان میں موضوعاتی واسلوبیاتی سطح پر غیر متوقع صورت حال اور اجنبی پن ہونا چاہیے یہی وجہ ہے کہ حلقۂ ارباب ذوق نے ادب کو سیاسی اور اخلاقی آمریت سے نہ صرف بچایا بلکہ ادبا و شعرا کو ان غیر ادبی گروہوں سے نجات دلائی جو قاری کی عام انسانی کمزرویوں سے فائدہ اٹھا کر اسے اپنے مخصوص سیاسی نظریات کا غلام بنانا چاہتے تھے۔
حلقۂ ارباب ذوق کے شعرا و ادبا میں سب سے فعال، متحرک، دانشور، دور بین، دور اندیش، زیرک اور تخلیقی اعتبار سے باکمال شخصیت میراجی کی تھی، کیوں کہ ان کی شخصیت اپنے پورے وجود کے ساتھ ان کی تحریروں میں نمایاں ہے۔انھوں نے اپنے خواب و خیال کو حقائق کی روشنی میں پیش کیا ہے۔ علامتوں، استعاروں، تشبیہوں اور اشاروں کے ذریعے اپنے خوابوں کو بیدار کیا۔انھوں نے اردو نظم میں داخلیت اور انسانی اندرونی کیفیات کی جو پاسداری کی تھی وہ اس قدر مقبول ہوئی کہ حلقہ کے شعرا کے علاوہ دوسرے شعرا نے بھی میراجی کے شعری رویے کی نہ صرف ترویج کی بلکہ اپنی تخلیقات

کے ذریعہ اس روایت کو فروغ دیا۔

کلیدی الفاظ:

حلقۂ ارباب ذوق، انفرادیت پسندی، علامت نگاری، ادب اور جمالیات، میراجی، جبلت مرگ، شاعری میں ابہام، جدید شاعری، تاثریت، علامت نگاری، وجودیت، سرریلیزم۔

....

بیسویں صدی میں جو تحریکات اور میلانات ادبی منظرنامے کا حصہ بنے ان میں حلقۂ ارباب ذوق کا نام بہت نمایاں ہے۔ترقی پسند ادبی تحریک نے ادب اور سماج کے رشتوں کو ہموار کرنے کی پرزور کوشش کی جب کہ حلقۂ ارباب ذوق کے حامیوں نے سماجی جمود کے بجائے ادبی انجماد کی بت شکنی کی۔یعنی اردو زبان و ادب کو مادی آلائشوں سے بلند اور انسان کے داخلی اسرار و افکار کو عرفان حیات کی جانب مائل کیا۔ترقی پسند تحریک کا عمل خارجی اور ہنگامی تھا جب کہ حلقۂ ارباب ذوق کا طریقۂ کار داخلی۔بعض لوگوں کے نزدیک ترقی پسند تحریک اور حلقۂ ارباب ذوق ایک دوسرے کی ضد ہیں لیکن جب ہم ان کا موضوعات اور فنی طریقۂ کار سے جائزہ لیتے ہیں تو ہم پر یہ بات منکشف ہوتی ہے کہ ان کے حدود اور امتیازات ایک دوسرے سے متمائز اور متغائر ہیں۔ترقی پسند تحریک اور حلقۂ ارباب ذوق ایک ہی عہد کی پیداوار اور ایک جیسے سماجی، سیاسی، معاشرتی اور معاشی صورتحال کی پروردہ ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ترقی پسند تحریک کے سامنے حلقۂ ارباب ذوق کے چراغ کی لو تیز نہ ہوسکی۔لیکن ترقی پسند تحریک کے زوال کے بعد جب جدید شاعری اور افسانوی ادب کے مضبوط رجحان نے حلقۂ ارباب ذوق کی روایتوں کو آگے بڑھا کر تقویت بخشی تو حلقہ ارباب ذوق کی طاقت کا اندازہ ہوا۔ دراصل یہ انفرادیت پسندی اور علامت نگاری کا ایک قومی رجحان تھا جس کی پرورش حلقۂ ارباب ذوق نے کی اور ادب کے فن پارہ کو پرکھنے اور سمجھنے کے لیے جدید زاویہ اختیار کیا۔گویا، نظم افسانہ اور تنقید کو خالص ادبی یا نفسیاتی نقطۂ نظر کی کسوٹی پر پرکھنے کا عمل وجود میں آیا۔اس سلسلے میں راشد صاحب نے بڑی عمدہ بات کہی ہے ''جدید شاعر صرف وہی ہے جو جدید شعر کہتا ہے ۔صرف اس نوع کے شعر کہتا ہو جن پر قدامت اور روایت کی مہر ثبت نہ ہو جو ہر لحاظ سے جدید انداز فکر کے حامل ہوں جن کے اندر کسی خیالی یا معنوی زندگی کی ترجمانی ہو جن میں روایتی طور پر جانے بوجھے خیالات، احساسات اور علامات وغیرہ کا ذکر نہ ہو۔خیالات و احساسات اور علامات بلکہ ہر وہ چیز جو شاعر کا راس المال بنتا ہے کسی طرح قاری کے حسب توقع نہ ہو بلکہ غیر متوقع اور اجنبی ہو۔''

حلقۂ ارباب ذوق نے ایک ایسے رجحان کی پرورش کی جس کی بنا پر جدید نئ شاعری کا وجود عمل

میں آیا۔حلقۂ ارباب ذوق کے شعرا و ادبا اس شعری رویے پر زور دیتے ہیں کہ اظہار و بیان میں موضوعاتی واسلوبیاتی سطح پر غیر متوقع صورت حال اور اجنبی پن ہونا چاہیے یہی وجہ ہے کہ حلقہ ارباب ذوق نے ادب کو سیاسی اور اخلاقی آمریت سے نہ صرف بچایا بلکہ ادبا و شعرا کو ان غیر ادبی گروہوں سے نجات دلائی جو قاری کی عام انسانی کمزرویوں سے فائدہ اٹھا کر اسے اپنے مخصوص سیاسی نظریات کا غلام بنانا چاہتے تھے۔حلقہ والوں کی یہی خوبیاں انھیں ترقی پسندوں اور پرانے روایتی انداز سے الگ کرتی ہیں۔حلقۂ ارباب ذوق کے شعرا کے توسط سے ان قدروں کی معنویت کی جانب لوگوں کی توجہ مرکوز ہوئی جن کی صداقت دائمی نوعیت کی تھی ۔طے شدہ شعری موضوعات سے گریز کرنے کی ہدایت اور تخلیقی آزادی کے چلن کو عام کرنے کا مظاہرہ کیا گیا اور حلقۂ ارباب ذوق کے کارکنان نے جذبہ وخیال اور احساس کے مکمل امتزاج کو اپنے تخلیقی رویوں کے توسط سے پیش کیا۔یعنی موضوعات سے زیادہ فنی لوازمات پر توجہ صرف کی جانے لگی۔انور سدید لکھتے ہیں کہ ’’اس دور میں جس بحث نے سب سے زیادہ اہمیت حاصل کی وہ ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کی بحث تھی اور بڑے مسئلے کے جلو میں جن متعدد مباحث نے سر اٹھایا ان میں ادب اور جمالیات، اظہار یا ابلاغ جذبہ اور خیال کی اہمیت، ادب اور صحافت، ادب اور پروپیگنڈہ، جبلت مرگ،شاعری میں ابہام کا مسئلہ جدید شاعری اور نفسیات وغیرہ کو اہمیت حاصل ہے یہ سب مباحث بظاہر نفسیاتی نوعیت کے ہیں اور ان میں سے بیشتر کا روئے سخن ترقی پسند تحریک کی طرف ہی تھا تاہم اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ حلقے نے ان مباحث سے تنقید کے جدید اصولوں کی توضیح واشاعت کی اور ایک نئے شعور کو جنم دینے کی معنی خیز خدمت انجام دی۔اس کا بالواسطہ نتیجہ یہ ہوا کہ نئے شعور کے اثرات تخلیقات میں بھی جلوہ گر ہونے لگے اور نہ صرف شاعری نے ترقی کی بلکہ صنفِ افسانہ میں بھی واضح تبدیلی کے آثار پیدا ہوئے۔‘‘

جب ہم مغرب کی تحریکات ورجحانات بالخصوص سریلیزم، وجودیت اور علامت نگاری کے حوالے سے ترقی پسندوں کی بات کرتے ہیں تو ہمیں ان تحریکات و رجحانات کے اثرات ترقی پسندوں پر نظر نہیں آتے جو حلقۂ ارباب ذوق کے شعرا و ادبا پر دکھائی دیتے ہیں یعنی حلقۂ ارباب ذوق کے شعرا و ادبا نے نئے آفاق کی وحدتوں کی تلاش وجستجو کی ، انسان کے باطن میں اتر کر اس کا جائزہ لیا پھر ان تجربات و مشاہدات کو نظم کے قالب میں ڈھال کر عوام کے سامنے پیش کیا اور بہت کم مدت میں قیوم نظر، میرا جی، مختار صدیقی ،منیب الرحمن، مجید امجد اور ضیا جالندھری وغیرہ نے اردو ادب کو ایسی تخلیقات عطا کیں جن میں زندگی کا شاید ہی کوئی ایسا گوشہ بچ گیا ہو جس پر ان لوگوں کی توجہ مرکوز نہ ہوئی ہو اور وہ لوگ اپنی تخلیقات کا موضوع بنانے سے

قاصر رہے ہوں۔ن۔م راشد حلقہ کے شعرا و ادبا کے متعلق اپنے خیال کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں ’’یہ وہ اہل قلم ہیں جنھوں نے اپنی بساط کے مطابق زندگی کو اس کی تمام وسعتوں سے دیکھنے کی کوشش کی اور جن کی تحریروں میں زندگی کی وسعت ، جامعیت اور تنوع کا شاندار پرتو ملتا ہے اس لیے یہی وہ ادیب وشاعر ہیں جنھیں صحیح معنوں میں جدید کہا جاسکتا ہے۔یوں نہیں کہ ان سب نے مل کر کسی سازش کے تحت جدیدیت کی بنیاد رکھی ہو بلکہ یہ سب الگ الگ ان غیر ادبی تعصّبات سے طبعاً آزاد تھے جو گزشتہ نسل کے شاعروں اور ادیبوں کے ذہنوں پر چھائے ہوئے تھے اور جس سے آج بھی ہمارے بظاہر ترقی پسند اور بہ باطن اشتراکیت پسند ادیبوں کے ذہن آئے ہوئے ہیں۔‘‘

راشد صاحب کے اس اقتباس سے یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ حلقۂ ارباب ذوق کے ادیبوں اور شاعروں نے انفرادیت اور وجودیت پر اس لیے زور صرف کیا کہ ان کا لگاؤ انسانی آزادی اور سماجی انصاف پر تھا کیوں کہ جب تک کسی شخص کا باطن اس پر آشکار نہ ہو تب تک وہ مادیت پرستی کا شکار رہتا ہے لیکن جیسے ہی اس کا باطن اس پر کھل جاتا ہے ویسے ہی وہ عرفان حیات حاصل کر لیتا ہے اور اس کی طرز زندگی صداقت، اصلیت اور حقیقت پر مبنی ہو جاتی ہے اور اس کی تخلیقی خارجیت سطحیت اور مصنوعیت سے پاک ہوتی ہوئی ابدیت کے درجے پر پہنچ جاتی ہے۔اس ضمن میں ڈاکٹر زرینہ زریں لکھتی ہیں ’’حلقۂ ارباب ذوق کی تحریک نے ادب کی تخلیق میں زندگی کی خارجی عنایتوں کی نفی نہیں کی بلکہ انھیں داخلی احساسات میں جذب کر کے اپنے دل وجگر کا خون پلا کر، اپنے اندر کے پل صراط سے اس طرح گزارا کہ ان کے اندر سچائی بیان کرنے کی بھر پور صلاحیت پیدا ہوگئی۔اس تحریک کی داخلی خاصیت اور وسیع القلمی نے شعرا و ادبا کو متاثر کیا۔۔۔حلقۂ ارباب ذوق کی خاصیت یہ ہے کہ اس کے زیر اثر لکھنے والوں نے مغربی علوم وفنون میں رونما ہونے والی بیشتر تحریکوں کے اثرات قبول کیے اور اردو ادب میں تنوع ،توانائی اور رعنائی پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کی۔حلقہ نے تاثریت ، علامت نگاری وجودیت اور سریلیزم کی تحریکوں کو اردو ادب میں روشناس کرایا اور ساتھ ساتھ فروغ دینے کی کوشش کرتے رہے۔حلقہ کے احباب نے جو تخلیقات پیش کیں ان میں تمام مذکورہ تحریکات کے عناصر موجود ہیں۔اس طرح صرف اردو شاعری میں ہی نہیں بلکہ افسانہ کی صنف میں بھی نمایاں تبدیلی ہوئی ،ان تحریکات کے زیر اثر حلقہ کے شاعروں اور ادیبوں نے اپنی ہم عصر ادبی تحریک (ترقی پسند تحریک) کے برخلاف خارج سے داخل کی جانب رجوع کیا۔مادیت پرستی اور مشین کی غلامی سے نکل کر اپنے اندر کی دنیا کو تلاش کرنے کی کاوش کی ، اپنے باطن میں خود اپنی ذات کی تلاش نے ان کو وہ نشاط انگیز سکون عطا کیا جس نے ان کی روح میں قوس قزح کی رنگینی بکھیر دی۔اسی دور میں حلقۂ ارباب ذوق کے شعرا نے پوری خود

اعتمادی کے ساتھ روایتی شعری اصناف سے انحراف کر کے اردو ادب کو آزاد نظم اور نظم معری سے آشنا کرایا۔‘‘

درج بالا اقتباس کی روشنی میں یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ حلقے والے نہ تو منضبط زاویۂ نظر کے قائل تھے اور نہ موضوعات کے پابند بلکہ ان لوگوں نے ایک ایسے معاشرے کا خواب دیکھا جو ہر قسم کے نظریاتی جور و جبر سے آزاد ہو۔ ڈاکٹر زرینہ زریں نے درست لکھا ہے کہ ’’جس زمانے میں حلقۂ ارباب ذوق کی شاعری کا آغاز ہوا اس سے قبل ہی اردو نظم کو مقصدیت کے حصول کا اہم ذریعہ بنانے کا عمل شروع ہو گیا تھا۔ آزاد اور حالی کے بعد ان کے پیروؤں نے بھی مقصدی شاعری کو فروغ دینے کا کام انجام دیا جن میں اقبال سرفہرست ہیں۔ اقبال کے یہاں جو گھن گرج اور لہجے کا رعب تھا اس کی تقلید ترقی پسند شعرا نے کلی طور پر کی۔ جب کہ حلقہ سے وابستہ شعرا کا انداز بیان ان سے مختلف تھا۔ ترقی پسند تحریک نے موضوع کو مقصد کا اسیر بنا دیا تھا اور حقیقت نگاری کو اشتراکیت کا جامہ پہنا کر پیش کرنے کا طریقہ اختیار کیا تھا۔ ایسے دور میں حلقۂ ارباب ذوق کے شعرا کا نمایاں رجحان یہ تھا کہ اردو نظم کو مقصدیت کا شکار ہونے سے بچایا جائے۔ حلقۂ ارباب ذوق سے وابستہ شعرا نے اندرونی دنیا اور بیرونی دنیا میں توازن، آہنگ اور ربط بڑے ہی فن کارانہ انداز میں پیدا کر کے اردو ادب میں ایک نیا تجربہ پیش کیا جس کی کڑی کلاسیکی شاعری سے جا ملتی ہے۔ حلقۂ ارباب ذوق کے شعرا نے ماضی کے روایتی خزینے سے قطعی طور پر انحراف نہیں کیا بلکہ صدیوں پرانی روایات اور رسوم کو وراثت کا بہتری سرمایا سمجھ کر اپنانے کی سعی کی اور اسے مزید تقویت پہنچائی۔ حلقے سے وابستہ شعرا مقصدیت کے اسیر نہیں رہے۔ اپنے باطن میں پھوٹتے ہوئے جذباتی آبشار کی مترنم موجوں سے گزر کر انھیں نظم کے سانچے میں اس طرح ڈھالا کہ الفاظ انفرادی محسوسات کا مرقع بن گئے۔‘‘

حلقۂ ارباب ذوق کے شعرا و ادبا میں سب سے فعال، متحرک، دانشور، دور بین، دور اندیش، زیرک اور تخلیقی اعتبار سے باکمال شخصیت میرا جی کی تھی، کیوں کہ ان کی شخصیت اپنے پورے وجود کے ساتھ ان کی تحریروں میں نمایاں ہے۔ انھوں نے اپنے خواب و خیال کو حقائق کی روشنی میں پیش کیا ہے۔ علامتوں، استعاروں، تشبیہوں اور اشاروں کے ذریعے اپنے خوابوں کو بیدار کیا۔ انھوں نے اردو نظم میں داخلیت اور انسانی اندرونی کیفیات کی جو پاس داری کی تھی وہ اس قدر مقبول ہوئی کہ حلقہ کے شعرا کے علاوہ دوسرے شعرا نے بھی میرا جی کے شعری رویے کی نہ صرف ترویج کی بلکہ اپنی تخلیقات کے ذریعہ اس روایت کو فروغ دیا۔ ان شعرا میں امجد اور اختر الایمان کا نام خاص طور سے لیا جا سکتا ہے کیوں کہ ان لوگوں کی تخلیقات میں میرا جی کے اسلوب کی جھلکیوں کو واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ نمونے کے طور پر اختر الایمان کی نظم ’یادیں‘، ’بلاوا‘ اور ’اجنبی‘ کو دیکھا جا سکتا ہے۔ میرا جی کے متعلق وزیر آغا کی یہ رائے بہت عمدہ ہے کہ ’’جدید اردو نظم

میں فراز سے نشیب کی طرف لڑھکنے کا آغاز میرا جی سے ہوتا ہے لیکن اس نے اپنی مدامی قوت کی مدد سے تحفظ ذات کی کوشش بھی کی ہے جس کے نتیجے میں تصادم اور آویزش کے متعدد پہلو اس کی نظم سے ابھرتے چلے گئے ہیں۔ بڑی بات یہ ہے کہ میرا جی سے اردو نظم کی ایک نئی جہت کا آغاز ہوتا ہے۔ جہت کسی روشن سحر یا درخشاں منزل کے نشانات کو ظاہر نہیں کرتی، وہ صرف وقت گزاری کا احساس دلا کر فنا اور موت کی حقیقت کو نظر کے سامنے لاتی ہے۔ خود انسانی زندگی میں امید اور رجائیت کا درد بے حد مختصر اور باطن کی ایک معمولی جست کا غماز ہے۔ شاعر کا باطن پوری طرح اس وقت ابھرتا ہے جب اسے کسی بحران کا سامنا ہو اور خود شاعر کی بقا معرض خطر میں پڑ جائے۔‘‘

درج بالا رائے سے یہ بات پوری طرح منکشف ہو جاتی ہے کہ میرا جی کی نظم کی جہت باہر سے اندر کی طرف ہے اور یہی جہت ان کی شاعری کی بنیاد ہے کیوں کہ اس جہت کا طریقۂ کار باطن کی دنیا پر زیادہ زور دیتا ہے کیوں کہ شاعر ہمارے سماج کا ہی ایک فرد ہوتا ہے لیکن وہ دیگر کی بہ نسبت زیادہ حساس، دور بیں اور چالاک ہوتا ہے، اس کا باطن اپنے خصوصی احوال و کوائف کی بنا پر دوسروں سے مختلف ہوتا ہے چنانچہ جب بھی باطن سے نظم کا عمل وجود میں آتا ہے تو اس نظم کا ذائقہ دوسرے شعرا کی نظم سے مختلف ہوا کرتا ہے گو یہ کہ اگر باطن کی انفرادیت نہ ہوتی تو تمام شعرا کے کلام ایک جیسے ہوا کرتے اور ان میں کوئی تفاوت نہ ہوتا، گو یہ کہ میرا جی کی نظموں میں داخلیت کی پر اسرار دنیا آباد ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر زرینہ زریں لکھتی ہیں کہ ’’میرا جی حلقۂ ارباب ذوق کی تحریک اور جدید اردو نظم کے سب سے زیرک، باکمال اور تخلیقی اعتبار سے مخلص شاعر تھے۔ انھوں نے غیر ملکی شعرا کے مطالعے اور مغربی ادب کے تراجم کے ذریعہ جدید شاعری کے اصول مرتب کیے اور حلقہ ارباب ذوق کے شعرا کی ادبی تربیت اسی مناسبت سے کی تاکہ وہ ان اصول و نظریات کو حسن و خوبی کے ساتھ اپنی شاعری میں پیش کر سکیں۔ اس طرح حلقۂ ارباب ذوق کے زیر اثر جو شاعری ہوئی اس میں بھر پور داخلیت کا رجحان پیدا ہو گیا۔ انھوں نے اس دور کی مروجہ روایات سے بغاوت کر کے نظم نگاری کو ایسی صورت عطا کی جو اس دور تک تخلیق کی جانے والی شاعری کے اسلوب، تجربہ، علامت، ہیئت، لفظیات اور موضوعات کے اعتبار سے بالکل نئی اور الگ تھی۔ انہی وجوہات کے باعث میرا جی نظمیہ شاعری کے پیش رو مانے جاتے ہیں۔‘‘

میرا جی کے متعلق یہ بات دلچسپ بھی ہے اور عجیب و غریب بھی، کیوں کہ میرا جی پر جو الزامات عائد کیے گئے ہیں وہ بے بنیاد ہیں۔ ان کے تئیں ایک جانب یہ بات کہی جاتی ہے کہ ان کی نظموں میں ابہام انتہا کو پہنچا ہوا ہے جس بنا پر ان کی نظموں کے معانی و مفاہیم تک رسائی دشوار ہے اور دوسری جانب اس بات

کو دہرایا جاتا ہے کہ میرا جی جنس زدہ، مریض، فراری، شکست خوردہ ذہنیت کا مالک، انفرادیت پسند، غیر سماجی، تماشی اور عریانیت کا ایک نمونہ ہے جو میری سمجھ سے بالاتر ہے کہ جب لوگوں کی پہنچ میرا جی کی نظموں کے معانی ومفاہیم تک نہیں ہو پائی تو بھلا کیسے موخرالذکر خصوصیات سے میرا جی کو وابستہ کر دیا گیا۔اس بات کو میں اپنے مطالعہ کے بنیاد پر بلا تامل کہہ سکتا ہوں کہ ایک عرصہ تک میرا جی کے قارئین اور ناقدین ان کی نظموں کی تہ تک پہنچنے سے قاصر رہے جس کی ایک بڑی وجہ میرا جی کی نظموں کی نئی تکنیک تھی، اس بات کو یہاں واضح کر دینا مناسب ہوگا کہ میرا جی نے نہ صرف فرائڈ کے تصور تحلیل نفسی، بودلیر اور ملارمے سے استفادہ کیا بلکہ ہندوستان کی مختلف زبانوں اور اردو، ہندی، سنسکرت کے نامور شعرا سے بھی اثر قبول کیا اور ان سب اثرات کی ترکیب اور امتزاج سے اپنے لب و لہجے اور آہنگ کی تشکیل کی۔اس کے باوجود بھی میرا جی کو اپنے زمانے کا باغی شاعر کہا گیا ہے۔لیکن میں جہاں تک سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ بغاوت ایک تخریبی اور منفی عمل ہے جس کی جڑیں بڑی کمزور ہوتی ہیں جب کہ اجتہاد ایک مثبت عمل ہے جو ماضی، حال اور مستقبل کے تسلسل کو قائم رکھتا ہے اور اسے متحرک اور نامیاتی بناتا ہے۔اس تعلق سے ڈاکٹر زرینہ زریں نے لکھا ہے کہ ”میرا جی نے ودیاپتی، چنڈی داس، امارو، اور کئی دوسرے میتھلی، بنگالی اور سنسکرت شعرا کا مطالعہ نہایت گہرائی کے ساتھ کیا تھا۔ان شعرا میں ودیاپتی وشنومت کے حامی تھے جس میں مذہب اور جنس کو لازم وملزوم تصور کیا جاتا ہے۔میرا جی فرائڈ کے تصور تحلیل نفسی سے متاثر تھے اور لاشعور کو انسانی عمل کا طاقت ور محرک گردانتے تھے۔میرا جی کے نزدیک جنسی ناآسودگی اور جذباتی پیچیدگیوں کا حل ضبط نفس نہیں تھا بلکہ وہ اس اظہار کو ہی ان پیچیدگیوں سے نجات کا ذریعہ تصور کرتے تھے کیوں کہ وہ خواہشات اور محرومیوں کا اظہار نہایت ضروری سمجھتے تھے۔انہی افکار کی ترسیل کے لیے میرا جی نے آزاد نظم کو اظہار کا ذریعہ بنایا اور اس ہیئت کی آزادی اور لچک سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسالیب کے کئی ایسے تجربے کیے جو آزاد نظم میں ہی ممکن تھے۔“

غرض یہ کہ میرا جی کا رجحان قدامت سے جدیدیت کی جانب تھا اور جب ہم ان کی شاعری کا موضوعاتی اعتبار سے جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں ان کی شاعری میں مختلف انواع واقسام کے موضوعات ملتے ہیں جو ان کی ایک بڑی خوبی ہے اور یہی خوبی ان کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔ان کی شاعری میں حد درجہ تنوع نظر آتا ہے۔شعبۂ حیات کا شاید ہی کوئی ایسا گوشہ ہوگا جس پر ان کی نظر نہ گئی ہو۔معاملات حسن وعشق کے علاوہ اس دور کے سیاسی، سماجی ومعاشرتی حالات نے بھی ان کی شاعری میں وافر حصہ پایا ہے یعنی کہیں وہ عشق کے نغمہ خواں ہیں تو کہیں مسائل حیات کے نباض۔

☆☆☆

ڈاکٹر نور اشرف
وزیٹنگ فیکلٹی مولانا مظہر الحق عربی وفارسی یونیورسٹی، پٹنہ۔رابطہ نمبر:9560421732

شیخ عبدالرحمٰن چشتی اور تذکرہ مرآۃ مسعودی

تلخیص:

سید سالار مسعود غازی حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ تعالیٰ وجہ الکریم کے صاحبزادے حضرت امام محمد بن حنفیہ رضی اللہ عنہ کی نسل سے ہیں۔آپ کی پیدائش ۲۱رجب ۴۰۵ھ بمطابق ۱۰۱۵ء میں اجمیر شریف میں ہوئی۔آپ کے والد کا نام سید سالار شاہو غازی اور والدہ کا نام ستر معلیٰ تھا جو سلطان محمود غزنوی کی بہن تھیں۔

مرآۃ مسعودی سید مسعود سالار غازی کا تذکرہ ہے جسے شیخ عبدالرحمن چشتی نے تصنیف کیا ہے۔یہ تذکرہ ۱۶۲۰ء میں لکھا گیا۔صاحب کتاب نے اس کتاب میں سید سالار مسعود غازی کی حیات و مجاہدانہ کارنامے کے ساتھ ساتھ واقعات شہادت کو بہت ہی خوب صورت انداز میں پیش کیا ہے۔

اسلامی نظریات میں ایک مجاہد کا بنیادی مقصد تبلیغ دین ہے اور اس میں کوشش کرتے کرتے اپنی جان عزیز کو قربان کر دینا اور مرتبۂ شہادت پر فائز ہونا۔اس کا مقصد جہاد اور معراج زندگی ہے، حضور سلطان الشہدا سید سالار مسعود غازی نے فریضۂ تبلیغ کو اپنے رفقا کی مدد سے جس خوبی کے ساتھ ادا کیا اس کی مثال دنیا کے مجاہدین میں کم ملتی ہے۔غزنی سے لے کر بہرائچ تک کتنے مواقع ملے جہاں آپ فرماں روائی فرما سکتے تھے مگر جس کا مقصد صرف اور صرف تبلیغ دین ہو اس کو فرماں روائی سے کیا سروکار۔آپ اپنے مشن کو بڑھاتے گئے اور اس خوبی کے ساتھ اسلامی تعلیمات کو دلوں میں اتارتے گئے کہ افراد تو افراد رہے قوموں کی قومیں آپ کے دست حق پرست پر مشرف بہ اسلام ہوتی رہیں۔

مرآۃ مسعودی پانچ داستان پر مشتمل ہیں۔اس کی داستان بالترتیب مندرجہ ذیل ہیں:

داستان اول: سلطان محمود غزنوی کے حکم پر سالار شاہو پہلوان لشکر کا مظفر خان کی امداد کے لیے غزنی

سے اجمیر آنا اور غازی پاک کی ولادت۔

داستان دوم: سالار شاہو اور سلطان الشہدا کا اجمیر سے غزنی آنا اور حسن میمندی کا بت سومنات کے سلسلہ میں سلطان الشہدا سے عناد کرنا۔

داستان سوم: سلطان محمود غزنوی سے سلطان الشہدا کا رخصت ہو کر ہندوستان کی جانب متوجہ ہونا ملتان سے دہلی آکر اسے فتح کرنا۔ پھر دریائے گنگا پار کر کے سترکھ میں قیام کرنا، وہاں سے اطراف و اکناف کے لیے فوجی دستے متعین کرنا۔

داستان چہارم: سالار شاہو کا سترکھ پہنچنا سلطان الشہدا کا بہرائچ کی طرف متوجہ ہونا، سترکھ میں سالار شاہو کی وفات، سلطان الشہدا کا حربی کافروں سے جہاد اور جام شہادت نوش کرنا۔

داستان پنجم: شہادت کے بعد سلطان الشہدا کی کرامتوں کا ظہور، روضۂ منورۂ مطہرہ کی تعمیر، محبوب رب العالمین سلطان الشہدا کے بعض احوال کرامات۔ زیر نظر مضمون میں ان نکات پر تفصیلی بحث کی جائے گی۔

کلیدی الفاظ:

شیخ عبدالرحمن چشتی، سید سالار شاہو، مرآۃ مسعودی، سید سالار مسعود غازی، محمود غزنوی، داستان اول، داستان دوم، داستان سوم، داستان چہارم، داستان پنجم۔

ہندوستان کے مسلمانوں پر صوفیہ کرام اور بزرگان دین کا بہت بڑا احسان ہے کہ انھوں نے پورے ہندوستان کو جو ابتدائے آفرینش سے شرک کی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا ایمان و اسلام کی روشنی سے روشناس کرایا۔ اپنی ولایت کی قوت سے نور وحدانیت کو منور کیا۔ کسی بزرگ نے کیا خوب کہا ہے۔

ہمہ غافل از حکم دین و شریعت ہمہ بی خبر از خدا و پیمبر
نہ ہرگز کسی دید ہنجار قبلہ نہ ہرگز شنیدہ کس اللہ اکبر

شیخ عبدالرحمٰن چشتی: مرآۃ مسعودی کے مصنف کا نام شیخ عبدالرحمٰن چشتی ہے۔ وہ ہندوستان میں چشتیہ سلسلہ کے بانیوں میں سے ہیں۔ آپ سلسلۂ عالیہ چشتیہ صابریہ سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کے والد عبدالرسول بن قاسم بن شاہ بدھا اکبر بادشاہ کے زمانے میں امیٹھی ڈونگر سے نقل مکانی کر کے موضع رسول پور عرف دھنتی پرگنہ لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی۔ آپ کی ولادت ۱۵۹۶ء میں ہوئی اور وہیں ۱۶۸۳ء کو دنیا سے رخصت ہو گئے۔ [۱] آپ مغلیہ خاندان کے بادشاہ جہاں گیر اور شاہجہاں کے ہم عصر تھے۔ شہنشاہ

اورنگ زیب کے ایام آپ نے دیکھے ہیں۔ نسباً آپ قریشی ہاشمی علوی تھے اور آپ کے آبا واجداد کا شمار مشائخ کبار میں ہوتا ہے۔ آپ کی بیعت شیخ حمید سے تھی جو حضرت شاہ عبدالحق ردولوی قدس سرہٗ کے خاندان میں مشہور بزرگ گزرے ہیں۔ [۲] آپ شاہان مغلیہ کے معاملات کی دیکھ بھال اور حفاظت سلطنت اسلامی پر بھی مامور تھے۔ ظاہری طور پر آپ کو جہاں گیر اور شاہجہاں کے دربار میں آنے جانے کے مواقع حاصل تھے اور اکثر مجالس میں آپ کی شرکت رہتی تھی۔ [۳] جہاں گیر سات سال تک ولایت مالوہ و گجرات کی سیر کر کے پھر اجمیر شریف گیا اور زیارت خواجہ بزرگ سے مشرب ہوا۔ وہاں سے اکبر آباد (آگرہ) آیا۔ ان ایام میں شیخ عبدالرحمن چشتی بھی کسی تقریب کے سلسلہ میں جہاں گیر کے ساتھ تھے۔ اس زمانے میں عارف کامل میر سید نعمت اللہ قادری اور مخدوم شیخ عثمان بھی اس تقریب کے سلسلہ میں اکبر آباد آئے ہوئے تھے۔ شیخ عبدالرحمن چشتی اور میر سید نعمت اللہ ایک سال تک روزانہ مخدوم شیخ عثمان کی خدمت میں حاضر ہو کر فیض یاب ہوتے رہے۔

صاحب مرآۃ الاسرار (شیخ عبدالرحمٰن چشتی) کہتے ہے کی چار سال کی عمر میں میرے والد مجھے حضرت شیخ محمد بن بندگی شیخ نظام الدین امیٹھی قدس سرہ کی خدمت میں لے گئے۔ حضرت نے تبرکاً یہ آیت تعلیم فرمائی۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ الرحمن علم القرآن، جس کا اثر اب تک میں اپنے اندر محسوس کرتا ہوں۔ چند سال امر و نہی پڑھا اور چند سال والد کے ہمراہ علم معاش، سپاہ گری اور آداب سلطنت سیکھے اور کچھ دنیاوی عیش میں زندگی بسر کی۔ انیس سال کی عمر میں حق تعالی نے عشق مجازی کے ذریعہ میرے قلب میں طلب صادق پیدا کر دی، میرا دل حظوظ نفس سے پاک ہو گیا۔ یہ نورالدین جہاں گیر کا زمانہ تھا۔

چار پانچ برس امیروں کے لباس میں ریاضات شاقہ کرتا رہا اور ہر سلسلہ کے مشاغل پر عمل کرتا رہا، جس سے کافی تصرفات حاصل ہوئے۔ اس اثنا میں خلق سے میل جول بھی جاری رہا حتی کہ میرے باطن میں صوفیائے اہل صفا کے مشرب کی استقامت یعنی کثرت میں شہود احدیت حاصل ہو گیا اور عشق حقیقی کا بے حد غلبہ پیدا ہوا۔ اس وقت تمام علائق دنیا کو چھوڑ کر فقیر کا لباس اختیار کیا اور گوشۂ تجرید میں بیٹھ گیا۔ سات سال اور چند ماہ تک خواجگان چشت قدس اسرارہم کی متابعت میں سلوک طے کرتا رہا اور بقدر استطاعت قسم قسم کے مجاہدات میں مشغول رہا۔ حتی کہ رنج راحت میں اور مجاہدہ مشاہدہ میں مبدل ہو گیا۔ رجب ۱۰۳۲ھ میں میں نے اوراد چشتیہ جمع کیے جن سے ہر دوست بقدر استعداد فائدہ اٹھاتا ہے اور کئی سال سے بحکم الہام سب امور سرانجام دے رہا ہوں۔ دعا ہے کہ حق تعالی خاتمہ بالخیر کرے۔ اپنے متعلق یہ چند کلمات اس لیے لکھے کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ 'اما بنعمت ربک فحدث' (حق تعالی کی نعمت کا اظہار کرو) یہ حروف

۱۰۵۰ھ میں شہاب الدین محمد شاہجہاں کے عہد میں لکھے گئے۔[۴]

اگر گیتی سراسر بادگیرد
چراغ مقبلان ہرگز نمیرد

شیخ عبدالرحمن چشتی کی دیگر تصنیفات مندرجہ ذیل ہیں:

''مرآۃ مداری، مرآۃ الاسرار، مرآۃ الحقایق، مرآۃ المخلوقات، اوراد چشتیہ ونفس رحمانی۔''[۵]

اس مقالہ میں تذکرہ مرآۃ مسعودی کا ایک اجمالی خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مرآۃ مسعودی سید سالار مسعود غازی کا تذکرہ ہے جس کی تالیف شیخ عبدالرحمن چشتی نے کی۔ وہ ہندوستان میں چشتیہ سلسلہ کے بانیوں میں سے ہیں اور عہد جہاں گیر اور شاہجہاں سے تعلق رکھتے ہیں۔

مرآۃ مسعودی: مرآۃ مسعودی سید مسعود سالار غازی کا تذکرہ ہے جسے شیخ عبدالرحمن چشتی نے تصنیف کیا ہے۔ یہ تذکرہ ۱۶۲۰ء میں لکھا گیا۔ صاحب کتاب نے اس کتاب میں سید سالار مسعود غازی کی حیات ومجاہدانہ کارنامے کے ساتھ ساتھ واقعات شہادت کو بہت ہی خوب صورت انداز میں پیش کیا ہے۔ اسلامی نظریات میں ایک مجاہد کا بنیادی مقصد تبلیغ دین ہے اور اس میں کوشش کرتے کرتے اپنی جان عزیز کو قربان کر دینا اور مرتبۂ شہادت پر فائز ہونا۔ اس کا مقصد جہاد اور معراج زندگی ہے، حضور سلطان الشہدا سید سالار مسعود غازی نے فریضۂ تبلیغ کو اپنے رفقا کی مدد سے جس خوبی کے ساتھ ادا کیا اس کی مثال دنیا کے مجاہدین میں کم ملتی ہے۔ غزنی سے لے کر بہرائچ تک کتنے مواقع ملے جہاں آپ فرماں روائی فرما سکتے تھے مگر جس کا مقصد صرف اور صرف تبلیغ دین ہو اس کو فرماں روائی سے کیا سروکار۔ آپ اپنے مشن کو بڑھاتے گئے اور اس خوبی کے ساتھ اسلامی تعلیمات کو دلوں میں اتارتے گئے کہ افراد تو افراد رہے قوموں کی قومیں آپ کے دست حق پرست پر مشرف بہ اسلام ہوتی رہیں۔

شیخ عبدالرحمن چشتی نے مرآۃ مسعودی کی تالیف کے لیے ان تذکرہ کی کتابوں سے حوالہ پیش کیا ہے: روضۃ الصفا، نفحات الانس، سکندر نامہ، منتخب التواریخ، طبقات ناصری وغیرہ۔ تذکرہ مرآۃ مسعودی پانچ داستان پر مشتمل ہیں۔ اس کی داستان بالترتیب مندرجہ ذیل ہیں:

داستان اول: سلطان محمود غزنوی کے حکم پر سالار شاہو پہلوان لشکر کا مظفر خان کی امداد کے لیے غزنی سے اجمیر آنا اور غازی پاک کی ولادت۔

داستان دوم: سالار شاہو اور سلطان الشہدا کا اجمیر سے غزنی آنا اور حسن میمندی کا بت سومنات کے سلسلہ میں سلطان الشہدا سے عناد کرنا۔

داستان سوم: سلطان محمود غزنوی سے سلطان الشہدا کا رخصت ہوکر ہندوستان کی جانب متوجہ ہونا ملتان سے دہلی آکر اسے فتح کرنا۔ پھر دریائے گنگا پار کر کے سترکھ میں قیام کرنا، وہاں سے اطراف واکناف کے لیے فوجی دستے متعین کرنا۔

داستان چہارم: سالار شاہو کا سترکھ پہنچنا سلطان الشہدا کا بہرائچ کی طرف متوجہ ہونا، سترکھ میں سالار شاہو کی وفات، سلطان الشہدا کا حربی کافروں سے جہاد اور جام شہادت نوش کرنا۔

داستان پنجم: شہادت کے بعد سلطان الشہدا کی کرامتوں کا ظہور، روضۂ منورۂ مطہرہ کی تعمیر، محبوب رب العالمین سلطان الشہدا کے بعض احوال کرامات۔[۶]

شیخ عبدالرحمٰن چشتی نے تذکرہ مرآۃ مسعودی کا آغاز اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا اور رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اطاعت سے کیا ہے اور ذکر کے ساتھ ساتھ بیان کرتے ہیں کہ تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو سارے جہان کا پالنہار ہے جو ہر غائب اور حاضر کو جاننے والا ہے اور وہی ہر چیز کو اپنے احاطے میں لیے ہوئے ہے اور ہم نے آپ (نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کو سارے جہان کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے اور درود وسلام نازل ہو آپ کی آل اور آپ کے اصحاب پر۔ شہدائے کرام کے صفات بیان کرتے ہوئے صاحب مرآۃ مسعودی نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں جو قتل کیے گئے ہیں ان کا مرتبہ بہت بلند ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک مرتبۂ شہادت سے بڑھ کر کوئی مرتبہ نہیں، اس وجہ سے اس مخصوص نعمت کو خاص طور سے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اہل بیت کے لیے مقدر فرمایا تھا۔

سب سے پہلے رسولؐ کے محترم چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ جو تمام مبارزان جنگ کے سردار تھے اور شربت شہادت نوش فرما کر لازوال مرتبہ پر متمکن ہوئے۔ اس کے بعد اسد اللہ الغالب علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ الکریم جو شریعت وطریقت کے رہنما اور واصلان حقیقت کے امام ہیں، شربت شہادت چشیدہ دوست کے ساتھ ہم رنگ ہو گئے اور آج تک دونوں جہان کو یک رنگی کا فیض پہنچا رہے ہیں۔ اسد اللہ الغالب علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ الکریم کے نورنظر حسن وحسین رضی اللہ عنہما کے احوال اظہر من الشمس ہیں کہ انھوں نے اپنی شرین جان راہ حق میں قربان کردی اور جملہ ائمہ معصومین رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اپنے آباواجداد کے طریقہ پر چل کر جاں بحق تسلیم ہوئے۔

تاریخ روضۃ الشہدا میں اس کا مفصل بیان ہے کہ حضرت امام حسین کی شہادت کے بعد مختار ثقفی نے محمد بن حنفیہ غازی کی نیابت میں جو محنت ومشقت اور جانبازی دکھائی ہے وہ تمام عالم پر ظاہر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے محمد بن حنفیہ کی اولاد سے سید سالار مسعود غازی جیسا آفتاب لازوال پیدا فرمایا کہ تمام عالم اور جو

کچھ عالم میں ہے، اسی کے نور ولایت سے منور ہے۔

سید سالار مسعود غازی کو خرقۂ ارادت و خلافت اپنے باپ دادا سے پہنچا۔ آپ کی والدہ ستر معلّیٰ سلطان محمود بن سبکتگین کی بہن تھی، مصنف تاریخ جہاں آرا نے آپ کی والدہ محترمہ کا سلسلہ نسب یزدجرد شہریار بن خسرو بن ہرمز بن نوشیروان کسریٰ تک پہنچایا ہے اور صاحب روضۃ الشہداء نے کتاب کے آخر میں جس جگہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی اولاد کی تعداد دکھائی ہے وہیں سلطان محمود بن سبکتگین کو بھی حضرت امام حسن بن علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کی اولاد میں تحریر کیا ہے، دونوں حالتیں مقبول ہیں۔ آپ کی کرامات کے ثمرات آج تک اس طرح ظاہر ہو رہے ہیں کہ خواص و عوام آپ کی ولایت پر ایمان لا رہے ہیں۔ جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کیے گئے انھیں مردہ مت کہو بلکہ وہ زندہ ہیں۔

اس کے بعد حقیر فقیر عبدالرحمن چشتی جو محبوب رب العالمین اور دنیا و دین کو فیض پہنچانے والے مردان اہل یقین کے سردار ہیں اللہ تعالیٰ کے کمترین معتقدین میں سے ہے، عرض کرتا ہے کہ یہ نامراد ابتدائے حال ہی سے حضرت سلطان الشہداء کے آستانۂ متبرکہ مطہرہ کی غلامی اور محبت کے حلقہ سے وابستہ رہا ہے، چوں کہ آپ کی پیدائش اور ملک ہندوستان میں آپ کی تشریف آوری کے احوال اور واقعۂ شہادت کو اکثر لوگوں نے مختلف طریقوں سے بیان کیا ہے۔ ایک پرانی تاریخی کتاب ملا محمد غزنوی کی تصنیف ملی۔ ملا مذکور سلطان محمود بن سبکتگین کے ملازم تھے لیکن عمر کا آخری حصہ سالار رشاہو اور سلطان الشہداء کی خدمت میں بسر کیا۔ سلطان الشہداء کی شہادت کے بعد رحمت حق سے ملے۔ چوں کہ کتاب بہت طویل تھی اور اکثر مقامات پر جہاں سلطان محمود غزنوی سالار رشاہو کی جنگوں کا حال لکھا گیا ہے جا بجا سلطان الشہداء کا بھی ذکر آیا ہے اور سلطان الشہداء سالار مسعود غازی کے واقعۂ شہادت پر کتاب ختم کر دی گئی ہے۔ اسی وجہ سے بعض محبین سلطان الشہداء کے متبرک آستانہ سے خاص عقیدت رکھتے تھے۔ الغرض سلطان الشہداء کے حالات تاریخ مذکور (تاریخ ملا محمد غزنوی) سے منتخب کر کے پانچ داستان میں ذکر کیا جائے گا۔[۷]

داستان اول:

سلطان محمود غزنوی کے حکم پر سالار رشاہو پہلوان لشکر کا مظفر خان کی امداد کے لیے غزنی سے اجمیر آنا اور غازی پاک کی ولادت۔ شیخ عبدالرحمن چشتی نے مرآۃ مسعودی کی داستان اول میں لکھا ہے کہ سلطان محمود غزنوی ملک زنگبار، ملک روم اور تمام ملک ایران اور توران اپنے قبضہ حکومت میں لا چکے اور سب جگہ شریعت محمدی جاری کر چکے جہاد فی سبیل اللہ کے حکم کے مطابق تخت سلطنت پر منتظر بیٹھے تھے کہ یکا یک چار

مرد شتر سوار الغیاث یعنی فریاد کرتے ہوئے ہندوستان کی طرف سے ظاہر ہوئے۔ دربار میں طلب کیے گئے، قدم بوسی کی رسم ادا کرنے کے بعد ان لوگوں نے معروضہ پیش کیا کہ مظفر خان ہرمز کا مصاحب تھا۔ جب سلطان ابوالحسن نے کثیر لشکر کے ساتھ ہاتھیوں پر سوار ہو کر ہرمز کو قتل کر دیا اور قریب تھا کہ مظفر خان کو مع زن وفرزند اور تمام لوگوں کو ہلاک کرے۔ ناچار مظفر خان مع تمام عزیزوں کے نکل کر صحرا کی طرف چلا گیا۔ اب چند سال سے اجمیر میں مقیم ہے۔ ان ایام میں رائے بھیروں ورائے سوم کرن مع چوالیس اور رایوں کے ہر طرف سے جمع ہو کر مظفر خاں پر حملہ آور ہیں، چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کو ہلاک کریں۔ ہر چہار جانب کفر ہی کفر ہے، عالم پناہ کی ذات کے علاوہ کوئی نظر نہیں آ رہا ہے کہ جو اہل اسلام کی از بہر خدا مدد کرے۔ سلطان نے فرمایا کہ اطمینان رکھو انشاءاللہ تعالیٰ میں مسلمانوں کی امداد کروں گا۔ خواجہ حسن میمندی نے جو سلطان کا وزیر تھا پوچھا کہ اس جگہ کس کا خطبہ پڑھتے ہیں۔ شتر سواروں نے جواب دیا اس وقت تک اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور حضور رسالت پناہؐ کی نعت کے بعد خلفائے راشدین کا نام خطبہ میں پڑھا جا رہا ہے، اب جب کہ سلطان امداد فرمائیں گے سلطان محمود غازی کا نام پڑھا جائے گا۔

سلطان نے اس بات سے خوش ہو کر خواجہ حسن کو حکم دیا کہ جلد ایک سردار تجویز کر کے لاؤ تا کہ اس کے ہمراہ لشکر متعین کر دوں۔ بہت زیادہ گفت و شنید کے بعد سالار رشاہو کو پہلوان لشکر کا سردار مقرر کیا گیا اور ستر ہزار جنگ آزمودہ سواروں کے ساتھ چند معتبر امرا کو سالار رشاہو کے ہمراہ دے کر رخصت کیا۔ لشکر قندھار سے اجمیر کے لیے روانہ ہوا۔ سلطان ان دنوں میں غزنی سے آ کر قندھار میں مقیم تھا اور چار شتر سوار جو مظفر خان کے پاس سے آئے تھے، سالار رشاہو ان کو رہبر بنا کر براہ ٹھٹھہ اجمیر کے لیے روانہ ہوئے۔ فوجی دستہ سے پیران اہل غیب نے پوچھا کی تمہارے لشکر کا سردار کون ہے؟ پیش رو فوجی دستہ کے لوگوں نے بتایا کہ سالار رشاہو نام ہے، پیران اہل غیب نے فرمایا کہ اس سفر میں تمہارے سپہ سالار کو کافروں پہ فتح نصیب ہوگی اور ایک فرزند نرینہ عطا ہوگا۔

پیش رو فوجی دستہ نے مفصل حال سالار رشاہو کی خدمت میں بیان کیا۔ ان کلمات روح افزا سے سالار رشاہو کو دوسرے عالم کا شوق و ذوق پیدا ہوا، الغرض بجانب اجمیر تین شب و روز کا راستہ رہ گیا تھا کہ مظفر خاں کو مطلع کرنے کے لیے ان شتر سواروں کو پہلے بھیج دیا اور خود ایک نہر کے کنارے قیام فرمایا، اسی روز حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات ہوئی۔ ان ایام میں اکثر رجال الغیب اس قسم کی بشارتیں سالار رشاہو کو دیا کرتے تھے، جیسا کہ تاریخ محمودی میں مفصل ذکر کیا گیا ہے۔ جب پہلوان لشکر کی تشریف آوری کی خبر مظفر خاں کو ملی وہ باغ باغ ہو گیا اور جو کفار اجمیر کے گرد و نواح میں محاصرہ کیے ہوئے بڑھ آئے تھے سبھی

نے بڑی خاموشی سے یک جا ہو کر جنگ کرنے کا فیصلہ کیا، کفار نے اجمیر کا محاصرہ چھوڑ کر سات فرسنگ کے فاصلہ پر کوہ کھوکھر کو سامنے رکھ کر ڈیرہ ڈال دیا۔ مظفر خان استقبال کر کے پہلوان لشکر کو اجمیر میں لایا اور التماس کیا کہ آپ قلعہ اجمیر میں نزول فرمائیں۔

سالار شاہو نے اس پیش کش کو قبول نہیں کیا کہ میں تمہاری امداد کے واسطے آیا ہوں اور سالار شاہو نے کفار کے عبادت خانہ میں قیام کیا۔ اسی جگہ خیمہ زن ہو گئے۔ چند روز آرام کر کے مظفر خاں کے مشورہ سے مقابلہ کے لیے سواروں کو بھیجا، کفار بھی فوجوں کو آراستہ کر کے مقابلہ میں آئے۔ تین روز تک میدان جنگ گرم رہا اور اس کے بعد فتح ہوئی۔ کفار میدان جنگ سے فرار ہو گئے۔ مسلمان جو دولت شہادت سے سرفراز ہوئے تھے انھیں دفن کر کے کفار کے تمام مال و اسباب اور غنائم لشکریوں میں تقسیم کر دیئے۔ دوسرے دن اجمیر کی طرف لوٹے اور قلعۂ اجمیر کے دروازہ پر مسجد تعمیر کرا کے سلطان محمود غازی کے نام کا خطبہ پڑھوایا ۔ کفار کی شکست اور اپنی فتح کی مبارک باد پیش کرتے ہوئے گزشتہ تمام حقیقت کی عرضداشت سلطان کی خدمت میں بھیج دی۔ الغرض سالار مسعود کی عرضداشت جب سلطان محمود کی خدمت میں پہنچی بہت خوش ہوا، خلعت خاص اور چند عراقی گھوڑے مرحمت فرمائے اور بہ کمال مہربانی فرمان جاری کیا۔

سید سالار مسعود غازی حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم کے صاحبزادے حضرت امام محمد بن حنفیہ رضی اللہ عنہ کی نسل سے ہیں۔ آپ کی پیدائش ۲۱ رجب ۴۰۵ھ بمطابق ۱۰۱۵ء میں اجمیر شریف میں ہوئی۔ آپ کے والد کا نام سید سالار شاہو غازی اور والدہ کا نام ستر معلیٰ تھا جو سلطان محمود غزنوی کی بہن تھیں۔ نور محمدی آپ کی پیشانی پر چمک رہا تھا، تین شبانہ روز اجمیر کے ہر گھر میں اور ہر کوچہ و بازار میں خوشی کا ماحول تھا۔ سالار شاہو پہلوان لشکر بے پناہ مسرت کی وجہ سے جو کچھ نقد و جنس اپنی بساط میں رکھتے تھے، فقیروں اور مسکینوں پر نچھاور کر دیا، تین دن تک کیا اہل دنیا، کیا اہل عقبیٰ ہر فرقہ کی جمعیت کے ساتھ مجلس جشن آراستہ رہی، چنانچہ تاریخ محمودی میں اس مقدمہ کو مفصل ذکر کیا گیا ہے۔

سید سالار مسعود غازی کی عمر چار سال چار ماہ چار دن کی ہوئی تو سالار شاہو حضرت میر سید ابراہیم کی خدمت میں لے گئے کہ بسم اللہ کرا دیں، سالار شاہو نے چند ہزار چاندی کے سکے، چار عراقی گھوڑے میر مذکور کی خدمت میں پیش کیے۔ دعوت میں قسم قسم کے کھانے تیار کرائے اور عطا و بخشش کے دروازے کھول دیئے۔ پیدائش کے وقت جو اہتمام کیا گیا تھا اس سے کہیں زیادہ رسم بسم اللہ خوانی کے موقع پر کیا گیا۔ حق تعالی نے سید سالار مسعود غازی کو علم لدنی عطا فرمایا تھا۔ جب آپ کی عمر نو سال کی ہوئی تو آپ اکثر علوم ظاہری اور باطنی سے آراستہ ہو گئے اور دس سال کی عمر میں عبادت و ریاضات میں اس طرح منہمک ہوئے

کہ راتیں شغل باطن میں گزرتیں اور جب تک ایک پہر دن نہ نکل آتا حجرۂ عبادت سے باہر نہ نکلتے۔ جس پر اہل یقین درویش حسرت کرتے تھے، نماز چاشت ادا کرنے کے بعد آپ حجرہ سے باہر نکلتے۔ عامل علما، کامل فقرا کے ساتھ صحبت رکھتے تھے۔

سید سالار مسعود غازی کا ظاہر اور باطن یکساں تھا آپ کا قلب ذکر الٰہی کی وجہ سے صاف اور معصیت سے پاک تھا۔ ظاہری صفائی ہی تھی کہ آپ ہمیشہ با وضو رہتے۔ اکثر نمازیں غسل کر کے ادا فرماتے، نشست اور برخاست کی جگہوں کو صاف ستھرا رکھتے، عمدہ لباس زیب تن فرماتے، عطر و خوشبو بہت زیادہ لگاتے، پان آپ کو زیادہ مرغوب تھا، کئی ہزار فرشتہ صورت شائستۂ روزگار جوان آپ کی خدمت میں رہتے، سب کا یہی طریقہ تھا آپ کی مجلس میں آنے والا محو حیرت ہو جاتا کہ سلطان الشہدا کی کیا شان ہے۔ جو شخص آپ کا یوسفی جمال دیکھتا آپ کے حسن سلوک اور افعال پسندیدہ کی وجہ سے عمر بھر کے لیے دیوانہ ہو جاتا لیکن جو سیاہ دل ہوتا آپ کے نور ولایت پہ یقین نہ رکھتا۔ داستان اول اس بیت پر ختم ہوتی ہے۔

آن کس کہ جمال مصطفی را بیند
شک نیست عالم صفا را بیند
اینست کمال مرد در راہ یقین
در ہر چہ نظر کند خدا را بیند[۸]

داستان دوم:

سالار شاہو اور سلطان الشہدا کا اجمیر سے غزنی آنا اور حسن میمندی کا بت سومنات کے سلسلہ میں سلطان الشہدا سے عناد کرنا۔ شیخ عبد الرحمن چشتی نے مرآۃ مسعودی کی داستان دوم میں لکھا ہے کہ دس سال کی مدت میں جب سالار شاہو پہلوان لشکر نے ہندوستان کے اکثر ممالک کو اپنے قبضے میں لے لیا اور کفار کی شورش سے مطمئن ہو گئے اور بے تکلف خراج آنے لگے، سلطان ان دنوں خراسان گیا ہوا تھا، پہاڑ کے دامن میں رہنے والے سرکش متحد ہو کر کالہیر کو تاخت و تاراج کرنا چاہتے تھے۔ حاکم کالہیر ملک چھجو نے حقیقت تحریر کر کے سلطان محمود غزنوی کی خدمت میں بھیجا وہ فرمان سالار شاہو پہلوان لشکر کے نام پہنچا کہ آدھا لشکر دیار اجمیر کی محافظت کے لیے چھوڑ کر خود آدھی جنگجو فوج کے ساتھ کالہیر کا رخ کرو اور کافروں کی ایسی گوشمالی کرو کہ دوبارہ سرکشی کی راہ اختیار کرنے کی جرأت نہ کریں۔ کالہیر کشمیر کے دامن کوہ میں واقع ہے، اس کا قلب قلعہ بہت بلند مقام پر تھا جو فرعون وقت رائے گل چند کے قبضہ میں تھا۔ ملک و مال اور لشکر

کی کثرت کی وجہ سے بہت مغرور تھا۔ جب سلطان محمود قنوج کی طرف رخ کرتے ہوئے کشمیر کے اطراف میں پہنچا تو ہزار کوشش وتدبیر کے بعد قلعہ رائے گل چند کو فتح کرلیا تھا اور کارندے مقرر کردیے، جیسا کہ قلعہ مذکور پر قبضہ کرنے اور پچاس ہزار مشرکوں کے ساتھ رائے گل چند کے ہلاک ہونے کا واقعہ تاریخ روضۃ الصفا میں مفصل مذکور ہے۔

سالار شاہو پہلوان لشکر اسی وقت میر سید ابراہیم ومظفر خاں اور دیگر معتمد امرا کو جو سرحدوں پر تعینات تھے، سالار مسعود کی خدمت میں چھوڑ کر خود کالہیر کی طرف متوجہ ہوئے۔ بے اندازہ کفار نے جمع ہوکر اطراف کالہیر کو تباہ وبرباد کردیا تھا۔ ملک چھجو مقابلہ کی طاقت نہ رکھنے کی وجہ سے کالہیر میں قلعہ بند ہوگیا تھا، کفار ملک کو غارت کرکے اپنے گھروں کا رخ کررہے تھے کہ پہلوان لشکر پہنچ گئے۔ مقابلہ ہوا اسلام غالب آیا کفار راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہوگئے۔ عظیم فتح ہوئی۔ سالار شاہو نے کالہیر آکر فتح نامہ سلطان کی خدمت میں بھیجا۔ سلطان نے خوش ہوکر ایک فرمان بدستخط خاص جاری فرمایا کہ جاگیر وانعام کے علاوہ دیار کالہیر ان برادر کو ہم نے سپرد کیا اور کہا کہ اس مقام کو تم اپنے لیے وطن بنالو۔ پہلوان لشکر کے لیے کالہیر میں سکونت گزیں ہونا طے پایا تو سالار شاہو نے اجمیر کی طرف قاصد روانہ کیے کہ وہ سالار مسعود کو کالہیر لائیں، انھیں حکم دیا کہ مفتوحہ علاقوں میں امیر مقرر کرنے کے بعد اپنی والدہ کے ہمراہ جلد از جلد کالہیر پہنچیں۔

سید سالار مسعود غازی اپنی والدہ محترمہ کے ساتھ کالہیر کی طرف چل پڑے جب قصبہ راول پہنچے، شیو کن اور بشنو جو خواجہ حسن میمندی کے سالے تھے اور قصبہ راول کے زمیندار تھے، سلطان الشہدا کے استقبال کے لیے آئے کہ بندہ نوازی فرماکر آج ہمارے غریب خانہ پر قیام فرمائیں تاکہ تمام زمینداروں کے درمیان بندے کی عزت افزائی ہوجائے۔ چوں کہ بدطینت حسن میمندی کا نفاق شیو کن کی پیشانی پر ظاہر تھا سلطان الشہدا نے کسی صورت میں قبول نہ کیا کہ اس دغاباز کافر کے گھر میں قیام کریں۔ کوچ کے وقت شیو کن قسم قسم کی دو سو من مٹھائی بنوا کر لایا، سلطان الشہدا نے نور ولایت سے معلوم کرلیا کہ مٹھائی مکمل زہر آلودہ تھی۔ ملک نیک بخت کو آپ نے حکم دیا کہ شیو کن کی دی ہوئی مٹھائی لاؤ اور شکاری کتوں کو دے دو۔ مٹھائی کھاتے ہی سب کتے زہر کی وجہ سے مر گئے۔

سلطان الشہدا سید سالار مسعود غازی نے حاضرین کی طرف متوجہ ہوکر وحدت نثار زبان سے فرمایا کہ یہ حقیر کافر مجھے بھی ظاہر بیں لوگوں کے زمرہ میں سمجھتے ہیں، خدمت میں رہنے والے تمام حاضرین سلطان الشہدا کی اس کرامت سے متحیر ہوکر اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کرتے ہوئے سجدہ میں گر پڑے۔ جب یہ

خبر والدہ ستر معلی کو پہنچی زار زار رونے لگیں کہ مردود کافر نے حسن میمندی کے اشارے سے دغا کیا۔ اس کے بعد سلطان الشہدا قصبہ راول کی طرف متوجہ ہوئے، غازیان اسلام اور کافروں کے درمیان جنگ ہوئی، بہت سے کفار تہ تیغ ہوئے۔ شیو کن مردود کو زندہ گرفتار کرکے سلطان الشہدا کی خدمت میں لایا گیا، سلطان الشہدا نے فرمایا کہ اے شیو کن تو شیر کے بچے کے ساتھ بازی گری کرتا تھا تجھے معلوم نہیں کہ میں اسد اللہ الغالب حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم کی نسل سے ہوں، پھر حکم دیا کہ اس کافر کو زن و فرزند سمیت باندھ کر لشکر گاہ میں لے جاؤ اور تمام شہر کو تاخت وتاراج کردو۔

سلطان الشہدا کی یہ پہلی کرامات اور پہلی فتح تھی، والدہ ستر معلی نے شادیانے بجانے کا حکم دیا اور بہت زیادہ صدقات تقسیم کیے، سلطان الشہدا کے تمام لشکریوں کو گھوڑے، خلعت، زرنقد مرحمت فرمائے، اس وقت سالار مسعود غازی کی عمر بارہ سال کی تھی، حقیقت حال لکھ کر سلطان محمود غزنوی کی خدمت میں قاصدوں کو روانہ کیا اور خود دولت وحشمت کے ساتھ کالہیر کی طرف کوچ کیا۔ جب کالہیر ایک کوس باقی رہ گیا تو سالار شاہو پہلوان لشکر کو خبر ملی غلبہ شوق سے حضرت یعقوب علیہ السلام کی طرح بے اختیار ہوکر اپنے فرزند یوسف ثانی کے استقبال کے لیے باہر آئے۔ سلطان الشہدا کی نظر جب پہلوان لشکر پر پڑی گھوڑے سے نیچے اتر پڑے پدر بزرگوار کی قدم بوسی کی اور پہلوان لشکر نے اپنے سالار مسعود کو گلے لگالیا۔ اس کے بعد شاہانہ لباس اور شاہی گھوڑے سے باپ بیٹے دونوں سوار ہوکر گھر کی طرف متوجہ ہوئے۔

جب سلطان محمود نے ملک ہندوستان کے اکثر بت خانوں کو ویران کردیا تھا تو سومنات کے معتقدین کہتے تھے کہ سومنات ان بتوں سے خفا ہے، ورنہ سومنات سلطان کے لشکر کو ہلاک کردیتا۔ جب سلطان کو اس طرح کی خبر ملی اور حکم کیا کہ اب بہر حال مجھ کو سومنات کو تاخت وتاراج کردینا ہے، تاکہ ہندوؤں کے باطل عقیدے کا بھرم ٹوٹ جائے۔ سلطان ملتان سے سومنات کی طرف متوجہ ہوا۔ ہندوؤں کا یہ عقیدہ تھا کہ ہمارا معبود (سومنات) سلطان کے تمام لشکر کو ہلاک کردے گا، جس مندر میں سومنات تھا وہ بہت زیادہ لمبا چھوڑا تھا چنانچہ لعل وزر سے مرصع چھ ستون نصب کیے گئے تھے۔ سومنات پتھر کا تراشیدہ ایک بت تھا، اس کی لمبائی پانچ گز تھی۔ تین گز ظاہر تھے دو گز زیر زمین گڑا ہوا تھا۔ دوسرے دن لشکر اسلام قلعہ کی دیوار تک پہنچ گیا اور جنگ چھڑ گئی۔ پورے دن جنگ ہوتی رہی۔ سلطان بت خانہ کے اندر داخل ہوا۔ گرز سے سومنات پر ضرب لگائی۔ اسے آن واحد میں پارہ پارہ کردیا۔ کئی ہزار دینار سومنات کے خزانہ میں تھے جو سلطان کے ہاتھ لگے۔ چند دوسرے قلعے جو اطراف میں تھے سلطان نے انھیں بھی فتح کرلیے۔

صاحب نفحات لکھتے ہیں کہ جس وقت سلطان محمود نے سومنات پر چڑھائی کی تھی خواجہ ابو محمد چشتی کو القاہوا کہ سلطان کی امداد کے لیے جانا چاہیے۔خواجہ صاحب ستر سال کی عمر میں چند درویشوں کے ساتھ سومنات کی طرف متوجہ ہوئے ، جب اس جگہ پہنچے تو بنفس نفیس مشرکوں اور اصنام پرستوں سے جہاد کیا۔ خواجہ محمد چشتی کا قصبہ چشت میں چکی چلانے والا محمد کا کو نامی ایک مرید تھا اور وہیں جنگ کرنے لگا، یہاں تک کہ لشکر اسلام فتح پا گیا اور کافروں نے شکست کھائی ۔ جب حق تعالیٰ حضرت ابو محمد جیسے عارف کامل کو سلطان کی امداد کا حکم فرما رہا ہے تو اس کا مقابلہ کون کرسکتا ہے۔

صاحب تاریخ فیروز شاہی نے سلطان محمود کی دو حکمت عملی مقدم رکھا ہے۔ ایک یہ کہ اس نے ہندوستان کے مشرکوں کو مغلوب کر دیا نیز رائے گل چند کے قلعوں اور بت خانوں کو تاراج کر کے ملک ہندوستان اپنے زیر تصرف کرلیا۔ دوم یہ کہ سلطان نے نہروالہ اور گجرات کی طرف لشکر کشی کی اور یہ دونوں کام سالار شاہو کی تدبیر سے انجام پایا۔تاریخ محمودی میں حسن میمندی کی عداوت اور پہلوان لشکر کی حسن کارکردگی، ملک گیری اور شجاعت کا مفصل تذکرہ کیا گیا ہے۔[۹]

داستان سوم:

سلطان محمود غزنوی سے سلطان الشہدا کا رخصت ہو کر ہندوستان کی جانب متوجہ ہونا، ملتان سے دہلی آ کر اسے فتح کرنا، پھر دریائے گنگا پار کر کے ستر کھ میں قیام کرنا، وہاں سے اطراف واکناف کے لیے فوجی دستے متعین کرنا۔ شیخ عبدالرحمن چشتی نے مرآۃ مسعودی کی داستان سوم میں لکھا ہے کہ حسن میمندی کا کاروبار وزارت سے متعلق تھا۔ اس کے رنجیدہ ہونے کی وجہ ہر طرف فساد پھوٹ پڑا۔ سلطان کو خبر ہوئی۔ ہر طرح حسن میمندی کی دلجوئی کی مگر کسی طرح راضی نہ ہوا، جب سلطان الشہدا کو مجلس میں دیکھتا اور ان پر سلطان کا لطف وکرم دیکھتا سانپ کی طرح پیچ وتاب کھانے لگتا اور سالار مسعود کا یہ اعجاز اسے گوارا نہیں ہوتا۔ سلطان نے اس ماحول سے حیران ہو کر سالار مسعود کو تنہائی میں بلا کر از راہ شفقت فرمایا کہ حسن میمندی بدطینت ہے، خجالت کی وجہ سے تم سے عناد رکھتا ہے۔

سالار مسعود اپنے لشکر کے ساتھ مسلح ہو کر سلطان کے دربار میں آئے۔ سلام وآداب شاہی بجا لانے کے بعد رخصت کی درخواست پیش کی۔ شیر کی طرح سلطان کے پاس سے نکلے اور اسی وقت شہر کے باہر ڈیرا ڈالا۔ پورے شہر اور لشکر میں اس واقعہ سے شور پیدا ہو گیا کہ سالار مسعود نے دین محمدی کے پاس و لحاظ کے لیے سومنات کا بت کافروں کو نہیں دیا۔ اس وجہ سے حسن میمندی نے ان پر یہ ظلم ڈھایا کہ آپ

غزنی چھوڑ کر کہیں اور جا رہے ہیں۔شہر کے لوگ سالار مسعود کی طرف متوجہ ہوئے۔بعض امرا وملوک اور ترک بہادر اور آپ کے بہت سے رشتہ دار آپ کے گرد جمع ہو گئے۔سبھی نے آپ کی ہمراہی اختیار کی اور سلطان کے لشکر سے الگ ہو گئے اور کوچ کرتے ہوئے مشرق کی جانب روانہ ہوئے۔صاحب تاریخ محمودی لکھتے ہیں کہ خواص وعوام میں گیارہ ہزار لوگ سالار مسعود کے لشکر میں تھے۔ ہر شخص کا وطن غزنی تھا اور ان کے رشتہ دار بھی ملک غزنی میں تھے،لیکن حضرت سلطان الشہدا کے حسن یوسفی کے مشاہدہ میں اس قدر وارفتہ ہو گئے تھے کہ کبھی کسی کو وطن اہل وعیال اور رشتہ داروں کا خیال بھی نہیں آتا تھا۔اس باب میں کسی بزرگ نے کیا خوب کہا ہے۔

اندر طلب دوست مردانہ شدم
اول قدم از وجود بیگانہ شدم
او علم نمی شنید لب بستم و بس
او عقل نمی خرید دیوانہ شدم

سلطان الشہدا ظاہری و باطنی شان وشوکت کے ساتھ دریائے سندھ کے کنارے پہنچے، امیر جعفر بازید اور امیر حسن نے حکم دیا کہ تم دونوں پہلے پانچ ہزار سواروں کو لے کر دریائے سندھ پار کر کے شیو پور پر دھاوا بولو۔ رائے ارجن جو شیو پور کا زمیندار تھا پہلے ہی گھر چھوڑ کر جنگل کی طرف چلا گیا تھا، اس کے گھر میں پانچ لاکھ زر خالص کے سکے برآمد ہوئے۔ یہ دونوں امیر سلطان الشہدا کی خدمت میں پہنچے۔حکم دیا کہ یہ تم لوگوں کا پہلا حملہ ہے۔ میں نے تم لوگوں کو یہ تمام مال وزر بخش دیا۔اس کے بعد خود لشکر کے ساتھ دریائے سندھ پار کر کے چند روز دریا کے کنارے مقیم رہے۔ اس جگہ سے کوچ کر کے خطہ ملتان پہنچے۔ جب سے سلطان محمود نے آخری بار ملتان کو تاراج کیا تھا اس وقت سے اب تک وہ ویران ہی تھا اور زمیندار رائے انگ پال جو خطۂ اوچ میں آکر آباد ہو گیا تھا، اس نے آپ کے پاس اپنا قاصد بھیجا کہ پرائے ملک میں بے روک ٹوک داخل ہو گئے ہو۔ یہ بڑی غیر مناسب حرکت اور بے باکی ہے، شاید زندگی سے عاجز آ گئے ہو۔

سلطان الشہدا نے فرمایا، ملک خدا کا ہے، بندہ کا نہیں ہوتا، وہ جس کو چاہتا ہے اسے ملک پر قابض کر دیتا ہے۔ جد کریم اسداللہ الغالب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے زمانہ سے ہمارے آبا واجداد کا یہ طریقہ رہا ہے کہ ہم پہلے کافروں کو خدا کی وحدانیت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی دعوت دیتے ہیں، اگر انھوں نے اطاعت قبول کر لی یا ایمان لے آئے تو خیر ورنہ پھر فیصلہ تلوار سے ہوتا ہے۔ مسعودی لشکر نے انگ پال

کے بھاری لشکر کو شکست دی۔

سلطان الشہدا متواتر کوچ کرتے ہوئے سیر وتفریح کے انداز میں دہلی کے قریب پہنچے۔ رائے مہیپال بھی اپنے لشکر کے ساتھ پہلے ہی نکل چکا تھا۔ دونوں فوج کے بہادر روزانہ مقابلہ کے لیے نکلتے اور صبح سے شام تک جنگ کرتے، ایک ماہ کچھ روز تک یہ سلسلۂ جنگ چلتا رہا۔ سلطان الشہدا سخت حیران تھے اور اللہ تعالیٰ سے فتح ونصرت کی دعا مانگتے تھے۔ ناگاہ خبر ملی کہ سالار سیف الدین ومیر سید عزالدین وملک دولت ومیاں رجب ودیگر امراغزنی کی طرف سے بہت بڑے لشکر کے ساتھ آرہے ہیں۔ جب یہ لوگ سالار مسعود کی خدمت میں پہنچے لشکر مسعودی میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ میاں رجب سالار شاہو کے خادم خاص تھے اسی وجہ سے سالار شاہو نے میاں رجب کو سالار مسعود کی خدمت میں دے دیا تھا، سالار مسعود نے میاں رجب کو جاگیری نگرانی پر متعین کر دیا تھا۔ سلطان الشہدا کی دشمنی کی وجہ سے خواجہ حسن میمندی آپ کے تمام اقربا سے عناد رکھتا تھا۔

'تاریخ روضۃ الصفا' میں تحریر ہے کہ آخر سلطان محمود نے خواجہ حسن میمندی کو منصب وزارت سے معزول کر کے ہندوستان کے ایک قلعہ میں مقید کر دیا اور اسی قلعہ میں حالت اسیری میں ہلاک ہو گیا۔ رائے مہیپال کی فوج اور سالار مسعود کے لشکر جنگ میں مشغول ہو گئے۔ سالار مسعود شرف الملک کے ساتھ گفتگو میں مصروف تھے کہ مہیپال کا لڑکا گوپال آپ کی طرف گھوڑا دوڑاتے ہوئے آیا اور گرز سے وار کیا آپ کی ناک زخمی ہو گئی اور آپ کے دو دانت شہید ہو گئے، سالار مسعود نے زخمی ہونے کے باوجود بھی جنگ کیا، بہت سے نوجوان ترک شہادت سے سرفراز ہوئے اور بہت سے کافر بھی قتل ہوئے۔ الغرض دونوں رائے میدان جنگ میں مارے گئے۔ عظیم فتح ہوئی اور دہلی کا تخت ہاتھ آیا۔

سید سالار مسعود غازی نے چھ ماہ سولہ روز کے بعد دہلی سے میرٹھ کی طرف کوچ فرمایا، میرٹھ اور اس کے اطراف وجوانب کے راجاؤں کو جب خبر ملی کہ سید سالار مسعود غازی اپنے جاں نثاروں کی فوج لے کر میرٹھ آرہے ہیں تو وہ لوگ بہت گھبرائے کیوں کہ انھوں نے آپ کی شجاعت وبہادری اور فتح وظفر کے قصے سن رکھے تھے۔ سارے راجاؤں نے عاقبت اندیشی سے کام لیتے ہوئے اپنی بھلائی اسی میں سمجھی کہ اطاعت وتابعداری کی پیش کش کی جائے۔ سارے راجاؤں نے اپنے اپنے ایلچیوں کو آپ کی خدمت میں بہت سے قیمتی تحفے دے کر بھیجا اور کہلایا کہ یہ ملک آپ ہی کا ہے۔ ہم آپ کی اطاعت اور تابعداری قبول کرتے ہیں۔ اس کے بعد سلطان الشہدا نے شان وشوکت کے ساتھ قنوج کا رخ کیا، اس وقت وہاں کا راجا رائے جیپال تھا۔ چوں کہ پہلے سلطان محمود نے رائے جیپال حاکم قنوج کو جلا وطن کر دیا تھا، لیکن سید سالار

شاہو کی سفارش سے اسے معاف کر کے ازسرنو قنوج کی حکومت دے دی تھی۔ اس احسان کی وجہ سے اس نے سلطان الشہدا سالار مسعود غازی کی آمد کی خبر سن کر اپنے بڑے لڑکے کے ساتھ تحائف ارسال کیے اور امن کی درخواست کی۔ سلطان الشہدا نے اس کی درخواست قبول کی۔

اس کے بعد کوچ کرتے ہوئے سترکھ کی طرف متوجہ ہوئے۔ دسویں روز آپ سترکھ پہنچے۔ اس زمانہ میں سترکھ سے عمدہ ملک ہندوستان میں کوئی قصبہ اور شہر آباد نہیں تھا۔ شکارگاہ بھی خوب تھی اور وہ مقام ناف اقلیم ہند تھا اور وہاں کفار کا بہت معتبر عبادت خانہ تھا۔ اسی وجہ سے سلطان الشہدا نے سترکھ میں اقامت اختیار کر لی اور سترکھ کے اطراف وجوانب میں اپنے لشکر کو متعین کیا۔ سالار سیف الدین اور میاں رجب سالار کو بہرائچ کی طرف رخصت فرمایا اور میاں رجب کے لڑکے کو باپ کی جگہ لشکر کا کوتوال مقرر کیا۔ اگرچہ یہ کم عمر تھے لیکن شعور اور غیرت زیادہ رکھتے تھے۔ الغرض سالار سیف الدین اور میاں رجب بہرائچ پہنچے تو آپ کی خدمت میں یہ اطلاع بھیجی کہ اس جگہ غلہ دستیاب نہیں ہو رہا ہے۔ غلہ بھیجیے کہ لشکر ہلاک نہ ہو۔ سلطان الشہدا نے حکم کیا کہ پرگنات اور نواحی کے چودھری اور مکھیوں کو حاضر کیا جائے۔ سات آٹھ پرگنوں کے چودھری اور مکھیا بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ سدھور کے چودھری اور اینٹھی کے چودھری کو اپنے پاس بلایا۔ انھیں تسلی دیتے ہوئے کہا کہ کاشتکاری کرنے میں سستی نہ کرو کہ اس میں تمہاری اور رعایا کی فلاح وبہبود ہے۔ نیز آپ نے فرمایا کہ ہم سے قیمت لے لو اور غلہ ہمیں دے دو۔ لوگوں نے عرض کیا کہ پہلے غلہ خدمت میں پہنچا دیں اس کے بعد قیمت لیں گے، آپ نے حکم دیا کہ پہلے قیمت لے لو۔ آپ نے پہلے چودھری اور مکھیوں کو غلہ کی قیمت ادا کر کے خلعت اور پان مرحمت فرمایا، پھر کچھ لوگوں کو ان کے ہمراہ کر دیا۔

ایک روز کٹرہ مانک پور کا قاصد دو زین اور چند لگام کے ساتھ بطور سوغات سلطان الشہدا کی خدمت میں حاضر ہوا اور رایان مذکور سے عرض کیا کہ یہ ملک قدیم زمانہ سے ہمارے آباواجداد کا ہے۔ اس ملک میں کبھی بھی مسلمان نہیں آئے ہیں اور مشہور تواریخ میں لکھا ہے کہ سلطان سکندر رومی نے اس ملک کا قصد کیا تھا۔ قنوج تک پہنچ کر والی قنوج کیدرائے کے ساتھ صلح کر کے لوٹ گیا دریائے گنگا پار نہ کر سکا۔ سلطان محمود غزنوی اور تمہارے باپ بھی اجمیر، گجرات اور قنوج تک آئے۔ اس جانب رخ نہ کیا۔ ہم نو لاکھ فوج رکھتے ہیں اور بہرائچ وغیرہ کے رائے ہم سے زیادہ فوج رکھتے ہیں جب ہر طرف سے لوگ چل پڑیں گے اس وقت تمہارا یہاں رہنا مشکل ہو جائے گا، بہتر ہے کہ اپنا سیدھا راستہ لو اور چلے جاؤ۔

سلطان الشہدا نے قاصد سے فرمایا اگر تمہاری جگہ کوئی دوسرا ہوتا اور اس طرح کی گستاخانہ گفتگو کرتا

تو اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا۔ سلطان الشہدا نے قاصد سے کہا تم جاؤ اور اپنے رایوں سے کہنا کی ملک قادر قہار یعنی اللہ تعالیٰ کا ہے، وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔ میں اس جگہ سیر کے لیے نہیں آیا ہوں بلکہ وطن بنانے آیا ہوں اور پروردگار عالم کے حکم سے اس ملک سے کافروں کے کفر کو دور کر کے انشاءاللہ آج سے دین محمدی کا رواج دن بدن زیادہ ہوگا اور کفار مقہور ہوں گے۔ شیخ عبدالرحمن نے داستان سوم میں سلطان الشہدا کے ساتھ نازیبا حرکت کا واقعہ بیان کیا ہے۔[۱۰]

داستان چہارم:

سالار شاہو کا ستر کھ پہنچنا سلطان الشہدا کا بہرائچ کی طرف متوجہ ہونا، ستر کھ میں سالار شاہو کی وفات، سلطان الشہدا کا حربی کافروں سے جہاد اور جام شہادت نوش کرنا۔ شیخ عبدالرحمن چشتی نے مرآۃ مسعودی کی داستان چہارم میں لکھا ہے کہ جب سالار شاہو ستر کھ کے قریب پہنچے، سالار مسعود نے ان کا استقبال کیا اور با عزت گھر لائے۔ تین روز تک خوشی کے شادیانے بجائے گئے، شب و روز مجلس جشن قائم رہی۔ سالار شاہو پہلوان لشکر کے تشریف لانے سے پورے سرحدی لشکر کو قوت حاصل ہوئی۔ ہر طرف کے کفار رنجیدہ اور اداس ہو گئے، چند روز کے بعد ملک فیروز نے دریائے سرجو کی گزرگاہ پر کافروں کے تین جاسوسوں کو گرفتار کر کے ستر کھ بھیج دیا۔ سلطان الشہدا کے خدمت گاروں نے انھیں پہچان لیا۔ ان میں دو تو وہ برہمن تھے جو اس سے پہلے جادو کی ہوئی زین اور لگام کٹرہ مانک پور کے راجگان کی طرف سے سلطان الشہدا کی خدمت میں لائے تھے اور ایک وہی حجام تھا جس نے زہر آلود نہرنی آپ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ سالار شاہو نے حکم دیا کہ تینوں کو تہ تیغ کر دو، سالار شاہو نے سلطان الشہدا کے کہنے پر دونوں برہمن کو چھوڑ دیا لیکن حجام بدنہاد کو اسی وقت تہ تیغ کر دیا۔ سالار شاہو نے دو جاسوس متعین فرمایا کہ کٹرہ و مانک پور کے راجاؤں کی خبر لائیں کہ وہ کس سرگرمی میں ہیں۔ وہ لوگ گئے اور خبر لائے کہ دونوں راجا غافل ہو کر لڑکے اور لڑکی کی شادی کرنے میں مشغول ہیں۔ سالار شاہو جنگ کے لیے کفار کے سر پر جا چڑھے اور لشکر کو دو حصے کیے۔ ایک طرف کٹرہ کی جانب اور دوسرے مانک پور کی طرف بھیجا۔ ترک بہادروں نے دونوں مقام کو تیزی کے ساتھ گھیر لیا۔ کفار جنگ کے لیے آئے لیکن لشکر اسلام غالب رہا۔ ہزاروں کفار تہ تیغ کر دئے گئے اور دونوں راجاؤں کو گرفتار کر کے قید کر دیا گیا۔

سلطان الشہدا نے اپنے باپ سے بہرائچ جانے کی اجازت لی اور عرض کیا کہ اطراف بہرائچ میں شکارگاہ خوب ہے، چند روز شکار کھیل کر جلد لوٹ آؤں گا۔ اس کے بعد سلطان الشہدا نے بہرائچ کا رخ کیا،

آپ کی آمد سے کفار اداس ہو کر خاموش ہو گئے۔ جس وقت آپ سورج کنڈ کے بتخانے کے قریب سے گزرتے اور فرماتے کہ اس سرزمین سے مجھے وطن کی خوشبو محسوس ہو رہی ہے اور سورج کنڈ ہندوستان کے تمام کافروں کا قبلہ تھا۔ سورج گہن کے دن مشرق سے لے کر مغرب تک کے تمام کفار اس کی پرستش کے لیے آتے تھے۔ سلطان الشہدا بار ہا فرمایا کرتے کہ انشاءاللہ اس کان کفر کو بدل کر اس جگہ پروردگار عالم کی عبادت کے لیے ایک حجرہ بناؤں گا اور اس دیار سے کفر کی نشانی کو ہمیشہ کے لیے اکھاڑ پھینکوں گا۔ حق تعالی نے آپ کی اس دعا کو قبول فرمالیا جس کا اثر ہے کہ آج وہاں اسلام کی شوکت وعظمت کا غلبہ ہے۔

بہرائچ کے گرد و نواح کے راجاؤں کا قاصد سلطان الشہدا کی خدمت میں آیا۔ ملک حیدر نے اس کو آپ کی خدمت میں حاضر کیا اور جو خط وہ لایا تھا حضور میں پیش کیا۔ کفار نے غرور کے نشے میں لکھا تھا کہ تم یہاں بالائی علاقے سے آئے ہو۔ اس ملک کی حقیقت تمھیں نہیں معلوم کہ یہاں خشک علاقے کے لوگ نہیں رہ سکتے کہ یہ ترائی علاقہ ہے، تمھیں اپنی حقیقت پر غور کرنا چاہیے۔ سالار مسعود نے قاصد سے پوچھا کہ کتنے راجا جمع ہیں اور ان کے کیا نام ہیں۔ اس نے کہا رایت، سایت، رائے ارجن، رائے لکن، رائے بھگن، رائے کرن، رائے کلیان، رائے مردان، رائے نکرو، رائے دھرمل، رائے اجے پال، رائے کرن، رائے ہرکشن، رائے دیونرائن، رائے نرسنگھ، رائے مورائے، بھردیو، رائے صاحب اور دیورائے بھا بھر ہیں جو آٹھ لاکھ سوار و پیادہ، بے شمار فوجی ایک جگہ جمع ہیں اور جنگ کا ارادہ رکھتے ہیں۔

رائے کلیان ان سرکش راجاؤں کے بیچ کچھ باشعور تھا۔ اس نے کہا اے راجاؤں کیا تمہاری عقل گم ہو گئی ہے کیا، خیال کرتے ہو کہ سالار مسعود نے خوف و دہشت کی وجہ سے صلح و مصالحت کی پیش کش کی ہے یہ تم لوگوں کا خیال غلط ہے۔ سوچو تو سہی کہ کل کا لڑکا اس قسم کی غیرت دکھا رہا ہے۔ سالار مسعود جب سلطان محمود کے پاس تھا تو وزیر سے ان بن ہو گئی۔ ماں باپ کو چھوڑ کر پورے ہندوستان پہ قبضہ جما لیا۔ باپ نے ستر کھ میں وفات پائی۔ دیکھنے کے لیے بھی نہ گیا۔ اتنی دلیری اور بہادری کی بات کرتا ہے کہ اگر کسی میں ہمت ہو تو میرا ہاتھ پکڑ کر یہاں سے نکال دے۔ تمھیں طعنہ دے رہا ہے اور تم سمجھ بھی نہیں پا رہے ہو، صلح میں آخر کیا نقصان ہے۔ وہ بھی اگر واقعی اس پر تیار ہو۔ اس گفتگو سے تمام راجا کلیان پر طعنہ زنی کرنے لگے۔ ملک نیک دل نے مجلس میں بے تکا رنگ دیکھا۔ رخصت چاہی اور سالار مسعود غازی سے حقیقت حال بیان کیا۔ ادھر دشمنوں نے بھی جنگ کی ٹھانی۔ متواتر کوچ کر کے دریائے بھکلہ کے کنارے جنگل میں ڈیرہ ڈالا۔

سلطان الشہدا نے ملک حیدر کو حکم دیا کہ سالار سیف الدین، امیر نصراللہ، امیر خضر، امیر سید

ابراہیم، شرف الملک، نجم الملک، ظہیر الملک، قیام الملک اور میاں رجب وغیرہ کو میرے پاس بلالاؤ، ملک حیدر نے تمام امیروں کو آپ کی خدمت میں جمع کر دیا، کفار کے فوجی آپ کی چوکی کے لشکری دستہ پر ٹوٹ پڑے، چوں کہ لشکر مسعودی کے بہادر جوان پروانہ وار مسلح ہو کر تیار کھڑے تھے، جنگ شروع کر کے سلطان الشہدا کی خدمت میں خبر بھیجا۔ آپ نے بھی فوراً نقارہ بجوادیا۔ لشکر مسلح تیار کھڑا تھا۔ سوار ہو کر تمام امیر بہادر جوان دربار میں حاضر ہوئے۔ سالار سیف الدین کو حکم دیا کہ تم پہلے جا کر چوکی کے لوگوں کی مدد کرو آپ کے پیچھے ہم بھی پہنچ رہے ہیں۔ باہم مشورہ ہوا۔ آخر یہ طے پایا کہ اگر کفار چڑھ کر آئیں تو یہ بہتر نہیں ہے، بہتر یہ ہے کہ ہم لوگ آگے بڑھ کر ان پر چڑھائی کریں۔ انشاءاللہ فتح ہوگی۔ لشکر مسعودی کافروں کی فوج پر ٹوٹ پڑے۔ گھمسان کی جنگ ہوئی، دونوں طرف کے بے شمار آدمی مارے گئے۔ آخر کار حریف شکست کھا کر میدان چھوڑ گئے۔

کفار کے فوجی بے شمار تھے چاروں طرف پہاڑ کی طرح نظر آتے تھے، ہر چند لشکر اسلام کے بہت سے لوگ بڑھ بڑھ کر ان پر حملہ کر رہے تھے مگر ان کی مثال آٹے میں نمک کی تھی وہ شہید ہو جاتے۔ اس روز صبح سے لے کر نماز ظہر تک لشکر اسلام کے دو حصہ لشکر نے شربت شہادت نوش کر لیا۔ سلطان الشہدا کی خدمت میں جب یہ خبر پہنچی کہ سالار سیف الدین اور بہت سے امیر شہید ہو چکے ہیں تو آپ نے خوش ہو کر فرمایا، الحمدللہ وہ لوگ اپنے مطلوب حقیقی سے جا ملے، میں بھی ان کا ساتھ نہ چھوڑوں گا ایک دو دن میں میں بھی پہنچ رہا ہوں۔ آپ نے حکم دیا کہ شہیدوں کو لا کر سورج کنڈ میں ڈال دو کہ ان کی شہادت کی برکت سے اس جگہ کی تاریکی کفر قیامت تک کے لیے دور ہو جائے اور آپ نے اسی وقت تازہ وضو کر کے نماز ظہر ادا فرمائی اور بے شمار شہدا جو کنویں اور سورج کنڈ میں ڈال دیئے گئے تھے ان کی نماز جنازہ ادا فرمائی۔

رائے سہر دیو اور رائے بہر دیو اور بعض دوسرے راجا جو باقی بچے تھے اپنی فوج کے ساتھ ایک طرف کھڑے تھے، جب انھوں نے دیکھا کہ لشکر اسلام بہت تھوڑا رہ گیا ہے تو سب کے سب مل کر سلطان الشہدا کے لشکر پر حملہ آور ہو گئے۔ آپ کے ساتھ بہت تھوڑے لوگ باقی بچے تھے جو باغ کے درمیان آپ کے ارد گرد تعینات تھے۔ کافروں کی بھیڑ نے چاروں طرف سے گھیر کر تیر برسانا شروع کر دیا حتی کہ ۱۰۳۳ء بروز یک شنبہ اول وقت عصر کو ایک تیر آ کر سالار مسعود غازی کے گلوئے مبارک پر لگا۔ آفتاب جیسا چہرہ ہلال کے مثل سفید ہو گیا۔ کلمۂ شہادت پڑھتے ہوئے گھوڑے سے نیچے آ گئے۔ سکندر دیوانہ اور دوسرے خدمت گاروں نے آپ کو اٹھا کر درخت مہوہ کے نیچے بستر پر لٹایا، گردن زخم کی وجہ سے ایک طرف جھک گئی تھی۔ سکندر دیوانہ نے آپ کا چہرۂ مبارک قبلہ کی طرف کیا۔ بیٹھ کر زانوں پر رکھ لیا اور زار زار رونے لگے۔

سلطان الشہدا نے ایک مرتبہ آنکھ کھولی اور متبسم ہوئے۔ کلمہ حق زبان پر جاری ہوا اور جان بحق تسلیم ہو گئے۔ ایسے ہی موقعہ کے لیے حافظ شیرازی نے کہا ہے۔

این جان عاریت کہ بحافظ سپرد دوست
روزی رخش ببینم و تسلیم وی کنم

قال النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم الموت جسر لیوصل الحبیب الی الحبیب۔ یعنی موت ایک ایسا پل ہے جو دوست کو دوست سے ملا دیتا ہے، اس وقت یہ حدیث آپ کے حال کے عین مطابق تھی۔ مندرجہ ذیل رباعی سے آپ کا سنہ ولادت، مدت حیات، سنہ شہادت نکلتا ہے۔

محبوب خدا بود امیر مسعود
در چار صد و پنج در آمد بوجود
تا مدت بست در جہاد افزود
در چار صد و بیست و چہار رحلت فرمود

الغرض نعرۂ خلق بلند ہوا، لوگ ہائے ہائے رونے لگے اور تلواریں بلند کر کے کافروں کی فوج پر ٹوٹ پڑے اور شہید ہونے لگے۔ کفار بھی چاروں طرف سے تیر برسا رہے تھے، حتی کے مغرب تک ایک نفر بھی باقی نہ رہا۔ تمام لشکری و خدام اس چاند کے گرد ستاروں کے مثل بکھرے پڑے تھے۔ سکندر دیوانہ جو آپ کا سر مبارک زانوں پر لیے بیٹھے تھے۔ ان کے سینہ میں بھی پے در پے کئی تیر آ کر لگے لیکن انھیں سالار مسعود غازی سے کامل عشق تھا۔ آپ کے سر کے نیچے اپنے زانو کو ذرا بھی جنبش نہ دی اور سالار مسعود غازی کی محبت میں اپنے آپ کو قربان کر دیا۔ جب سلطان الشہدا کی شہادت کی خبر میر سید ابراہیم کو ملی۔ محض اس واقعۂ جگر سوز کے سننے ہی سے لرزہ براندام ہو کر گر پڑے اور بے ہوش ہو گئے، میر سید ابراہیم سلطان الشہدا کے ہم عمر اور صاحب جمال و کمال تھے۔ سلطان الشہدا اکثر دوستانہ انداز میں مزاح کی باتیں کرتے اور بہت زیادہ محبوب رکھتے۔ تھوڑی دیر کے بعد میر سید ابراہیم ہوش میں آئے، سبھی لوگوں کو بلا کر کہا کہ ہم سب سلطان الشہدا کی محبت و الفت میں اس ملک میں آئے ہیں، ان کے ساتھ یہ واقعہ ہوا۔ اب ہم کہاں جائیں اور یہ اپنا منھ کسے دکھائیں۔ سوائے مرنے کے اور کوئی دوسرا خیال دل میں نہیں آ رہا ہے۔ آپ کے دستہ کے لوگوں نے کہا کہ ہماری اور آپ کی غرض و غایت ایک ہی ہے۔

کفار کو خبر ملی کہ لشکر اسلام پھر بدستور سابق میدان جنگ میں موجود کھڑا ہے۔ رائے سہر دیو سانپ کی طرح بل کھاتے ہوئے مسلح ہو کر تمام کافروں کے ساتھ جنگ کے لیے آمادہ ہوا۔ جب کافروں کی فوج

نمودار ہوئی میر سید ابراہیم سکندر دیوانہ کی قبر کے متصل ایک قبر اپنے لیے تیار کر کے میدان جنگ میں آئے۔ طرفین کے مابین گھمسان کی جنگ ہوئی، میر سید ابراہیم نے ادھر سے اپنا گھوڑا دوڑایا اور ادھر سے رائے سہر دیو بھی آ گیا۔ میر سید ابراہیم نے رائے سہر دیو کو ایک ہی وار میں دو ٹکڑے کر دیا اور خود بھی شہید ہو گئے اور میر سید ابراہیم کی وصیت کے مطابق اسی قبر میں دفن کیا جو آپ نے تیار کی تھی۔ اس کے بعد وہ سب لوگ شہید ہو گئے، کوئی شخص زندہ نہ بچا۔ دونوں طرف کے آدمی میدان جنگ میں مارے گئے۔ حضرت سلطان الشہدا کے چند خدمت گار جو زخمی پڑے ہوئے تھے، جب اچھے ہو گئے تو آستانہ مبارک کی جاروب کشی میں اپنی عمر صرف کر دی۔ سید حاجی احمد اور سید حاجی محمد جو سالار شاہو کے مقربین میں سے ستر کھ میں رہ گئے تھے تھوڑی مدت کے بعد وہ لوگ بھی بہرائچ پہنچ کر آپ کے آستانہ کی خدمت میں مشغول ہو گئے۔ چوں کہ دونوں کو سلطان الشہدا سے کامل محبت تھی، پوری زندگی آپ کے آستانۂ مبارک کی خدمت میں صرف کر دی۔

صاحب مرآۃ مسعودی نے ذکر کیا ہے کہ بعض لوگ کہتے ہیں کے سلطان الشہدا خواجہ معین الدین چشتی کے زمانہ میں آئے تھے یہ سراسر غلط ہے۔ معتبر کتابوں سے تحقیق کی گئی ہے کہ سلطان الشہدا خواجہ ابو محمد چشتی کے ہم عصر ہیں۔ سلطان الشہدا خواجہ معین الدین چشتی سے مدتوں پہلے ہندوستان میں آئے اور شہادت سے سرفراز ہوئے۔ کم و بیش دو سو سال کا فاصلہ ہوگا کیوں کہ سلطان الشہدا کی شہادت ۴۲۴ھ میں ہوئی اور خواجہ معین الدین چشتی کی وفات ۶۳۲ھ میں ہوئی ہے۔[۱۱]

داستان پنجم:

شہادت کے بعد سلطان الشہدا کی کرامتوں کا ظہور روضۂ منورہ مطہرہ کی تعمیر، محبوب رب العالمین سلطان الشہدا کے بعض احوال و کرامات۔ شیخ عبدالرحمن چشتی نے مرآۃ مسعودی کی داستان پنجم میں لکھا ہے کہ جس دور میں ہندوستان ظلمت کفر کے غلبہ کی وجہ سے تن بے روح کی طرح کوئی رونق نہیں رکھتا تھا، تو اللہ نے چاہا کہ اسے اسلام کے نور سے زندہ کر کے رونق بخشے تو سلطان الشہدا کے وجود سے صورتاً و معناً اس ملک کو منور کر دیا۔ چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام کا جسم جماد کے مثل پڑا تھا۔ کوئی نہیں پوچھتا تھا۔ جب روح اس میں پھونکی گئی تو پہلے ان کے دل میں آئی۔ اس کے بعد نیچے اتر کر ناف کے برابر ٹھہری اس وقت ان کو چھینک آئی اور روح ان کے تمام جسم میں سرایت کر گئی۔ پورا وجود زندہ ہو گیا، پھر ایک نور اور رونق ان پر ظاہر ہوئی کہ مجبوراً تمام فرشتے سر بسجود ہو گئے۔

الغرض زمین کی تقسیم کے اعتبار سے اقلیم ہند یعنی ہندوستان کا درمیانی حصہ ستر کھ ہے اور فرو

دست پائے ہند ہے۔ اس لیے سلطان الشہدا نے بھی بطریق مذکور اوپر کی طرف سے آ کر دہلی کو فتح کیا۔ پہلے اقلیم ہند کے دل میں داخل ہوئے۔ اس کے بعد ناف ہند ستر کھ پہنچ کر ناف اقلیم ہند کے برابر بہرائچ میں قیامت تک کے لیے قیام پذیر ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے وابستگان اقلیم ہند کے تمام خطوں میں آرام فرما ہیں، کوئی شہر، کوئی گاؤں، کوئی قصبہ اقلیم ہند کا ایسا نہیں جہاں آپ کے جاں نثاروں میں سے کوئی آسودۂ خاک نہ ہو، جس وقت سلطان الشہدا نے ساقی کوثر کے ہاتھ سے شراب شہادت پیا آپ کے جاں نثار رفقا پورے ہندوستان میں پھیل گئے تھے۔ جو جہاں تھا وہیں پہ شہادت سے سرفراز ہوا اور ہر ایک مقام نور اسلام سے منور ہو گیا۔ پورا ملک ہندوستان از شرق تا غرب سلطان الشہدا کے نور ولایت سے منور ہو گیا۔ آپ ملک ہندوستان کی روح رواں ہیں۔ اس لیے خلق خدا آپ کے آستانۂ متبرکہ پر جبیں سائی کرتی ہے۔

سلطان الشہدا کی شہادت کے بعد سب سے پہلی کرامت جو لوگوں میں مشہور ہوئی وہ یہ ہے کہ بہرائچ کے موضع نگرور میں ایک چرواہا رہتا تھا جس کی عورت کو بانجھ قرار دے دیا گیا تھا، اس عورت کو گھر سے باہر کر دیا گیا، چرواہے کی عورت غیرت میں ڈوب کر روتی ہوئی گھر سے نکل گئی، اتفاقاً سلطان الشہدا کے آستانہ پر پہنچی۔ تھوڑی دیر ٹھہری، درگاہ کے خادموں نے اسے مغموم دیکھ کر اس کے مفصل احوال پوچھے۔ اس نے اپنی پوری داستان غم بیان کر دی، خادموں نے کہا کہ سالار مسعود غازی عارف ربانی ہیں اور خدا کی محبت میں شہید ہوئے ہیں۔ تو سچے دل سے نیت کر لے انشاءاللہ ان کی برکت سے خدا تمھیں فرزند نرینہ عطا فرمائے گا۔ شوہر اپنی بیوی کے پورے واقعات سے واقف ہوا اس نے بھی نیت کر لی اور دونوں گھر لوٹ گئے اور نو مہینہ کے بعد فرزند نرینہ پیدا ہوا۔ اسی تاریخ سے یہ دونوں میاں بیوی ہر شب دوشنبہ کو سلطان الشہدا کی زیارت کے لیے آتے تھے اور اس کرامت کا جگہ جگہ چرچا کرتے تھے۔ سلطان الشہدا کے آستانہ پر دن بدن لوگوں کی آمد و رفت بڑھتی گئی چوں کہ اس دور میں آپ کی کرامات کے ظہور کا عروج تھا۔ بارش کے مثل خلق خدا پر کرامتوں کی برسات ہوتی تھی۔

چنانچہ گاؤں گاؤں، شہر شہر، ملک ملک آپ کی کرامتوں کی شہرت ہو گئی کہ اندھے، کوڑھی، اپاہج وغیرہ جو بھی آپ کی بارگاہ میں پہنچتا شفا پاتا۔ الغرض منقول ہے کہ سید جمال الدین کی ایک بارہ سال کی لڑکی تھی، اللہ تعالیٰ نے اس لڑکی کو کمال حسن سے آراستہ فرمایا تھا لیکن وہ نابینا تھی۔ اس کا نام زہرہ تھا۔ سید جمال الدین ہمیشہ اپنی لڑکی کے احوال سے مغموم رہتے تھے۔ ناگاہ کچھ لوگوں نے بہرائچ سے واپس آ کر بیان کیا کہ ہماری موجودگی ہی میں چند نابیناؤں نے سالار مسعود کے آستانہ پر بینائی پائی

ہے۔ سید جمال الدین یہ واقعہ سن کرخوش ہوئے اور نیت کی کہ اگر سلطان الشہدا کی برکت سے میری لڑکی کو بینائی مل جائے تو سلطان الشہدا کے روضہ کی تعمیر کراؤں گا، اس کے بعد حکایت مذکورلڑکی سے بھی بیان کیا۔ زہرہ نے بھی نیت کرلیا کہ اگر میری آنکھ بینا ہو جائے تو سلطان الشہدا کے آستانہ پر سوائے جاروب کشی کے دوسرا کام نہیں کروں گی۔

سلطان الشہدا زہرہ کی آنکھ کی روشنی بخش کرنظروں سے غائب ہو گئے۔ زہرہ دیوانی ہوگئی۔ عشق صرف دیدار سے پیدانہیں ہوتا اکثر یہ دولت بات سے بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ زہرہ اپنے وقت میں زلیخا پر فوقیت رکھتی تھی کیوں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کوخواب میں دیکھ کران کے حسن و جمال پر عاشق ہوگئی تھی اور زہرہ صرف سلطان الشہدا کا نام سن کران کے عشق میں گرفتار ہوگئی۔ زہرہ روضہ مطہرہ کی تعمیر کے لیے آمادہ ہوئی۔ پہلے سلطان الشہدا اور سیف الدین کا روضہ تعمیر کرایا، اس کے بعد تمام شہدا جو سورج کنڈ میں مستور تھے ان کا روضہ بنوایا۔

منتخب التواریخ میں لکھا ہے کہ اس کے بعد سلطان فیروز شاہ دہلی پہنچا۔ اپنے پوتے کو تخت سلطنت پر بیٹھا کر خود گوشہ نشین ہو گیا۔ بقیہ عمر یاد خدا میں گزاری۔ میر سید اشرف جہاں گیر قدس سرہ بتیسویں مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں کہ سادات بہرائچ مشہور النسب ہیں۔ ایک بار شہید سید سالار مسعود غازی کے مزار متبرکہ کے طواف کے دوران سلطان الشہدا کی روحانیت اور حضرت خضر علیہ السلام اور سید امیر ماہ اور یہ فقیر ایک مجلس میں تھے۔ اکثر حالات مشیخت اور مقامات شیخوخیت کے بارے میں حضرت خضر علیہ السلام سے استفسار کیا گیا۔

شیخ ضیاء برنی اپنی تصنیف تاریخ فیروز شاہی میں لکھتا ہے کہ سلطان محمد تغلق عین الملک کے فتنہ سے فراغت کے بعد بنگرمئو سے عازم بہرائچ ہوا اور سپہ سالار مسعود غازی جو سلطان محمود غزنوی کے غازیوں میں سے تھے، زیارت کی اور آپ کے روضۂ پاک کے مجاوروں کو بہت مال وزر دیا، پھر بہرائچ سے احمد ایاز کو لکھنوتی کے راستہ پر تعینات کر کے خود اس طرف متوجہ ہوا۔ الغرض اکثر بادشاہان دہلی سلطان الشہدا کی زیارت کے لیے بہرائچ حاضر ہوتے اور ظاہری و باطنی فیوض حاصل کرتے۔

سلطان الشہدا کی محبوبیت کے دلائل اظہر من الشّمس ہیں، کہ اٹھارہ ہزار عالم پورے ذوق وشوق کے ساتھ آپ کے آستانہ پر پروانہ وار نثار ہوتے ہیں، آپ کی بارگاہ کی حضوری کا شوق ہر شخص کے چہرے سے ظاہر ہوتا ہے، گویا کہ ہر شخص آپ کے جمال کے مشاہدہ سے بہرہ مند ہو رہا ہے جس کو اللہ دوست بنا لیتا ہے مخلوق کو اس کا شیدا بنا دیتا ہے۔ اس قسم کے کمالات محبوب الٰہی کے علاوہ دوسرے سے ممکن نہیں۔ سلطان

الشہدا نے بکمال شوق پر وردگار عالم کا مشاہدہ کرتے ہوئے جان قربان کی ۔اس وجہ سے ہر روز تازہ کرامات، تازہ ظہور، تازہ ذوق، تازہ حسن، تازہ عشق، تازہ درد، تازہ ساز، تازہ سوز اس محبوب رب العالمین کے راحت القلوب آستانہ پر متجلی ہے۔ داستان پنجم اس بیت پر ختم ہوتی ہے۔

از سر تا ناخن پایت سراسر ناز می بینم
کجا حدیست حسنت را ہنوز آغاز می بینم[۱۲]

مرآۃ مسعودی کے قلمی نسخے: مرآۃ مسعودی کے قلمی نسخے ہندوستان کے مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ کچھ مخطوطوں کی تفصیلات درج کی جاتی ہیں۔

(۱) خدا بخش لائبریری ، پٹنہ میں مرآۃ مسعودی کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے۔اس کا اندراج نمبر ۳۸۸۶، تعداداوراق ۵۴، سطر ۱۸، خط: نستعلیق ہے۔ نام کاتب فرزند حسین، تاریخ کتابت ۱۲۸۳ھ ہے۔

آغاز: الحمدللہ رب العالمین، عالم الغیب والشہادۃ وھو بکل شی ۔۔۔

انجام: ازسرتا ناخن پایت سراسر نازمی بینم
کجاحدیست حسنت راہنوز آغازمی بینم

(۲) کتاب خانہ مولانا آزاد، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں مرآۃ مسعودی کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے۔ اس کا اندراج نمبر Subhan Subhan Allah, Blog-Per ۶/۹۲۰ خط: نستعلیق، تعداد اوراق: ۱۷، سطر: ۱۴

آغاز: این نسخہ از این عبارت الحمدللہ رب العالمین عالم الغیب والشہادہ وھو بکل شیء محیط ۔۔۔

سید سالار مسعود غازی: سید سالار مسعود غازی حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم کے صاحبزادے حضرت امام محمد بن حنفیہ رضی اللہ عنہ کی نسل سے ہیں۔ آپ کی پیدائش ۲۱ رجب ۴۰۵ھ بمطابق ۱۰۱۵ء میں اجمیر شریف میں ہوئی۔ آپ کے والد کا نام سید سالار شاہو غازی فنون حرب وضرب میں بڑے ماہر اور غزنوی فوج کے ایک شجاع اور بہادر سپہ سالار تھے اور والدہ کا نام ستر معلیٰ تھا جو سلطان محمود غزنوی کی بہن تھیں۔ سید سالار مسعود غازی سلطان محمود غزنوی کے حقیقی بھانجے تھے۔ سید سالار مسعود غازی کا سلسلۂ نسب جو مرقوم ہے یہ ہے۔ سالار مسعود غازی بن سالار شاہو غازی بن عطاء اللہ غازی بن طاہر غازی بن طیب غازی بن محمد غازی بن عمر غازی بن ملک آصف غازی بن بطل غازی بن عبدالمنان غازی بن محمد بن حنفیہ غازی بن اسد الغالب علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ الکریم ہے۔ ہندوستان میں سید سالار غازی کو ناصر الاسلام والمسلمین، قائد الغزاۃ والمجاہدین، رافع لواء الاسلام، کاسر شوکۃ الاصنام وغیرہ

کے القاب سے جانا پہچانا جاتا ہے۔ جب کہ اہالیان ہند انھیں حضرت غازی میاں اور بالے میاں کے نام سے جانتے ہیں۔

سید سالار مسعود غازی نے صغرسنی میں ہی حضرت سید ابراہیم بارہ ہزاری سے علوم ظاہری و باطنی کا درس لیا۔ والد ماجد سالار شاہو غازی سے بیعت و خلافت حاصل کی۔ آپ نے نو سال کی عمر میں تیر اندازی، شہسواری اور فنون حرب وضرب میں مہارت حاصل کی۔ سید سالار مسعود غازی بچپن ہی سے نیک خصلت، تقوی شعار اور جذبۂ عبودیت سے سرشار تھے۔ آپ دس سال کی عمر کو پہنچے تو آپ کا ذوق عبادت و ریاضت اس قدر بڑھا کہ پوری پوری رات عبادت الٰہی میں مصروف رہتے اور دن میں روزانہ تلاوت قرآن، ذکر وفکر، درود خوانی میں مشغول رہتے۔ نماز چاشت بھی پڑھتے۔ روز مرہ کے ان معمولات سے فارغ ہونے کے بعد دیوان عام میں تشریف لاتے۔ دوپہر تک اس شمع ولایت کے گرد باکمال درویشوں اور اہل دل بزرگوں کی پروانہ وار بھیڑ لگی رہتی۔ علم ومعرفت، پند ونصائح، تصوف وسلوک پہ باہم گفتگو ہوتی، پھر حاضرین مجلس کو ساتھ لے کر دوپہر کا کھانا تناول فرماتے اور قیلولہ فرماتے۔ بعد نماز ظہر دیوان عام میں تشریف لاتے۔ افسران شاہی سے ملاقات کرتے۔ ہم عمر شہزادوں، امیرزادوں کے ساتھ سیر و شکار کے لیے نکل جاتے۔

سید سالار مسعود غازی پاکیزہ سیرت، بلند اخلاق اور عالی ہمت تھے۔ قدرت نے بڑی فیاض طبیعت عطا فرمائی تھی، ہر ملنے جلنے والے اور لشکریوں، فوجیوں کو انعام واکرام سے نوازتے رہتے، کبھی کسی کو محروم نہ کرتے، حسب ضرورت ولیاقت اسپ، جواہر وخلعت وشمشیر وخنجر عطا فرماتے۔ آپ کے اسی اخلاق کو دیکھ کر لوگ آپ کو فخر حاتم کہتے۔ آپ بہت خوش تقریر تھے، فصیح وبلیغ انداز میں مختلف امور وعلوم کے متعلق گفتگو ہوتی۔ کبھی امور سلطنت اور طریق جنگ موضوع بحث ہوتے، کبھی سلوک ومعرفت کا تذکرہ چلتا، کبھی شعر وادب اور دیگر علوم وفنون سے متعلق گفتگو ہوتی۔ ایسے نکات بیان فرماتے کہ اہل مجلس حیرت میں ڈوب جاتے۔ تقویٰ شعاری اور پرہیزگاری میں یکتائے روزگار تھے۔ لباس نفیس اور صاف و شفاف ہوتے، عطر وخوشبو کا نہایت شوق اور پان کا بہت ذوق تھا، جمال محمدی آپ کے چہرۂ انور سے ٹپکتا تھا۔

سید سالار مسعود غازی جس طرح اپنے دیگر اوصاف میں امتیازی شان رکھتے تھے، اسی طرح شجاعت و بہادری میں ممتاز تھے، آخر ایسا کیوں نہ ہو۔ آپ کو تو شجاعت و بہادری، اولوالعزمی اپنے جد امجد حضرت شیر خدا فاتح خیبر علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے ورثہ میں ملی تھی۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

علی کا گھر بھی وہ گھر ہے کہ جس گھر کا ہر اک بچہ

جہان پیدا ہوا شیر خدا معلوم ہوتا ہے

صاحب مرآۃ مسعودی لکھتے ہیں:

''رجب سالار ہٹیلہ جن کا نام عجب سالار غازی تھا، ہمراہ ستر معلّٰی غزنی سے اجمیر آئے تھے، اس وقت ان کی عمر بائیس سال سے زیادہ تھی، سالار مسعود غازی اور آپ کے ہم عمر امرا، بادشاہوں کے لڑکے جمع ہو کر شکار، سواری، تیر اندازی، نیزہ بازی کا ہنر ان سے سیکھتے تھے۔''[۱۳]

عہد طفولیت سے ہی تبلیغ دین اسلام اور جہاد فی سبیل اللہ کی محبت آپ کی رگوں میں رچ بس گئی تھی۔ چنانچہ اپنے ماموں سلطان محمود غزنوی کے زیر قیادت سومناتھ مندر کے فتح ہو جانے کے بعد غزنہ منتقل ہوئے اور تبلیغ اسلام و جہاد فی سبیل اللہ کے جذبہ سے سرشار گیارہ ہزار سوار پر مشتمل اسلامی فوج کی قیادت کرتے ہوئے کابل، جلال آباد، سندھ اور ملتان کے راستہ دہلی تشریف لائے۔ پھر میرٹھ اور قنوج ہوتے ہوئے سترکھ (جو بارہ بنکی کا مشہور قصبہ ہے) پہنچے۔ ان دنوں آپ کے والد سالار شاہو چوں کہ کشمیر کے پہاڑی علاقے کاہلیر کے گورنر تھے اس لیے آپ اپنی والدہ ستر معلّٰی کے ساتھ وہیں مقیم تھے۔

آئینۂ مسعودی اور دیگر کتب تاریخ کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ سترکھ میں اقامت کے دوران سید سالار مسعود غازی نے بارہ بنکی اور مضافات کے علاقوں میں اپنے خاص مصاحبین اور مبلغین کو دعوت و ارشاد پر مامور فرمایا۔ چنانچہ سالار سیف الدین اور سالار رجب کو اسلامی لشکر کی قیادت سونپتے ہوئے بہرائچ کے علاقہ کی طرف روانہ فرمایا۔

سلطان الشہدا کے مجاہدانہ کارناموں میں سے یہ بھی ہے کہ دریائے سندھ کے کنارے چند روز قیام کرنے کے بعد اپنی اگلی منزل کی طرف کوچ کیا اور چند دن میں خطہ ملتان پہنچے، جب سے سلطان محمود نے آخری بار ۱۰۱۲ء میں ملتان کو تاراج کیا تھا، اس وقت سے اب تک وہ ویران ہی تھا اور زمیندار رائے انگ پال جو خطۂ اوچ میں آ کر آباد ہو گیا تھا، اس نے آپ کے پاس اپنا قاصد بھیجا کہ پرائے ملک میں بے روک ٹوک داخل ہو گئے ہو یہ بڑی غیر مناسب اور بے باکی ہے، شاید زندگی سے عاجز آ گئے ہو۔

آپ نے فرمایا، ملک خدا کا ہے بندہ کا ملک نہیں ہوتا ہے، وہ جس کو چاہتا ہے اسے ملک پر قابض کر دیتا ہے، جد کریم اسد اللہ الغالب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے زمانہ سے ہمارے آبا و اجداد کا یہ طریقہ رہا ہے کہ ہم پہلے کافروں کو خدا کی وحدانیت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی دعوت دیتے ہیں، اگر انھوں نے اطاعت قبول کر لی یا ایمان لے آئے تو خیر ورنہ پھر فیصلہ تلوار سے ہوتا ہے۔ مسعودی لشکر نے انگ پال

کے بھاری لشکر کو شکست دی۔[۱۴]

سالار مسعود غازی نے چار مہینہ ملتان میں قیام کے بعد اجودھن کی طرف کوچ فرمایا اور اجودھن بغیر جنگ کے فتح ہوا۔اجودھن کا دوسرا نام پاک پٹن شریف ہے۔اجودھن بہت ہی سرسبز وشاداب اور دل کش جگہ تھی۔یہاں کی آب وہوا آپ کو بہت پسند آئی۔اجودھن کے فتح کے بعد سالار مسعود غازی نے دہلی کی طرف رخ کیا۔دہلی ہندوستان کا مرکزی مقام تھا،جس کا حاکم راجا مہیپال رائے تھا۔اس کی فوجی طاقت بہت زیادہ تھی۔تمام پڑوسی ریاستیں اور باہری حملہ آور بھی اس کے مقابل میں آنے سے گھبراتے تھے۔تاریخ فرشتہ میں ہے کہ تھانیسر کی فتح کے بعد سلطان محمود نے دہلی فتح کرنے کا ارادہ کیا لیکن امیروں ، وزیروں کے اس مشورے کو قبول کیا اور دہلی کی فتح کا ارادہ ترک کر کے واپس غزنی چلا آیا لیکن فارسی میں ایک کہاوت ہے کہ ''اگر پدر نتوانست پسر تمام کند'' سالار مسعود غازی اور مسعودی لشکر نے اپنی شجاعت و بہادری کے جوہر دکھاتے ہوئے بھوکے شیر کی طرح غنیم پر ٹوٹ پڑے ،حملہ اس قدر زوردار تھا کہ غنیم کو بھاگتے نہیں بن رہی تھی،مہیپال رائے وسری پال دونوں مارے گئے،ایک سخت مقابلہ اور جانی نقصان کے بعد بفضل خداوندی عظیم الشان فتح حاصل ہوئی اور دہلی کا تخت آپ کے قبضہ میں آ گیا۔

سید سالار مسعود غازی نے دہلی سے چھ ماہ سولہ روز کے بعد نصف ۱۰۲۹ء میں میرٹھ کی طرف کوچ فرمایا، میرٹھ اور اس کے اطراف و جوانب کے راجاؤں کو جب خبر ملی کہ سید سالار مسعود غازی اپنے جاں نثاروں کی فوج لے کر میرٹھ آ رہے ہیں تو وہ لوگ بہت گھبرائے کیوں کہ انھوں نے آپ کی شجاعت و بہادری اور فتح وظفر کے قصے سن رکھے تھے۔سارے راجاؤں نے عاقبت اندیشی سے کام لیتے ہوئے اپنی بھلائی اسی میں سمجھی کہ اطاعت وتابعداری کی پیش کش کی جائے،سارے راجاؤں نے اپنے اپنے ایلچیوں کو آپ کی خدمت میں بہت سے قیمتی تحفے دے کر بھیجا اور کہلایا کہ یہ ملک آپ ہی کا ہے،ہم آپ کی اطاعت اور تابعداری قبول کرتے ہیں۔

سید سالار مسعود غازی بدایوں سے آگے چل کر اور گنگا پار کر کے موجودہ فرخ آباد پہنچے۔یہاں سے نکلتے ہی شمالی ہند کی پرانی راجدھانی کمپلہ شہر جو اب اجڑ چکا ہے اور جہاں دروپدی کے قصے مشہور ہیں، ملتا ہے وہاں سے موجودہ قائم گنج فرخ آباد ہوتے ہوئے قنوج پہنچے،اس زمانہ میں قنوج شمالی ہند کا پایۂ تخت تھا۔اس وقت وہاں کا راجا رائے جیپال تھا۔چوں کہ پہلے سلطان محمود نے رائے جیپال حاکم قنوج کو جلاوطن کر دیا تھا،لیکن سید سالار شاہو کی سفارش سے اسے معاف کر کے ازسرنو قنوج کی حکومت دے دی تھی،اس احسان کی وجہ سے اس نے سلطان الشہدا سالار مسعود غازی کی آمد کی خبر سن کر اپنے بڑے لڑکے کے ساتھ

تحائف ارسال کیے اور امن کی درخواست کی،سلطان الشہدا نے اس کی درخواست قبول کی۔

سید سالار مسعود غازی قنوج سے بلگرام ، ملانواں ، سنڈیلہ، ملیح آباد ضلع ہردوئی اور بجنور، امیٹھی ضلع لکھنؤ ہوتے ہوئے دس روز میں ستر کھ پہنچے۔بقول مرآۃ مسعودی جب سید سالار مسعود غازی ستر کھ میں آئے تو ان کی عمر قریب اٹھارہ سال کی تھی یا یوں کہیے کہ ۱۰۳۱ء یا ۱۰۳۲ء میں وہ یہاں آئے۔

ستر کھ بارہ بنکی ضلع میں ایک مشہور قصبہ ہے، جو اس وقت ہندوستان کا مرکزی مقام تھا اور ہندوؤں کا بہت بڑا تیرتھ استھان تھا۔ایک مقامی روایت یہ ہے کہ یہاں رام جی اور لچھمن جی نے تعلیم پائی اور سات رشی کا یہاں استھان تھا،اس وجہ سے اس جگہ کا نام ست رشی مشہور ہوا، پھر رفتہ رفتہ کثرت استعمال سے ستر کھ ہو گیا اور ڈسٹرکٹ گزیٹیر نے ستر کھ کی وجہ تسمیہ یہ لکھی ہے کہ یہاں سورشی لوگوں کے استھان تھے زوربابا سورش منی رہتے تھے۔ستر کھ ایک آباد، پر رونق، انتہائی سرسبز وشاداب، پرفضا اور خوش نما علاقہ تھا، سیر وشکار کے لیے بھی ایک اچھی جگہ تھی، اس لیے یہ علاقہ آپ کو بہت پسند آیا اور یہاں پر قیام کر لیا، پھر یہیں سے اطراف کے علاقوں میں اسلام کی اشاعت کے لیے تبلیغی وفود بھیجے۔

مرآۃ مسعودی کے مطابق سالار سیف الدین اور ان کے معاون میاں رجب کوتوال نے بہرائچ پہنچ کر اطلاع دی کہ یہاں جنگل ہی جنگل ہے۔رسد ملتی نہیں۔لہٰذا کھانے کا غلہ روانہ کیا جائے۔سید سالار مسعود غازی کو جب سالار سیف الدین کی مخدوش حالت کی اطلاع ملی تو آپ پریشان ہو گئے۔الغرض رسد روانہ کرنے کے کچھ دنوں بعد پھر سالار سیف الدین کا پیام آیا جس میں اپنی موجودہ کیفیت لکھتے ہوئے بیان کیا کہ اس وقت ہندوؤں نے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔آپ ہماری امداد کریں۔سید سالار مسعود غازی نے جب اپنے والد بزرگوار سے بہرائچ جانے کی اجازت طلب کی تو آپ نے منع کر دیا۔والد محترم سے آپ نے کہا کہ میں بہرائچ میں ٹھہرنے کا ارادہ نہیں رکھتا ہوں۔ چند روز شکار کھیلنے کے لیے جانا چاہتا ہوں۔اسی دوران سالار سیف الدین کی مدد بھی ہو جائے گی۔

سید سالار مسعود غازی شعبان المعظم ۴۲۳ ہجری مطابق جولائی ۱۰۳۲ء، ۱۸ سال کی عمر میں بہرائچ تشریف لائے۔آپ کی آمد کی خبر سن کر جن جاگیرداروں نے سالار سیف الدین کا محاصرہ کر رکھا تھا وہ فرار ہو گئے۔تاریخ میں بہرائچ کے متعلق لکھا ہے کہ اس وقت بہرائچ جنگل ہی جنگل تھا۔اس میں چھوٹی چھوٹی بستیاں تھیں اور بہت سے چھوٹے چھوٹے خود مختار راجا تھے۔مہاراجا قنوج کے ساتھ سید سالار مسعود غازی کے اچھے تعلقات ہونے کے باوجود قنوج کے راجا نے اپنے ماتحت راجاؤں کو سید سالار مسعود غازی سے جنگ کرنے سے نہ روکا یا اس نے روکنا چاہا مگر نہ روک سکا۔

بہرائچ کی اس وقت یہ حالت تھی کہ وہ ''بہر'' قوم کی بستی تھی، جس کے نام پر اس کا نام 'بہرائچ' پڑا تھا۔ یہ لوگ ہندوستان کے قدیم باشندے تھے، جن پر آرین تہذیب اور شائستگی کا کم اثر ہوا تھا۔ وہ اپنے قدیم مذہب کے دلدادہ تھے۔ بہرائچ میں ''سورج کنڈ' ان کی پرستش کی ایک عظیم جگہ تھی، جس میں آفتاب پرستی بھی شامل تھی۔ سالار شاہو کے ناگہانی انتقال کے بعد سید سالار مسعود غازی نے سیر وشکار کو یکسر ترک کر دیا۔ اکثر اوقات آپ عبادت الٰہی اور تلاوت قرآن میں مشغول رہتے۔ روزانہ لنگر پکواتے اور غربا اور مساکین میں تقسیم کرا دیتے۔ تاریخ دانوں کے مطابق جس وقت سید سالار مسعود غازی علمائے کرام سے اپنا خواب بیان کر رہے تھے اس وقت بہرائچ کے راجگان مسلمانوں کے خلاف حرکت میں آنے کے بندوبست کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ رایت، سایت، ارجن، بھیکن اور دوسرے راجاؤں کے مشورے سے ایک پیغام تیار ہوا اور یہ پیغام ایک قاصد کو دے کر سید سالار مسعود غازی کے پاس روانہ کر دیا۔ قاصد جب سید سالار مسعود غازی کے سامنے پیش کیا گیا تو رکوع کی حد تک جھک گیا اور وہ اپنی زبان میں کچھ کہنے لگا۔ سید سالار مسعود غازی نے قاصد کی طرف خشمگیں نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا ''اس سے کہو ہمارا مذہب اس طرح سے جھکنے کی اجازت نہیں دیتا اور نہ ہی ہم کسی دوسرے کو اپنے آگے اس طرح جھکنے دیتے ہیں۔'' سید سالار مسعود غازی نے ترجمان سے کہا کہ وہ اس سے پوچھے کہ راجگان بہرائچ نے کیا پیغام بھیجا ہے۔ یہ خط تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہے جو اس طرح تھا:

''آپ ہمارے دیش سے چلے جائیں۔ یہ جگہ آپ کی سکونت کے لائق نہیں ہے۔ اگر نہیں جائیں گے تو جنگ کے لیے تیار ہو جائیں۔''[۱۵]

سید سالار مسعود غازی کا قیام خاص بہرائچ میں تھا۔ ڈسٹرکٹ گزٹ گونڈہ کے مطابق بہرائچ راجا سہردیو کی حکومت میں شامل تھا، جس کی راجدھانی ضلع گونڈہ تھی۔ سید سالار مسعود غازی نے سالاروں اور مشیروں کو بلایا اور ان سے قاصد کے درمیان ہونے والی گفتگو بتائی اور یہ بھی بتایا کہ راجگان بہرائچ کے علم کے نیچے چودہ سے بھی زیادہ راجا جمع ہو چکے ہیں، چنانچہ اس معاملے کو نپٹانے کے لیے ملک نیک بخت نامزد ہوئے۔ لہٰذا ان کو راجگان بہرائچ کے قاصد کے ساتھ بھیج دیا گیا۔ تاریخ کے مطابق ملک نیک بخت نے سید سالار مسعود غازی کا پیغام دیا کہ ہم یہاں آباد ہونے کے لیے نہیں آئے۔ تھوڑے دن شکار کھیلنے کے بعد چلے جائیں گے۔

بالآخر سارے راجاؤں نے صلاح مشورہ کے بعد ملک نیک بخت کو سید سالار مسعود غازی کے امن کے پیغام کا جواب جنگ دے کر رخصت کر دیا۔ ملک نیک بخت نے واپس آ کر مکمل رپورٹ پیش کی اور

راجا کا پیغام بھی۔ جس کے مطابق سید سالار مسعود غازی کو یہ دھمکی ملی تھی کہ وہ بہرائچ چھوڑ کر چلے جائیں۔ ورنہ جنگ ہی اس معاملہ کا فیصلہ طے کرے گی۔ سید سالار مسعود غازی نے اپنے احباب، سالار اور مشیر سے مشورہ کیا، جس میں یہ طے پایا کہ جب ہماری صلح کی پیش کش انھوں نے مسترد کر دیا ہے اور آمادۂ جنگ ہیں تو ہمیں یہاں رک کر ان کا انتظار نہیں کرنا چاہیے بلکہ جنگی نقطۂ نظر سے دشمنوں کو سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر اپنے دفاع اور بچاؤ میں جتنی جلد ہو سکے غنیم پر حملہ کر کے زیر کر لیا جائے۔

کسی بھی مورخ نے سید سالار مسعود غازی کے لشکر کی تعداد بیان نہیں کی ہے۔ صاحب مرآۃ مسعودی نے سید سالار مسعود غازی کے لشکر کی تعداد لاکھوں بیان کی ہے، جو مبالغہ آمیز معلوم ہوتی ہے۔ اتنی فوج تو سلطان محمود غزنوی جیسے جاہ وجلال والے شاہ کو میسر نہ ہو سکی تو سید سالار مسعود غازی کو کہاں سے مل جاتی۔ ادھر ہندو سینا بھی سید سالار مسعود غازی کی آمد سن کر اپنی فوج کو میدان میں اتار چکی تھی۔ مسلمانوں نے آگے بڑھ کر دشمنوں کے لشکر کو سنبھلنے کا موقع نہ دے کر یلغار کر دیا۔ بہرائچ کے راجگان کے لشکر کی تعداد کئی گنا زیادہ تھی۔ اس کے باوجود مسلمان ان کے حملے روکتے ہوئے بڑھ چڑھ کر حملہ کر رہے تھے۔ سہ پہر کے قریب دشمن کے لشکر میں ہر طرف افراتفری کا عالم برپا ہو چکا تھا۔ افغان اور ترک مجاہدوں نے دشمن کی اس گھبراہٹ اور افراتفری سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور اپنی پوری قوت کے ساتھ دشمن کے لشکر کو شکست دی۔ فارسی کی کہاوت ہے کہ 'تنگ آید بجنگ آید' سید سالار مسعود غازی نے بہرائچ کے راجاؤں کو امن وامان کا پیغام دیا۔ مگر فرعون مزاج راجاؤں نے امن کے اس پیغام کو ٹھکرا دیا۔ ہندوؤں کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ اٹھارہ سالہ نوجوان جس کی فوج نہ کے برابر ہے وہ اس قدر ہمت واستقلال کا مظاہرہ کرے گا اور ان پر یلغار کر دے گا۔[۱۶]

سید سالار مسعود غازی میدان جنگ سے واپس ہوئے تو سورج کنڈ کے کنارے ایک مہوا کا درخت تھا۔ اس کے نیچے آرام کے لیے اپنا خیمہ لگوانا پسند کیا۔ تاریخی شواہد کے مطابق اس جگہ کے متعلق آپ اکثر کہا کرتے تھے کہ اس درخت کی چھاؤں مجھے بڑی پرسکون معلوم ہوتی ہے اور اس جگہ سے مجھے محبت کی بو آتی ہے۔ یہ کس کو معلوم تھا کہ دار الفنا سے روانگی کے بعد قیامت تک ان کو اس جگہ آرام پذیر ہونا پڑے گا۔ مورخ لکھتے ہیں کہ سید سالار مسعود غازی کو یہ جگہ اتنی پسند آئی کہ آپ نے یہاں اپنے ملک کی طرز پر ایک باغ لگوانا شروع کر دیا اور اپنا زیادہ وقت یہیں صرف کرنے لگے۔ آپ اس باغ کی درستگی میں اتنے منہمک ہوئے کہ اکثر اوقات کی نماز بھی یہیں ادا کرتے تھے۔

مسلمانوں سے شکست کھانے کے بعد راجگان بہرائچ آرام سے نہیں بیٹھے۔ انھوں نے شب وروز

ایک کر کے اپنی منتشر فوج کو اکٹھا کیا اور مدد کے لیے ہندوستان کے کئی راجاؤں کے پاس ایلچی روانہ کیے، لشکر کی فراہمی کے بعد ان راجاؤں نے ایک جنگی کونسل منعقد کی، جس میں ہر راجا کو کھلے دل سے بولنے کی اجازت دی گئی اور ہر اس نقطۂ نظر پر بحث کی گئی جس سے شکست کھانے کا ذرہ برابر بھی امکان تھا۔ راجاؤں سے کہا گیا کہ ان کے ذہن میں کوئی ایسی ترکیب ہو جس سے دشمنوں کو نقصان پہنچایا جاسکے۔ چنانچہ راجا سہر دیو اور دیگر راجاؤں نے اپنے مفید مشوروں سے صدر مجلس کو نوازا اور یہ فیصلہ ہوا کہ جنگ کی تیاری کرنے کے بعد سالار مسعود غازی کو میدان جنگ میں للکارا جائے۔

مورخ عبدالرحمن چشتی کے مطابق اس جنگ میں حصہ لینے کے لیے بہرائچ کے اکیس راجگان جمع ہوئے تھے، جن کے نام رایت، سایت، رائے ارجن، رائے لکن، رائے بھگن، رائے کرن، رائے کلیان، رائے مردان، رائے نکڑو، رائے دھرمل، رائے اجے پال، رائے کرن، رائے ہرکشن، رائے دیونرائن، رائے نرسنگھ، رائے مورائے، بھردیو، رائے صاحب اور دیورائے بھا بھر شامل ہیں۔ اس کے علاوہ گونڈہ، بستی، بہرائچ، گورکھپور کے دوسرے کئی تعلق دار مثلاً رائے شنکر، رائے بیربل، رائے شری پال، رائے ہری کرن، رائے ہرکو، رائے نرہر، رائے ہرپال، رائے اجودھاری اور رائے دیو وغیرہ اپنی فوج کے ساتھ راجگان بہرائچ سے جا ملے۔ پہلی جنگ سے فراغت کے بعد سید سالار مسعود غازی اپنا زیادہ وقت یہیں باغیچہ کی دیکھ ریکھ میں صرف کرتے تھے۔ ایک روز آپ کو اطلاع ملی کہ راجگان بہرائچ کا قاصد آیا ہے جسے آپ نے باغیچہ میں ہی بلوالیا اور اس سے پیغام لے کر ترجمان کے حوالے کر دیا کہ وہ پڑھ کر سنائے۔ تاریخ میں یہ خط بھی محفوظ ہے۔ تاریخ کے مطابق خط میں لکھا تھا:

''اگر تم جان کی خیریت چاہتے ہو تو دریائے سرجو کے اس پار چلے جاؤ۔''

سید سالار مسعود غازی نے قاصد سے کہا کہ وہ راجگان بہرائچ سے جا کر کہہ دے کہ ملک خدائے وحدہٗ لاشریک کا ہے جسے چاہے عطا فرمائے۔ اللہ کے فضل و کرم سے اب تک ہمارے قدم پیچھے نہیں ہٹے اور ان شاء اللہ نہ ہی اب پیچھے ہٹیں گے۔ قاصد کو روانہ کرنے کے بعد سید سالار مسعود غازی نے اپنے سالاروں، مشیروں سے مشورہ کیا۔ سبھی لوگ اس فیصلے پر متفق ہو گئے کہ مخالفین کا بہرائچ آنا ٹھیک نہیں ہے۔ ہمیں خود دشمن کے گڑھ میں گھسنا ہوگا۔ راجگان بہرائچ کی فوج اور مسعودی لشکر کے درمیان جنگ ہوئی، جب دریائے بھکلہ کے نزدیک پہنچے تو لشکر پر آتش بازی اور لوہے کی کیلوں سے بہت زبردست نقصان پہنچا۔ ابتدا میں کثرت سے مسلمانوں کو شہادت کا جام نوش کرتے ہوئے دیکھ کر ہندو راجا ایک دوسرے کو یہ اطمینان دلا رہے تھے کہ اب فتح میں زیادہ دیر نہیں ہے لیکن سید سالار مسعود غازی کی اس شجاعت نے تمام

لشکر میں ایک نئی روح پھونک دی۔ دشمن جو اپنی فتح کے متعلق پر امید ہو چکا تھا اب تیزی سے پیچھے ہٹنے لگا۔ آخر سید سالار مسعود غازی نے راجگان بہرائچ اور دیگر راجا کو شکست دی اور فتح و کامرانی دوبارہ آپ کے قدم بوس ہوئی۔ بہرائچ کے راجگان پر یہ دوسری شکست قیامت بن کر ٹوٹی۔ انھیں یقین نہیں ہو رہا تھا کہ شکست سے دوچار ہو چکے ہیں۔ وہ بھی اٹھارہ یا انیس سالہ نوجوان کے ہاتھوں۔ اپنی پہلی شکست کو فتح میں تبدیل کرنے کے لیے انھوں نے بڑی لمبی لمبی کانفرنسیں کی تھیں۔

سید سالار مسعود غازی کو یہ خبر ملی کہ کفار و مشرکین ہمیں نیست و نابود کر دینے کی قسم کھا کر بہت بڑی جمعیت اور بھرپور جنگی تیاری کے ساتھ ہم پر حملہ آور ہونے والے ہیں۔ گزشتہ جنگوں میں آپ کے اکثر رفقا شہید ہو چکے تھے، بچی کھچی فوج راجاؤں کی متحدہ کثیر فوج کے مقابلہ کے لیے بہت کم اور ناکافی تھی۔ آخر ایک دن سید سالار مسعود غازی نے اپنے باقی ماندہ لشکر کو اکٹھا کیا اور ایک دل دہلا دینے والا پر جوش خطبہ دیا۔ تاریخ کے مطابق سید سالار مسعود غازی نے حمد وصلوٰۃ کے بعد کہا: میرے عزیزو اور دوستو! آپ لوگ اچھی طرح واقف ہیں کہ ہمارا یہ سفر اشاعت دین حق اور اعلاء کلمۃ الحق کے لیے ہے۔ لوٹ مار، قتل و غارت گری کو ہمارے اس مقدس اور پاکیزہ مقصد سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔ ہم نے از خود شمشیر نہیں اٹھائی۔ جب بھی طاقت و قوت اور شمشیر کے ذریعہ ہمیں اشاعت دین حق سے روکنے کی سعی کی گئی تو ہم نے اپنے دفاع میں تلوار کا سہارا لیا۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم ہمیشہ کامیاب و کامران رہے۔ ہم راہ حق کے مسافر ہیں ہمارے آبا و اجداد کا وطیرہ رہا ہے کہ میدان جنگ سے منھ نہیں موڑتے۔ اس لیے میرا یہاں قائم رہنا ضروری ہے۔ مگر میں نہایت خوشی سے اجازت دیتا ہوں کہ جس کا جی چاہے وہ یہاں سے واپس چلا جائے۔ اس کو ضرورت کے مطابق خزانے سے رقم دے دی جائے گی۔ اس کے علاوہ اگر کسی کو میری طرف سے کوئی تکلیف پہنچی ہو تو میں اس سے معافی کا خواستگار ہوں۔ میں اپنے تمام ساتھیوں کا جو شہید ہو چکے ہیں اور جو موجود ہیں سبھی کا احسان مند اور مشکور ہوں کہ حق وصداقت کی اس راہ میں بھرپور خلوص اور سچی وفاداری کے ساتھ میرے مددگار رہے۔ میں بہر حال دشمنوں کا مقابلہ کروں گا اور حق وصداقت کی راہ پر سب کچھ نچھاور کر دوں گا۔ سید سالار مسعود غازی نے دعا کے بعد لشکر کو تیاری کا حکم دیا اور لشکر کے بائیں بازو پر امیر نصر اللہ اور دائیں بازو پر رجب سالار کو مقرر کیا اور بیچ میں خود تشریف فرما ہوئے۔ ایک دستہ کو بطور ہراول کے مقرر کر کے حکم دیا کہ وہ بہرائچ سے دو کوس چل کر لشکر چوکی قائم کرے اور عبادت الٰہی میں مشغول ہو گئے۔

سید سالار مسعود غازی کو جیسے ہی دشمن کے حملہ کی اطلاع ہوئی آپ لشکر کے ہمراہ فوراً روانہ ہو گئے

اور سورج کنڈ پر پڑاؤ ڈالا۔ آپ نے لشکر کو یلغار کا حکم دیا اور چند لمحے میں زمین و آسمان آہ و فغان سے بھر گیا۔ فوج بڑی ہی مستعدی سے ایک دوسرے پر حملہ کرنے لگے۔ مجاہدین اسلام جوق در جوق نشۂ شہادت میں مست ہو کر دشمنوں کے درمیان گھسے جا رہے تھے۔ دو پہر تک دو تہائی مسلمان شہید ہو گئے۔ سید سالار مسعود غازی کے حکم سے شہدائے کرام کو سورج کنڈ میں دفن کر دیا گیا کیوں کہ چاروں طرف سے ہندو سینا ان کو گھیرے ہوئے تھی۔ اتنا موقع اور وقت نہیں تھا کہ قبریں تیار کی جاتیں۔

مرآۃ مسعودی کے مطابق جب سورج کنڈ میں بھی جگہ نہ رہ گئی تو اس خیال سے کہ لاشیں مخالفین کے ہاتھوں نہ جائیں ان کو کنوؤں اور غاروں میں دفن کیا گیا۔ ان کی نماز جنازہ خود سید سالار مسعود غازی نے پڑھائی۔ سید سالار مسعود غازی شہدائے کرام کو دفن کرنے میں مصروف تھے کہ آپ کو اطلاع ملی کہ سالار سیف الدین سرخرو نے جام شہادت نوش کر لیا ہے۔ یہ سید سالار مسعود غازی کے دست راست تھے اور ہر مشورہ میں شریک رہتے۔ مورخوں کے مطابق ان کو بہرائچ شریف سے اتر و پورب کی جانب بارہ میل کے فاصلہ پر موضع ڈکول میں دفن کیا گیا۔ دن بھر جنگ ہوتی رہی اور مسلمان میدان حرب میں شہید ہوتے رہے۔ دوسرے دن پھر جنگ کی بھٹی گرم ہوئی۔ ہندو سینا تعداد میں بہت زیادہ تھی۔ جب کہ سید سالار مسعود غازی کی فوج تھوڑی تعداد میں رہ گئی تھی۔ دو پہر تک دو تہائی مسلمانوں کے شہید ہو جانے کی وجہ سے مسلمانوں کے قدم ڈگمگانے لگے۔

جب سہر دیو نے دیکھا کہ مسلمانوں کی کمر ٹوٹ چکی ہے۔ ان کے نامی گرامی جرنیل شہید ہو چکے ہیں، تو اس نے چاروں طرف سے نرغہ کر کے تیر اندازی کا حکم دے دیا۔ مسلمانوں کی بچی کھچی فوج کو دشمن کے تیر انداز دستے گھیر گھیر کر شہید کرنے لگے۔ گھوڑوں کے میدان کے اندر ادھر ادھر بھاگنے کے باعث گرد و غبار کا طوفان بادلوں کی طرح آسمان کی طرف اٹھ رہا تھا۔ اس گرد و غبار کا فائدہ اٹھاتے ہوئے سہر دیو نے ایک چال چلی۔ اس نے اپنے خاص دستوں کو ساتھ لیا اور اس سمت بڑھنے لگا جس طرف سید سالار مسعود غازی جنگ میں مصروف تھے۔ آخر سید سالار مسعود غازی کے قریب ایک ٹیلے کے پاس پہنچا اور چھپ کر ایسا تیر مارا کی شہ رگ کو چیرتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔ سید سالار مسعود غازی کو تیر لگنے کی وجہ سے پورا جسم خون سے رنگین ہو گیا اور گھوڑی پر بیٹھنے کی طاقت نہ رہی۔ سکندر دیوانہ نے آپ کو گھوڑی کی پیٹھ سے اتارا اور سورج کنڈ کے قریب مہوئے کے نیچے جس چبوترہ پر آپ آرام فرمایا کرتے تھے اس پر لٹا دیا۔ آپ کا سر مبارک اپنے زانوں پر رکھ کر زار و قطار رونے لگے۔

سید سالار مسعود غازی نے سکندر دیوانہ کے رونے کی آواز سنی تو آپ نے آنکھ کھولی۔ انھیں دیکھ کر

مسکرائے اور کلمۂ طیبہ کا ورد کیا اور اپنے معبود حقیقی کی بارگاہ میں اپنی جان عزیز کا نذرانہ پیش کر دیا۔ ایسے ہی موقع کے لیے علامہ اقبال نے کہا ہے ؎

نشان مرد مومن با تو گویم
چون مرگ آید تبسم بر لب اوست

مرآۃ مسعودی نے سید سالار مسعود غازی کی عمر ۱۹ر سال تحریر کی ہے۔ آپ چودہ رجب ۴۲۴ھ/ ۱۰۳۳ء کو جب کہ آپ کی عمر کے انیس سال پورے ہونے میں ابھی ایک ہفتہ باقی تھا، بروز اتوار عصر و مغرب کے مابین اپنے عاشق زار سکندر دیوانہ کے زانو پہ سر رکھے ہوئے راہی ملک بقا ہوئے۔ سلطان الشہدا سید سالار مسعود غازی کمال ظاہر و باطن کا دل کش نمونہ تھے، دین کے مجاہد اور غازی تھے۔ معرفت خداوندی اور محبت الٰہی کے نور سے آپ کا سینہ معمور تھا۔

لطائف اشرفی مترجم جلد سوم ص ۲۸ پر مرقوم ہے کہ حضرت مخدوم اشرف جہاں گیر سمنانی فرماتے ہیں کہ اتفاقاً حضرت سید سالار مسعود غازی کے مزار مبارک کی زیارت کے لیے بہرائچ جانے کا اتفاق ہوا۔ تاریخ مرآۃ سکندری میں لکھا ہے کہ حضرت شاہ محبوب عالم گجراتی قدس سرہ فرماتے ہیں کہ جب اکثر لوگ اپنی حاجات قطب الاولیا حضرت خواجہ معین الدین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں، حضرت خواجہ ان کو سالار مسعود غازی کی روحانیت کے حوالہ کر کے خود آزاد ہو جاتے ہیں۔

سلطان الشہدا سید سالار مسعود غازی کا روحانی مقام اتنا بلند ہے کہ حکومت و سلطنت کے تاجدار اور روحانیت و ولایت کے علمبردار عقیدت و محبت کے ساتھ حاضر ہو کر اکتساب فیض کیا کرتے تھے۔ دنیا کے عظیم ترین سیاح ابن بطوطہ نے اپنے مشہور سفر نامہ میں لکھا ہے کہ پھر بادشاہ محمد شاہ تغلق نے بہرائچ کی طرف جانے کا ارادہ کیا۔ یہ ایک خوب صورت شہر دریائے سرجو کے کنارے واقع ہے، سرجو ایک بڑا دریا ہے جو اکثر اپنے کنارے گراتا رہتا ہے، بادشاہ نے سالار مسعود غازی کی قبر کی زیارت کے لیے دریا پار کیا، سالار مسعود غازی نے اس نواح کے اکثر ملک فتح کیے تھے۔

۱۶۵۸ء سے ۱۷۰۷ء کے درمیانی زمانہ میں اورنگ زیب عالم گیر دہلی سے بہرائچ آیا، قلعہ درگاہ شریف سے باہر شمال مغرب گوشہ پر مسجد عالم گیری کے نام سے تعمیر کرائی جو اس کی یادگار ہے۔ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ میں غازی میاں کا مقالہ نگار لکھتا ہے کہ التمش کا بیٹا نصیر الدین محمود دہلی سلطنت کا شہزادہ تھا، جس نے بہرائچ میں اقامت اختیار کی، اس کی صوبہ داری کے زمانہ میں بہرائچ کے اطراف میں مسلمانوں کی بستیاں قائم ہوئیں۔ سید سالار مسعود غازی کے مزار پر پختہ عمارت سب سے پہلے نصیر الدین محمود نے تعمیر

کرائی تھی۔ محمد بن تغلق دہلی کا اولین سلطان تھا، جو مزار کی زیارت کے لیے آیا تھا، فیروز شاہ تغلق بھی زیارت کے لیے بہرائچ آیا تھا۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے بعض عمارتیں، کنویں، قبرستان اور برآمدے تعمیر کرائے تھے۔ برصغیر میں سید سالار مسعود غازی کا مقبرہ ایک مقبول ترین زیارت گاہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ شمالی ہند بالخصوص پروانچل کے خطوں میں سید سالار مسعود غازی اور ان کے ساتھی غازیان اسلام کی تبلیغ اور جہاد نے اسلام کی اشاعت میں بنیادی کردار ادا کیا ہے، جس کی واضح دلیل وہ قدیم مزارات ہیں جن کے بارے میں تاریخ سے بھی کچھ اشارے ملتے ہیں اور سینہ بہ سینہ روایات بھی چلی آ رہی ہیں کہ یہ غازی میاں کے ساتھی شہیدوں کے مزار ہیں، جن میں سے کچھ مزارات متعین ناموں سے مشہور ہیں اور کچھ سید بابا اور شہید بابا کے عمومی ناموں سے جانے جاتے ہیں۔ پروانچل کے مختلف شہروں، قصبوں اور دیہاتوں میں غازی میاں کے علامتی مزارات اور ان پر لگنے والے صحبت کے وہ میلے ہیں جو غازی میاں کے سالانہ عرس یا سالانہ میلے کے موقع پر دھوم دھام اور انتہائی عقیدت سے منعقد ہوتے ہیں۔[۱۷]

بلاشبہ سید سالار مسعود غازی اور ان کے رفقا کی ایمان افروز شہادت نے ہندوستانی مسلمانوں کے دلوں میں ایمان وعقیدہ کی آبیاری کی۔ یقیناً آج بھی ان سب کے دلوں پر آپ کی حکمرانی کارفرما نظر آتی ہے۔

☆☆☆

حوالہ جات:

۱۔ شیخ عبدالرحمن، مرآۃ الاسرار، نسخۂ خدابخش لائبریری، پٹنہ، برگ ۵۱۳

۲۔ شیخ عبدالرحمن، مرآۃ الاسرار، مترجم، مولانا الحاج کپتان واحد بخش سیال چشتی صابری، ادبی دنیا، دہلی، ۲۰۰۵ء، ص ۲۲

۳۔ شیخ عبدالرحمن، مرآۃ الاسرار، مترجم: مولانا الحاج کپتان واحد بخش سیال چشتی صابری، سعی و اہتمام: خواجہ حسن ثانی نظامی، درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا، نئی دہلی، ۲۰۱۰ء، ص ۱۹

۴۔ شیخ عبدالرحمن، مرآۃ الاسرار، مترجم: مولانا الحاج کپتان واحد بخش سیال چشتی صابری، سعی و اہتمام: خواجہ حسن ثانی نظامی، درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا، نئی دہلی، ۲۰۱۰ء، ص ۴۱۷

۵۔ نگاہی بہ تاریخ ادب فارسی در ہند، توفیق سبحانی، شورای گسترش زبان و ادبیات فارسی، ۱۳۷۷ق، ص ۴۸۳

۶۔ انوار مسعودی، مولانا محمد علی مسعودی، مسعودیہ رضویہ دارالتحقیق، درگاہ شریف بہرائچ، ۲۰۱۱ء، ص

۳۵۴-۳۵۵

۷۔ مرآۃ مسعودی، خدابخش لائبریری، پٹنہ، اندراج نمبر ۳۸۸۶

۸۔ انوار مسعودی، مولانا محمد علی مسعودی، مسعودیہ رضویہ دارالتحقیق، درگاہ شریف بہرائچ، ۲۰۱۱ء، ص ۳۵۶-۳۶۷

۹۔ مرآۃ مسعودی، خدابخش لائبریری، پٹنہ، اندراج نمبر ۳۸۸۶۔

۱۰۔ انوار مسعودی، مولانا محمد علی مسعودی، مسعودیہ رضویہ دارالتحقیق ، درگاہ شریف بہرائچ، ۲۰۱۱ء، ص ۳۹۳-۳۷۹

۱۱۔ مرآۃ مسعودی، خدابخش لائبریری، پٹنہ، اندراج نمبر ۳۸۸۶

۱۲۔ انوار مسعودی، مولانا محمد علی مسعودی، مسعودیہ رضویہ دارالتحقیق ، درگاہ شریف بہرائچ، ۲۰۱۱ء، ص ۴۳۶-۴۲۱

۱۳۔ انوار مسعودی، مولانا محمد علی مسعودی، مسعودیہ رضویہ دارالتحقیق، درگاہ شریف بہرائچ، ۲۰۱۱ء، ص ۱۵۴

۱۴۔ انوار مسعودی، مولانا محمد علی مسعودی، مسعودیہ رضویہ دارالتحقیق ، درگاہ شریف بہرائچ، ۲۰۱۱ء، ص ۱۷۸-۱۷۷

۱۵۔ غازی، توحید احمد نظامی، جمد اشاہی بستی، ۲۰۰۹ء، ص ۷۸

۱۶۔ غازی، توحید احمد نظامی، جمد اشاہی بستی، ۲۰۰۹ء، ص ۸۱-۸۲

۱۷۔ غازی، توحید احمد نظامی، جمد اشاہی بستی، ۲۰۰۹ء، ص ۵

☆☆☆

شہباز حسین رضوی
شگفتہ منزل، عالم گنج، پٹنہ، رابطہ نمبر:6200515337

غالبؔ کا شعری اختصاص

تلخیص:

غالبؔ وہ عظیم شاعر ہیں کہ آج تک جتنے مقالے اور مضامین ان کی شخصیت اور شاعری سے متعلق لکھے گئے، اتنے کسی دوسرے شاعر کی زندگی اور اس کے کارناموں پر نہیں لکھے گئے۔ اردو میں بے شمار کتابیں اس پر لکھی گئیں اور ناقدوں نے تنقید کیا۔ جتنی اس پر تنقیدیں ہوتی گئیں، وہ اور بھی اُبھرتا اور نکھرتا چلا گیا۔ حالیؔ نے 'یادگارِ غالب' لکھ کر لوگوں کے ذہن کو غالبؔ کی جانب مبذول کرایا۔ 'یادگارِ غالب' نے غالبؔ کو صرف ادبی دنیا سے روشناس ہی نہیں کرایا بلکہ ان کی شاعری کی حقیقت کا احساس لوگوں کے دل و دماغ میں پیدا کیا۔

غالبؔ کی شاعری کا ایک نمایاں پہلو منطقی استدلال ہے۔ دراصل یہ غالبؔ کی تخیلی فکر ہی کی ایک شکل ہے۔ جہاں کہیں ان کے یہاں منطقی استدلال ملتا ہے، وہ صاف، سیدھا اور قطعی نہیں ہوتا بلکہ رمزیت اور ایمائیت کا جامہ زیب تن کیے ہوتا ہے۔ ان کا اصل مقصد تو طلسمی سماں باندھنا ہے تاکہ شعریت پیدا ہو۔ غالبؔ کی شاعری کی اساسی حقیقت تخیلی فکر اور جذبہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں وہ مطرب ہوں جس کے سازِ خیال کو جذبے کا تار چھیڑتا ہے، تب اس میں سے نغمے پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ غالبؔ نے تخیلی فکر اور جذبے کے امتزاج اور توازن سے ایک نئی شاعرانہ صداقت تخلیق کی ہے۔

اجتماعی شعور غالبؔ کے یہاں اتنا بڑھا ہوا ہے کہ وہ اپنی غزلوں میں زندگی کا مرثیہ لکھنے لگے ہیں۔ کہنے کے لیے تو یہ غزل کا اسلوب ہے، لیکن ذرا غور سے دیکھا جائے تو اس میں اُس زمانے کے سماجی حالات، اس کے بنیادی معاملات اور اساسی مسائل بے نقاب ہوتے نظر آتے ہیں۔ غرض غالب نے غزل کو جو تخیل اور معنی آفرینی بخشی وہ انھیں کا خاصہ ہے۔

کلیدی الفاظ:

غالبؔ، حالیؔ، یادگار غالب، منطقی استدلال، رمزیت و ایمائیت، مطرب، ساز خیال، اجتماعی شعور، استفہامیہ لب ولہجہ۔

....

غالبؔ وہ عظیم شاعر ہیں کہ آج تک جتنے مقالے اور مضامین ان کی شخصیت اور شاعری سے متعلق لکھے گئے، اتنے کسی دوسرے شاعر کی زندگی اور اس کے کارناموں پر نہیں لکھے گئے۔ اردو میں بے شمار کتابیں اس پر لکھی گئیں اور ناقدوں نے تنقید کیا۔ جتنی اس پر تنقیدیں ہوتی گئیں، وہ اور بھی اُبھرتا اور نکھرتا چلا گیا۔ حالیؔ نے 'یادگارِ غالب' لکھ کر لوگوں کے ذہن کو غالبؔ کی جانب مبذول کرایا۔ 'یادگارِ غالب' نے غالبؔ کو صرف ادبی دنیا سے روشناس ہی نہیں کرایا بلکہ ان کی شاعری کی حقیقت کا احساس لوگوں کے دل و دماغ میں پیدا کیا۔ غالبؔ کے متعلق چند ناقدوں کے اقتباسات دیکھیے۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کا یہ مشہور مقولہ ہے جس نے لوگوں کو چونکا دیا:

''ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں: ''وید مقدس'' اور ''دیوانِ غالب۔''

رشیدؔ احمد صدیقی کا کہنا ہے:

''مجھ سے اگر پوچھا جائے کہ ہندوستان کو مغلوں نے کیا دیا؟ تو میں بے تکلف تین نام لوں گا۔ غالبؔ، اردو اور تاج محل۔''

اخترؔ اورینوی اپنے مقالہ میں یوں رقم طراز ہیں:

''اردو شاعری میں غالبؔ کا مقام بہت بلند ہے۔''

آلِ احمد سرورؔ صاحب لکھتے ہیں:

''اردو میں پہلی بھرپور اور رنگا رنگ شخصیت غالبؔ کی ہے۔ ان سے پہلے کئی شاعروں کی شخصیت قابلِ توجہ ضرور ہے مگر ان میں سے کسی میں اتنی رعنائی اور رنگینی نہیں۔''

پھر ایک مقام پر سرورؔ صاحب لکھتے ہیں:

''غالبؔ کی ترکیبوں، تشبیہوں اور استعاروں پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ غالبؔ نے ایک طور پر ایک دوسرا شاعرانہ سانچا ایجاد کیا۔ اردو زبان میں روانی اور سلاست پہلے ہی آچکی تھی۔ جذبات کے اظہار کے لیے موزوں بھی ہو چکی تھی مگر بڑے بڑے فلسفیانہ خیالات کے اظہار کے قابل اسے غالبؔ ہی نے بنایا۔''

مزید لکھا ہے:

’’ان کا سر کسی اور کے کندھوں پر نہیں۔‘‘

رشیدؔ احمد صدیقی کا ایک قول یہ بھی ہے:

’’یہ غالب ہی کا کارنامہ تھا جس نے غزل کو ہمارا کلچر اور ہمارے کلچر کو غزل بنا دیا۔‘‘

احتشام حسین کا خیال ہے کہ:

’’غالبؔ کا ذہن تعمیر کے بعد تخریب کو دیکھ لیتا تھا۔ ترقی کے بعد زوال کا اندازہ کر لیتا تھا، لیکن تخریب کے بعد تعمیر اور زوال کے بعد نئی ترقی کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے اسباب بھی اس دور کی لٹتی ہوئی قدروں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ ورنہ غالبؔ تو آدم کے بعد نئے آدم اور قیامت کے بعد نئی دنیا کی پیدائش کے قائل تھے۔

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا غالبؔ
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

عبادتؔ بریلوی کی نظر میں:

’’غالبؔ کا عشق ایک بڑے باشعور انسان کا عشق ہے۔ ایک ایسا انسان جو اپنے دَور کی پیداوار بھی ہوتا ہے، اسے خواہش پرستی عام سماجی بندھنوں سے آزاد نہیں کر سکتی ہے بلکہ وہ اس عشق میں مروجہ اخلاقی اقدار کا بھی خیال رکھتا ہے، جو معشوق کو صرف لذّت کا آلۂ کار ہی نہیں سمجھتا، سماج کا ایک فرد بھی سمجھتا ہے۔‘‘

کلیمؔ الدین احمد کی رائے ہے:

’’غالبؔ کے آرٹ کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے غزل، خصوصاً شعر مفرد کی تنگی کو وسعت میں تبدیل کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ دو مصرعوں کی کیا بساط ہے۔ اس میں گنجائش بہت کم ہے۔ کسی چیز کو پورے طور پر بیان کرنا ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ غالبؔ نے اس مشکل کو آسان کرنے میں دوسرے شاعروں کے مقابلے میں زیادہ کامیابی حاصل کی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ آدمی کو انسان ہونا میسر ہو یا نہ ہو، غالبؔ کے اشعار کو نظمیت میسر ہے۔‘‘

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

غالبؔ کی شاعری کا ایک نمایاں پہلو منطقی استدلال ہے۔ دراصل یہ غالبؔ کی تخیّلی فکر ہی کی ایک شکل

ہے۔ جہاں کہیں ان کے یہاں منطقی استدلال ملتا ہے، وہ صاف، سیدھا اور قطعی نہیں ہوتا بلکہ رمزیت اور ایمائیت کا جامہ زیبِ تن کیے ہوتا ہے۔ ان کا اصل مقصد تو طلسمی سماں باندھنا ہے تا کہ شعریت پیدا ہو۔

آہنگ تضاد حسنِ کلام کا زیور ہے۔ یہ تضاد نگاری غالبؔ کے ذہن کی کوئی عارضی اور اتفاقی کیفیت نہیں بلکہ ان کے حسنِ بیان کا مستقل اصول ہے۔ غالبؔ کی دُور بینی اور ژرف نگاہی گلوں کے رنگوں کے اختلاف میں بہار کا اثبات کرتی تھی اور یہی وہ چاہتے تھے۔ ان کا بیدار تخیل ایک ہی وقت میں حقیقت کے مختلف پہلو اور اس کی مختلف تہیں دیکھ لیتا تھا۔ اس تضاد پسندی کے ذریعہ انھوں نے حقیقت کی پیچیدگیوں کو نمایاں کیا ہے۔ ان کی تخیلی فکر کے لیے اضداد کو ایک جگہ جمع کر دینا بڑا مرغوب مشغلہ ہے۔ اس کی مثالوں سے ان کا دیوان بھرا پڑا ہے۔ وہ محبوب کو چاہتے ہیں لیکن اس سے زیادہ محبت وہ اپنی ذات سے کرتے ہیں۔ عشق کو دردِ دل کی دوا بھی بتاتے ہیں اور دماغ کا خلل بھی۔

ع: کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

ان کی نظر تعمیر میں تخریب مضمر دیکھتی ہے۔

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

وہ انسانیت دوست بھی ہیں اور دوسرے انسانوں کو اپنے سے کمتر بھی سمجھتے ہیں۔ باری تعالیٰ سے شوخی بھی کرتے ہیں اور اخلاص و عقیدت کا اظہار بھی۔

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

کعبہ کو اپنے پیچھے اور کلیسا کو اپنے آگے دیکھتے ہیں۔

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے، کلیسا مرے آگے

غالبؔ کی شاعری کی اساسی حقیقت تخیلی فکر اور جذبہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں وہ مطرب ہوں جس کے سازِ خیال کو جذبے کا تار چھیڑتا ہے، تب اس میں سے نغمے پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ غالبؔ نے تخیلی فکر اور جذبے کے امتزاج اور توازن سے ایک نئی شاعرانہ صداقت تخلیق کی ہے۔ غالبؔ کے نزدیک شاعری قافیہ پیمائی نہیں بلکہ معنی آفرینی ہے۔ میرؔ سے لے کر ذوقؔ تک، جتنے بڑے غزل گو شاعر پیدا ہوئے، ان کی غزلوں کے مضامین ایک محدود دائرے سے آگے نہیں بڑھے۔ اس کے برعکس غالبؔ کے دائرے

بہت وسیع ہیں۔ان کے یہاں ایک دوسری دنیا ہی نظر آتی ہے۔دیوان کا پہلا ہی شعر لوگوں کو اپنی جانب مبذول کرالیتا ہے۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

غالبؔ نے اپنے فن کو سنوارنے،نکھارنے اور خوب سے خوب تر بنانے کے لیے اپنی قدیم شعری روایت سے بھرپور مدد لی ہے۔ ماضی کی شعری روایات، ان کی شاعری میں آسانی سے تلاش کی جاسکتی ہیں۔ بیدلؔ کی مشکل پسندی اور گہرائی، عرفیؔ کی بلند خیالی اور رنگینی،نظیریؔ کی پُرکاری،ظہوریؔ کی تہ داری کے بے شمار رنگوں نے مل کر غالبؔ کے فن کو ایک اچھا خاصا قوسِ قزح بنادیا ہے۔غالبؔ کے مزاج میں حسن و عشق کا جذبہ تھا جس کی چھاپ ان کی شاعری کے بیشتر حصے میں ہمیں ملتی ہے۔ چنانچہ عشق کے مختلف پہلوؤں اور حسن کے مختلف زاویوں کو ان کے اشعار میں دیکھا جاسکتا ہے۔مثلاً یہ اشعار۔

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو   یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا
ہم کو ان سے وفا کی ہے اُمید   جو نہیں جانتے وفا کیا ہے
نظر لگے نہ کہیں ان کے دست و بازو کو   یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں
یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا   اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا
کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ   ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

غالبؔ کے یہاں تشبیہات و استعارات کی وہ رنگا رنگی اور نیا پن کثرت سے ہے جس کی وجہ سے انھیں شہنشاہِ تشبیہات و استعارات کہا جاتا ہے۔حقیقت ہے کہ تشبیہات و استعارات کی جتنی خوبیاں ہوتی ہیں، وہ سب غالبؔ کے کلام میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں۔حسن کاری،معنی آفرینی،اختصار و ایجاز،تشبیہ و استعارہ کی جان ہے۔مثال کے لیے چند اشعار پیش کیے جارہے ہیں۔ ذرا غور سے ان خوبیوں کو دیکھیے اور غالبؔ کی فن کاری کی داد دیجیے۔

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ   دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک
ہوں گرمیٔ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج   میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں
ترے سرو قامت سے اِک قدِّ آدم   قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں
پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق   سامانِ صد ہزار نمکداں کیے ہوئے

ذرا ایجاز کی خوبیوں کے پیشِ نظر چند اشعار ملاحظہ فرمائیں جن سے آپ کو محسوس ہوگا کہ ایک نشاطِ

روح کا چمن کھل گیا ہے۔

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا   بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہوگئیں
وعدۂ سیرِ گلستاں ہے خوشا طالعِ شوق   مژدۂ قتل مقدر ہے جو مذکور نہیں
مجھے اب دیکھ کر ابرِ شفق آلودہ یاد آیا   کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر

غرض کہ غالبؔ نے نادر تشبیہات و استعارات کے دریا بہادیے ہیں۔بجنوریؔ نے تو اس کی ایک طویل فہرست ہی پیش کردی ہے۔غالبؔ نے اپنی شاعری میں فلسفے کی بھی باتیں کی ہیں۔

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز   پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

دراصل غالبؔ کی شاعرانہ عظمت میں چند عناصر ایسے ہیں جن کی مجموعی تاثیر نے غالب کو غالبؔ بنادیا۔تخیلی فکر جو تحلیلی اور منطقی فکر سے زیادہ گہری ہوتی ہے۔غالبؔ کی تخیلی فکر کا اعلیٰ ترین اظہار استعاروں کی شکل میں ہوا جس کا نمونہ اوپر دکھایا گیا ہے۔

غالبؔ نے میرؔ اور سوداؔ کے لہجے کو ملا کر اپنا علیحدہ لہجہ ایجاد کیا،جس میں درماندگی ہے نہ گھن گرج، بلکہ ان کے تیکھے مردانہ پن میں نفاست،قوت اور تازگی ہے۔عالم گیر انسان دوستی جو انسان کی عظمت اور فضیلت کو مانتی ہے۔زندگی میں جبر کے اصول کو مانتے ہوئے انھوں نے دائمی آرزومندی کا دامن اپنے ہاتھ سے کبھی نہیں چھوڑا۔انسانی فطرت کے رمز شناس کی حیثیت سے غالبؔ نے اپنی شاعری میں جن جذبات کا اظہار کیا ہے، وہ سب انسانوں کی متاعِ مشترک ہیں لیکن ہر کوئی ان کے اظہار پر قدرت نہیں رکھتا۔

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا   میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

حسنِ ادا جو ہیئت اور موضوع کی تخلیقی وحدت کا رہینِ منت ہے، جس میں مصوری اور نغمگی شیر و شکر ہوگئی ہیں، اسی سے غالبؔ کی شاعری میں طلسمی کیفیت پیدا ہوئی ہے۔غالبؔ کی شاعری اُس زمانے کی یادگار اور آئینہ دار ہے، جب مسلمانوں کی زندگی میں حشر برپا ہو رہا تھا۔زندگی کا شیرازہ منتشر ہو چکا تھا اور اس کی شیرازہ بندی مشکل نظر آرہی تھی۔معاشرتی اور تہذیبی زبوں حالی نمایاں ہو چکی تھی۔معاشرت کی بنیاد ہل گئی تھی اور اس میں رخنے پڑ گئے تھے۔زندگی میں ایک کھوکھلا پن پیدا ہو گیا تھا، پرانی قدریں دم توڑ رہی تھیں اور اس کے ساتھ ہی ساتھ نئی قدریں وجود میں آرہی تھیں۔ایک زندگی کا آفتاب غروب ہو رہا تھا اور دوسری زندگی کا آفتاب طلوع ہو رہا تھا۔

یہ اٹھارہ سو ستاون (۱۸۵۷ء) کے غدر کا زمانہ تھا۔مسلمانوں کا قائم کیا ہوا سیاسی نظام آخری سانس لے رہا تھا۔مغل جو صدیوں سے ہندوستان پر اسلامی اقتدار کا پرچم لہرا رہے تھے، اب نام کے حکمراں رہ

گئے تھے۔ ان کے اقبال کا آفتاب گہنا گیا تھا۔ انگریز ہندوستان پر اپنا تسلط جما چکے تھے۔ ماضی سے الفت اور مستقبل کے متعلق اندیشہ سے غالبؔ کے ذہن کو دوچار ہونا پڑا۔ ان کا ذہن و دماغ ایک کشمکش اور تشکیک کی آماجگاہ بن گیا۔

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر   کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

اس میں شبہ نہیں کہ غالبؔ کی غزل کا ایک اہم موضوع حسن وعشق ہے لیکن انھوں نے اس حسن و عشق کے مختلف پہلوؤں کو اپنے زمانے کے مخصوص سماجی پس منظر میں پیش کیا ہے۔ انھوں نے اپنی عشقیہ شاعری میں اس حقیقت کی ترجمانی کی ہے کہ ان کے معاشرے میں بوالہوس کی کوئی اہمیت اور حیثیت نہیں۔ حسن پرستی تو اہلِ نظر کا شیوہ ہے۔ غالبؔ حسن پرستی کا ایک معیار رکھتے تھے۔ ان کے خیال میں حسن پرستی، عشق کا سرچشمہ و منبع ہے۔ عشق زندگی میں ایک مکمل نظام رکھتا ہے۔ سماجی زندگی اس کو متاثر کرتی ہے اور وہ خود سماجی زندگی کو متاثر کرتا ہے۔ دونوں کو علیحدہ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ ان اشعار کو دیکھیے جو اس حقیقت کے ترجمان ہیں۔

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں   تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے
گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار   لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا
کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو پر اب   دیکھا تو کم ہوئے پہ غمِ روزگار تھا

یہ خیالات غالبؔ کے سماجی اور اجتماعی شعور کی دلالت کرتے ہیں۔ اجتماعی شعور غالبؔ کے یہاں اتنا بڑھا ہوا ہے کہ وہ اپنی غزلوں میں زندگی کا مرثیہ لکھنے لگے ہیں۔ کہنے کے لیے تو یہ غزل کا اسلوب ہے، لیکن ذرا غور سے دیکھا جائے تو اس میں اُس زمانے کے سماجی حالات، اس کے بنیادی معاملات اور اساسی مسائل بے نقاب ہوتے نظر آتے ہیں۔ غالبؔ کو مسلمانوں کی تہذیبی عظمت کا احساس تھا۔ اس تہذیبی روایت کو اپنے ارتقائی سفر میں ناسازگار حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ چنانچہ انھوں نے اس خیال کو بادیدۂ نمناک اس شعر میں پیش کیا ہے۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دَم نکلے   بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

بظاہر یہ شعر انفرادی جذبے کا ترجمان معلوم ہوتا ہے لیکن اس کی تہ میں درحقیقت ایک اجتماعی شعور کارفرما ہے۔ غالبؔ کو مغلوں کی تہذیبی بساط کے اُٹھنے کا بڑا غم تھا کیوں کہ اس سے مسلمانوں کی عزت خاک میں مل گئی۔

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن   بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

یہاں آدم کے خلد سے نکلنے کی تلمیح کا سہارا لے کر غالبؔ نے اپنی تہذیبی روایت کے بارے میں نہ جانے کیا کیا کچھ کہہ دیا۔ تہذیبی روایت کا انحطاط وزوال ہے، قدریں منتشر ہیں، اصول ڈانوا ڈول ہیں، نفسانفسی کا عالم ہے۔ ایک دوسرے سے توقعات اُٹھ گئیں۔ خستگی کی کوئی داد دینے والا نہ رہا۔

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی   وہ ہم سے بھی زیادہ کشتۂ تیغِ ستم نکلے

غالبؔ نے دیکھا کہ مسلمانوں میں شکست خوردگی کا احساس پیدا ہو رہا ہے اور یہ احساس عام ہوتا جا رہا ہے۔ چنانچہ تڑپ کر کہہ اُٹھے۔

غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو   مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بے جا کا
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے   دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

غالبؔ نے تباہی و بربادی کے اُن مناظر کو غزلوں میں پیش کیا، جو انحطاط وزوال اور شکست خوردگی کی وجہ سے نظروں کے سامنے تھے۔ چند اشعار دیکھیے۔

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے   اِک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے
بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل   جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

غالبؔ نے اپنے زمانے کے ان ناسازگار حالات کا صرف رونا ہی نہیں رویا بلکہ نئی زندگی سے مطابقت پیدا کرنے کا پیام بھی دیا ہے۔

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں   اُٹھیے بس اب کہ لذّتِ خوابِ سحر گئی

غالبؔ کی غزلوں میں ہمیں شوخی کے عناصر ملتے ہیں۔ غالبؔ کی طبیعت بڑی رنگین، پرکار اور پہلودار تھی۔ وہ گلِ نغمہ اور پردۂ ساز کی خصوصیت رکھتے تھے۔ ان کی طبیعت باغ و بہار تھی۔ اس خصوصیت کا اردو ادب میں کوئی شاعر پیدا نہیں ہوا۔ ان کی طبیعت کا رچاؤ اور مزاج کی پُرکاری ان کے اشعار میں بہت نمایاں ہیں۔ شوخی غالبؔ کی شاعری کا کوئی ایک پہلو نہیں۔ ان کی شاعری کے ہر پہلو میں یہ شوخی نمایاں ہے اور ہم یہ جانتے ہیں کہ غالبؔ کی شاعری میں بڑا تنوع، بڑی رنگارنگی، بڑی وسعت اور بڑی ہمہ گیری ہے۔ چنانچہ تمام پہلوؤں میں یہ شوخی کا عنصر جلوہ گر ہے۔ غالبؔ کی عشقیہ شاعری میں شوخی ملاحظہ فرمائیں۔

کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا   دل کہاں کہ گم کیجیے ہم نے مُدعا پایا
سادہ پُرکار ہیں خوباں غالبؔ   ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں
در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا   جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کُھلا

محبوب سے ملنے اور ملاقات کرنے کے جوطریقے اور وسیلے ہیں، ان کا اردو شاعری میں ذکر بہت

ہوا ہے۔ مثلاً دیوار کے سائے تلے بیٹھنا، گھر کے چاروں طرف چکر کاٹنا، محفل میں جا پہنچنا وغیرہ۔ لیکن غالبؔ کا دوسرا ہی انداز ہے۔ ان کی شوخ مزاجی نے ایک نیا وسیلہ تلاش کیا ہے اور وہ مصوری سیکھنے کا ہے۔

سیکھیں ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے

غالبؔ کے دیوان کا پہلا شعر ہی لوگوں کو اپنی جانب رجوع کرتا ہے۔ کیوں کہ اردو شعرا کے دیوان عام طور پر حمد و نعت سے شروع ہوتے ہیں لیکن دیوانِ غالب کی شروعات اس شعر سے ہوتی ہے۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

ایسی بات نہیں کہ غالبؔ توحید پر ایمان نہیں رکھتے تھے، وہ موحد نہیں تھے، عشقِ رسولؐ سے انھیں کوئی تعلق نہیں تھا لیکن اس کے باوجود انھوں نے دیوان کی شروعات شکوہ و فریاد سے شروع کیا۔ اس بیان سے یہ حقیقت مترشح ہو جاتی ہے کہ انسانیت کی لے میں ہی شکوہ و فریاد ہے۔ غالبؔ کی آنکھ انسان کو گھائل دیکھتی ہے۔ انسان زخموں سے چور نظر آتا ہے۔ وہ بڑی ہی مظلوم مخلوق ہے۔ اس کی زندگی میں مستقل کرب ہے۔ فطرت کی حسین تخلیق ہوتے ہوئے وہ فانی ہے۔ اسے بے ثباتی کا احساس ہوتا ہے۔ اس کے خمیر میں ہی بے بسی اور بے ثباتی ہے۔ اس لیے وہ اس فطرت سے شکوہ سنج ہیں جن کے ہاتھوں ان کی تخلیق ہوئی ہے۔

غالبؔ نے غزل میں نہ صرف فلسفیانہ مضامین پیش کیے ہیں بلکہ فلسفیانہ مضامین پیش کرنے کی بنیاد انھوں نے ہی رکھی۔ مگر وحدتِ فکر و نظر ان کے یہاں نہیں پائی جاتی۔ یہی حال تصوف کا ہے۔ انھوں نے صوفیانہ خیالات اور وحدت الوجود کے مسئلہ کے متعلق اظہار خیال کیا ہے لیکن تصوف ان کی زندگی پر اثر انداز نہیں ہے۔ وہ عیش پسند انسان تھے اور بادہ و مینا کو مرتے دم تک چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔

گو ہاتھوں میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دَم ہے
رہنے دو اَبھی ساغر و مینا مرے آگے

غالبؔ کے یہاں وحدانیت اور تصوف کا بھی رنگ بڑا گہرا نظر آتا ہے۔ انھیں اپنی کج رویوں کا شدید احساس تھا لیکن خواہشاتِ رندانہ کے ہاتھوں مجبور تھے۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

کہیں کہیں غالبؔ کے اسلوب میں ناہمواری ہے۔ ان کے کلام میں تین طرح کے اسلوب پائے جاتے ہیں۔ پہلے رنگ میں فارسیت کا غلبہ ہے۔ الفاظ اور بندشیں فارسی کی ہیں۔ صرف کہیں کہیں پر اردو کے الفاظ جوڑ دیتے ہیں۔

دل خوں شدۂ کشمکش حسرتِ دیدار
آئینہ بدستِ بتِ بدمستِ حنا ہے

دوسرا رنگ وہ ہے جہاں انتہائی درجہ سادگی کارفرما ہے۔

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

تیسرا رنگ ان دونوں کے درمیان واقع ہے۔ فارسی الفاظ اور بندشوں کی سیدھی سادی وضع میں بڑی خوش گوار آمیزش ہے۔

آہ کو چاہیے اِک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زُلف کے سر ہونے تک

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

غالبؔ کا آرٹ روایتی ہے لیکن اپنی حد کے اندر اپنی مثال آپ ہے۔ اس میں گہرائی زیادہ نہیں لیکن وسعت اور تنوع کے لحاظ سے کوئی دوسرا شاعر ان کے مقابل میں نہیں آسکتا۔ وسعت غالبؔ کے آرٹ کی نمایاں خوبی ہے۔ ان کا دامن خیال بڑا ہی وسیع ہے۔ اس میں سب کچھ سمٹ آتا ہے۔ ایک طرف غالبؔ کہہ سکتے ہیں۔

دھول دھپّا اس سراپا ناز کا شیوہ نہ تھا
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایک دن

تو دوسری طرف یہ صدا بلند کرتے ہیں۔

دل ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر
ہم اُس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

کسی اونچی شاعری کے لیے طرزِ کلام، پیرایۂ بیان اور لب ولہجہ کی بڑی اہمیت ہے۔ ہر اونچے اور عظیم شاعر کے یہاں اسلوب کا یہ پہلو بہت نمایاں ہوتا ہے۔ میرؔ کو اپنی طرز پر ناز کرتے دیکھا۔

گر دیکھو گے تو طرزِ کلام اس کی نظر کو
اے اہلِ سخن میرؔ کو استاد کروگے

بات کی طرز کو دیکھو تو کوئی جادو تھا
پر ملی خاک میں یہ سحر بیانی اس کی

چنانچہ غالبؔ بھی اپنے اندازِ بیان پر فخر کرتے ہیں۔

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور

حقیقت ہے کہ غالبؔ کے یہاں ان کے اندازِ بیان کی ندرت پائی جاتی ہے جو انھیں اردو کے دوسرے عظیم شعرا کی صف میں لا کھڑا کرتی ہے اور اس ندرت کا راز ان کے اندازِ بیان کا استفہامیہ انداز ہے۔ انھوں نے بہت سی غزلوں میں استفہامیہ الفاظ استعمال کیے ہیں۔ مثلاً کیا، کب، کیوں، کیسے، کب

تک وغیرہ۔مثلاً۔

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے — آخر اس دَرد کی دوا کیا ہے
ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا — نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی — بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

غالبؔ کے دیوان میں ایسے استفہامیہ اشعار بکثرت ملتے ہیں۔غالبؔ کے دیوان میں خوبیاں تو بھری پڑی ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ خامیاں بھی ہیں۔غالبؔ کے یہاں محبوب کا احترام نہیں۔انھوں نے اردو ادب کو معشوق بازاری سے متعارف کرایا ہے۔یہی سبب ہے کہ اس قسم کے ان کے اکثر اشعار سوقیانہ پن اور ابتذال لیے ہوئے ہیں۔مثلاً۔

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اُس سیم تن کے پاؤں — رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پاؤں
ہے کیا جو کس کے باندھیے میری بلا ڈرے — کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں
بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ — جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے
عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام — مجنوں کو بُرا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے
دھول دھپّا اس سراپا ناز کا شیوہ نہ تھا — ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایک دن

ان اشعار کو دیکھنے کے بعد تعجب ہونے لگتا ہے کہ یہ غالبؔ وہی غالبؔ ہیں جو میرؔ اور مومنؔ کی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ یہاں جو تصویر نظر آ رہی ہے وہ تو معشوق فریبی سے کام لینے والے غالبؔ ہیں۔ ان کے ساتھ معشوق بازاری ہے۔ مے نوشی کا دَور چل رہا ہے۔معشوق سے چھیڑ چھاڑ ہو رہی ہے اور یہ چھیڑ اس حد تک پہنچتی ہے کہ دھول دھپّا کی نوبت آ جاتی ہے۔

مختصر یہ کہ غالبؔ نے فنی اور جمالیاتی اوصاف کی بدولت غزل کو ہمارے ادب کی تقدیر بنا دیا۔ انھوں نے 'تنگنائے غزل' کو اتنی وسعت دی کہ اس میں زندگی کی بصیرتوں کی سمائی ممکن ہوئی۔آج بھی اس صنفِ سخن میں بھرپور اظہار کے لیے غالبؔ ہی کی طرف نظریں اُٹھتی ہیں۔آج بھی وہ ہماری شاعری کے اُفق پر اسی طرح چھائے ہوئے ہیں جس طرح ڈیڑھ سو سال پیشتر چھائے ہوئے تھے۔یہ اس رندِ ہزار شیوہ کی کرامات نہیں تو پھر کیا ہے؟ مجموعی طور پر کلامِ غالبؔ کے بغور مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ غالبؔ قادر الکلام شاعر ہیں۔ان کی خداداد ذہانت اور فراست کے سبھی معترف ہیں۔ان کا کلام اردو ادب کے لیے سرمایۂ ناز ہے۔

☆☆☆

حیدری بانو
شعبۂ فارسی، الہ آباد یونیورسٹی۔رابطہ نمبر:9651584358

مولانا صہبائی اور ان کی فارسی خدمات

تلخیص:
مولانا امام بخش صہبائی مغفور متخلص بہ صہبائیؔ فارسی اور اردو ادب کی بلند مرتبہ، عظیم الشان اور وسیع النظر شخصیت ہیں۔وہ ایک قادر الکلام شاعر، دقیقہ رس شارح، صاحب طرز انشا پرداز، نکتہ بیں محقق وفنون و کمالِ شعر کے رمز شناس تھے۔استمالِ فن معما، تدقیق مقامات کتابی، تفحص نکات عروض وقافیہ اور تحقیق لغات واصطلاحات فارسی میں ان کا کوئی ہم پلہ نہیں تھا۔موصوف نے اپنے گراں بہا ادبی کارناموں کو قلم وقرطاس کے حوالے کر کے نہ صرف اپنے عہد کو متاثر کیا بلکہ نسل آئندہ کے لیے بھی ایک ایسا بیش قیمتی سرمایہ فکر واستقلال بھی چھوڑا ہے جس سے ہمہ وقت استفادہ کیا جا سکتا ہے۔اس مقالے میں ان کی فارسی خدمات کے حوالے سے ان کی قد آور شخصیت کے کچھ پوشیدہ گوشوں کو منظر عام پر لانا مقصود ہے۔ مجھے اپنی کوتاہ علمی اور ادبی بے بضاعتی کا پورا یقین ہے لیکن مولانا صہبائی جیسی اعلیٰ ہستی پر قلم اٹھانے کی جرأت صرف اس لیے کر رہی ہوں تا کہ اہل علم واصحاب ذوق وفہم وفراست ان کی فارسی خدمات سے متعلق واقفیت حاصل کر سکیں اور اردو کی طرح فارسی میں ان کے رفیع مقام اور مرتبہ کو تعین کر سکیں۔ان کے فارسی کلام سے متعلق کوئی نظریہ پیش کرنے سے پہلے ان کے دور کے ادبی، سیاسی، سماجی اور معاشرتی حالات پر طائرانہ نگاہ ڈال لینا ضروری معلوم ہوتا ہے کیوں کہ کسی نابغہ روزگار فن کار کے ہمہ جہت فن پارے شعوری اور غیر شعوری لحاظ سے اپنے دور کے حالات کے مرہون منت ہوتے ہیں۔

صہبائی کا شمار اپنے عہد کے ان اہل قلم حضرات میں کیا جاتا تھا جو فارسی زبان وادب سے فطری دلچسپی اور لگاؤ رکھتے تھے۔ایک لحاظ سے ان کی منزلت اور اہمیت اس لیے اور عروج پاتی گئی کیوں کہ وہ اس

دور کے یک و تنہا شاعر اور انشا پرداز تھے جنھوں نے کبھی فارسی کے مقابلے میں اردو زبان کی جانب زیادہ توجہ صرف نہ کی۔اسی سبب سے اردو میں ان کے علمی آثار فقط دو تین ہی ہیں جب کہ ان کے اکثر و بیشتر کارنامے خواہ وہ نثر میں ہو یا نظم میں فارسی میں ہی پائے جاتے ہیں۔

کلیدی الفاظ:

مولانا صہبائی، قادر الکلام شاعر، دقیقہ رس شارح، صاحب طرز انشا پرداز، نکتہ بیں محقق، کمال شعر کے رمز شناس۔استکمال فن معما، تفحص نکات عروض و قافیہ، ان کے شاگرد، اہم کتابیں۔

فارسی شعر و ادب ہندوستان کی ہزار سالہ ادبی، تہذیبی اور ثقافتی تاریخ کی وہ گراں بہا ملکی وراثت ہے جس پر جتنا بھی فخر و ناز کیا جائے کم ہے۔مسلم عہد حکومت میں ملکی ثقافت، سیاست و قیادت اسی فارسی زبان سے عبارت تھی۔تاریخ داں اپنے اظہارِ خیال کے لیے اسی زبان کو ترجمان بناتے، شعرا اسی زبان میں نغمہ سرا ہوتے اور ادبا و علما اپنے درونی احساسات کو واضح اور روشن کرنے کے لیے اسی زبان کو بہترین وسیلہ تصور کرتے تھے۔اسی سبب سے ہمارے ملک میں اس زبان کی اہمیت اور افادیت کا اقرار و اعتراف ہر دور میں کیا جاتا رہا ہے۔

ہندوستان میں فارسی زبان و ادب کی بے شمار شخصیتیں پیدا ہوئیں جن کی علمی کاوشیں اور کارنامے جریدۂ عالم پر اپنے نقوشِ دوام ثبت کر چکے ہیں۔تاریخ و تذکرے، عروض و فلسفہ، شعر و نقد، لغت و زبان الغرض ادبی اصناف کا شاید ہی کوئی پہلو ایسا باقی رہ گیا ہو جو ہندوستانی ارباب قلم کی دور بیں نگاہوں سے پوشیدہ رہ گیا ہو۔فارسی زبان و ادب کے ہر پہلو کو اس ملک کے فارسی نویسوں نے اپنی فکر و فن کا مرکز بنایا ان کی تعجب خیز علمی مہارتوں، کاوشوں اور کارناموں کو دیکھ کر خود اہل زبان و ادب بھی اپنے تمام تر تعصب و جانبداری کے باوجود ان ارباب قلم کی غیر معمولی علمی، ادبی اور شعری صلاحیتوں کو قبول کرنے پر مجبور نظر آتے ہیں۔

فارسی زبان و ادب کا ہندوستانی تہذیب و تمدن سے ایسا گہرا رشتہ رہا ہے کہ اگر اس رشتہ سے قطع نظر کرنے کی کوشش کی جائے تو اس ملک یعنی ہندوستان کی بہترین اور روشن تصویر کی عکاسی نہیں کی جا سکتی۔اس کی اہمیت اور منزلت کا اندازہ اس نقطۂ نظر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اپنوں کی تمام تر بے توجہی اور غیروں کی بھرپور سازشوں کے باوجود بھی اس زبان و ادب کے مستقیم اثرات اس ملک کے دانشوروں کے اذہان سے محو نہیں ہو سکے اور اس زبان کی افادیت کا اعتراف کسی نہ کسی صورت میں کیا جاتا رہا۔موجودہ زمانہ میں اس زبان کے پوری طرح سے زوال پذیر ہو جانے کے بعد بھی اس ملک کی زبانوں پر اس کے اثرات کے ہمہ

گیر اور راسخ نقوش کو بخوبی محسوس کیا جا سکتا ہے۔زیر نظر مقالے میں فارسی ادب کی ایک اہم شخصیت کے علمی اور ادبی کارناموں پر روشنی ڈالنے کی ایک ادنیٰ سی کوشش کی گئی ہے۔

مولانا امام بخش صہبائی مغفور معمائی متخلص بہ صہبائی فارسی اور اردو ادب کی بلند مرتبہ، عظیم الشان اور وسیع النظر شخصیت ہیں۔وہ ایک قادر الکلام شاعر، دقیقہ رس شارح، صاحب طرز انشا پرداز، نکتہ بین محقق و فنون و کمال شعر کے رمز شناس تھے۔استکمال فن معما، تدقیق مقامات کتابی، تفحص نکات عروض و قافیہ اور تحقیق لغات و اصطلاحات فارسی میں ان کا کوئی ہم پلہ نہیں تھا۔موصوف نے اپنے گراں بہا ادبی کارناموں کو قلم و قرطاس کے حوالے کر کے نہ صرف اپنے عہد کو متاثر کیا بلکہ نسل آئندہ کے لیے بھی ایک ایسا بیش قیمتی سرمایہ فکر و استقلال بھی چھوڑا ہے جس سے ہمہ وقت استفادہ کیا جا سکتا ہے۔اس مقالے میں ان کی فارسی خدمات کے حوالے سے ان کی قدآدم شخصیت کے کچھ پوشیدہ گوشوں کو منظر عام پر لانا مقصود ہے۔مجھے اپنی کوتاہ علمی اور ادبی بے بضاعتی کا پورا یقین ہے لیکن مولانا صہبائی جیسی اعلیٰ ہستی پر قلم اٹھانے کی جرأت صرف اس لیے کر رہی ہوں تا کہ اہل علم و اصحاب ذوق و فہم و فراست ان کی فارسی خدمات سے متعلق واقفیت حاصل کر سکیں اور اردو کی طرح فارسی میں ان کے رفیع مقام اور مرتبہ کو تعین کر سکیں۔ان کے فارسی کلام سے متعلق کوئی نظریہ پیش کرنے سے پہلے ان کے دور کے ادبی، سیاسی، سماجی اور معاشرتی حالات پر طائرانہ نگاہ ڈال لینا ضروری معلوم ہوتا ہے کیوں کہ کسی نابغۂ روزگار فن کار کے ہمہ جہت فن پارے شعوری اور غیر شعوری لحاظ سے اپنے دور کے حالات کے مرہون منت ہوتے ہیں۔یہ حالات یا ماحول چاہے ادبی ہوں یا سیاسی و سماجی، تہذیبی ہوں یا تعلیمی، مذہبی ہوں یا تعلیمی فن کار کی تمام تخلیقات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

عہد مولانا صہبائی سخت بحران، قتل و غارت گری، انتشار اور ہنگامہ آرائی کا زمانہ تھا۔سیاسی، سماجی، اخلاقی، تہذیبی اور مذہبی نکتۂ نظر سے ہندوستانی تاریخ کا پرآشوب و فتنہ آور دور تھا۔ ہر سو خطرات و خدشات کے بادل سروں پر منڈلا رہے تھے، عوام کے ساتھ ساتھ خواص بھی خوف و دہشت، حیران و پریشان اور ناقابل برداشت آلام و مصائب کا مقابلہ کر رہے تھے۔

تجارت کی غرض سے ہمارے ملک ہندوستان میں داخل ہوئی غیر ملکی حکومت نے ملک کی نااہلی و ضعف و کمزوری کا اندازہ لگا کر گرگانہ ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے مکر و حیلہ سے ملک کے داخلی و باطنی معاملات میں حاکمانہ اور مالکانہ دخل اندازی حاصل کرنے لگے اور یہاں تک کہ ملک کی تقریباً چھوٹی بڑی ریاستوں کو اپنے ماتحت کر لیا تھا۔اہل ہند غیر ملکی قوم یعنی انگریزوں کے ہاتھوں کے اشاروں پر ناچ رہے تھے۔اپنے فرنگی آقاؤں کی پیشانی پر پڑنے والے ایک معمولی بل کے متحمل بھی نہیں ہو سکتے تھے۔مغل جو

صدیوں سے ہندوستان پر بڑے جاہ و جلال، شان و شوکت اور رعب و دبدبہ کے ساتھ مسلسل حکومت کرتے چلے آرہے تھے ان کا ستارۂ اقبال بھی گہن آلود ہوکر زوال اور پستی کے دہانے پر آچکا تھا۔ صدیوں کی فرمانروائی اور حکمرانی نے لوگوں کو عیش و عشرت اور سستی و تن آسانی کا خوگر بنا دیا تھا۔ جمود و تعطل اور بے حسی اس درجہ طاری ہوچکی تھی کہ مفکرین ان کے آئندہ سے مایوس ہونے لگے تھے۔ اس دور کی ایک پر درد منظر کشی حالی نے اپنے ان اشعار میں پیش کی ہے ۔

چمن میں ہوا آچکی ہے خزاں کی
پھری ہے نظر دہر سے باغباں کی
صدا اور ہے بلبل نغمہ خواں کی
کوئی دم میں رحلت ہے اب گلستاں کی
تباہی کے خواب آرہے ہیں نظر سب
مصیبت کی ہے آنے والی سحراب

فرنگیوں نے اپنی سیاسی پالیسی اور تخریبوں کی مدد سے قریب قریب پورے ہندوستان کو ہی اپنے زیر تسلط کرلیا تھا۔ جس وسیع و عریض ملک ہندوستان میں بقول سید عابد حسین:

''محمد تغلق پہلا سلطان تھا جس نے ہندوؤں کی تالیف قلوب کی پالیسی اختیار کی۔ سلطنت کے آخری زمانے میں خصوصاً سکندر لودی اور شیر شاہ سوری کے عہد میں عہدہ داروں کے تقرر میں ہندو و مسلمان کی تفریق بہت کم ہوگئی تھی۔ ہندوؤں نے فارسی زبان پڑھنا شروع کردی تھی اور مالی محکموں میں بڑے بڑے ذمہ داری کے عہدے پانے لگے تھے۔ اس کے علاوہ عام ہندو بھی سلطنت سے ایک حد تک مانوس ہوگئے تھے۔''۱ے

وہ ہندوستانی تہذیب جس نے اکبر اور اس کے جانشین کے زمانے میں نشو و نما پائی، جہاں کبھی مغلیہ حکومت کے شہنشاہ اپنے تمام جاہ و جلال، شان و شوکت اور حشمت و دبدبہ کے ساتھ جلوہ افروز ہوتے تھے، جہاں کے بادشاہوں کے انعام و اکرام اور داد و دہش کی داستانیں سن کر متعدد اہل سخن اور اہل ہنر اپنے وطن کو خیر باد کرکے یہاں اڈے چلے آتے تھے، مغل حکمرانوں کی فیاضی اور سخاوت کی بارش ان اشخاص کو مسلسل شرابور کرتی تھی۔ آج انھیں کے اخلاف ذلت و خواری کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوچکے تھے۔ تمام حکومتیں اور ریاستیں مغربی قوم کے زیر اختیار آچکی تھیں۔ مغلیہ شاہوں کی زمزمہ سنجیوں، گل و بل، داد و دہش اور فیاضی اور سخاوت کی داستانیں پژمردہ اور کہنہ ہوچکی تھیں، جن میں اب برائے نام بھی کوئی کشش و بلندی باقی نہیں

رہ گئی تھی۔ جیسا کہ سید عابد حسین اپنی کتاب 'قومی تہذیب کا مسئلہ' میں فرماتے ہیں:

''مغربی تہذیب سارے ملک پر چھا گئی اور اس نے ہندوستانیوں کی ساری تہذیبی زندگی کو درہم برہم کردیا۔''۲ے

۱۸۵۷ء میں برطانوی حکومت کے خلاف پہلی جنگ آزادی میں ہندوستانیوں کو جس ذلت و خواری اور ناکامی کا سامنا کرنا پڑا وہ کسی بھی ذی فہم کی نظر سے مخفی نہیں ہے۔ انگریزی حکومت نے اس کے بدلے میں اہل ہند خاص طور پر مسلمان طبقے پر ظلم و ستم کے جو پہاڑ توڑے اس کے تصور و احساس سے ہی انسان کی روح کانپ جاتی ہے اور قلم و قرطاس جانبداری کرنے سے انکار کردیتے ہیں۔ ظہیر احمد صدیقی برطانوی حکومت کی سنگ دلی، بے رحمی، ظلم و ستم اور بربریت کی روایت کو بڑے پر اثر اور دل سوز الفاظ میں بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''انگریزوں کی فتح ہوئی اور فتح کے بعد انتقام کا دور شروع ہوگیا۔ نزلہ ہندوستان کے سب سے ضعیف طبقے یعنی مسلمانوں پر گرا۔ ان 'مہذب انسانوں' نے ہزاروں اشخاص کو تہ تیغ کر دیا، سینکڑوں بچوں کو یتیم اور عورتوں کو بیوہ بنا دیا۔ ذرا سے شک پر علما کو پھانسی کے تختوں پر لٹکا دیا اور نہ جانے کتنوں کو حبس دوام کی سزا دی۔ غرض ظلم و ستم و بربریت کا عفریت انسانی جان و مال کی بھینٹ لے رہا تھا۔ اگر ان کشتگان ستم کے لاوارث یتیموں کے آنسو جمع کیے جائیں تو کوئی شک نہیں کہ غم و حسرت کا ایک اقیانوس دنیا میں لہریں مارنے لگے اور اگر اسی طرح ناشاد و بے نوائیوں کی آہوں کا دھواں یکجا کیا جائے تو نیلے آسمان کے نیچے دوسرا آسمان برپا ہوجائے۔''۳ے

ظہیر احمد صدیقی کے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد مسلمان قوم کو جو ظلم و ستم کے کوہ گراں اپنے نحیف و کمزور شانوں پر اٹھانے پڑے ان کا خیال آتے ہی انسانی رگوں میں خون سرد ہونے لگتا ہے، چہرہ زرد ہونے لگتا ہے اور روح کانپ جاتی ہے مگر اس کے باوجود بھی مسلمان اپنی حالت پس ماندہ سے انجان و غافل بنے ہوئے تھے۔ ان کے اذہان و افکار پر ظلمت و تاریکی کی وہ دبیز تہ پڑی ہوئی تھی جس کو برطرف کرکے بزم شعور دیکھنے کا ذرہ برابر بھی تصور ان کے لیے کار محال ہوچکا تھا۔ انھوں نے اور زیادہ غفلت، کم عقلی اور بے توجہی کا بین ثبوت دیتے ہوئے برطانوی حکومت کے ساتھ صلح و مصالحت کرنے کے بجائے از سر نو اعلان مخالفت کردیا اور جب اپنی ناکامی کے بعد انھیں برطانوی حکومت کے شکنجۂ ظلم و ستم میں کسا گیا تو انھوں نے مذہب کے سایۂ حمایت میں پناہ تلاش کی جب کہ

اہل ہند کی دوسری قوموں نے زمانۂ روزگار کے ساتھ تبدیل ہوتے ہوئے حالات کے پیش نظر فرنگی حکومت کی اطاعت گزاری اور فرماں برداری کو ظاہراً قبول کر کے برطانوی تہذیب وتمدن کے زیر سایہ فیض اٹھانا شروع کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ترقی کے میدان میں آگے نکل گئے اور مسلمان اپنے مذہبی اداروں، مدرسوں اور خانقاہوں تک محدود رہ گئے۔ ان کی خداداد اور روح افزا صلاحیتیں کافی حد تک زوال پذیر ہوتی چلی گئیں۔ علمی وسیاسی حریت گویا نہ کے برابر ہوگئی۔ ان کی تمام تر تخلیقی صلاحیتیں ان سے سلب ہو کر انھیں ذہنی طور پر مجبور ومعذور بنا دیا اور مسلم ایک ایسی پس ماندہ قوم بن گئی جس میں جذبۂ زندگی کی ذرہ برابر بھی رمق باقی نہیں رہ گئی تھی۔

یہی وہ حوصلہ شکن اور مایوس کن عہد تھا جس میں ہمارے عظیم الشان شاعر وادیب نے ولادت اور پرورش پائی۔ خداوند متعال نے انھیں نہایت حساس دل ودماغ عطا کیا تھا جس نے ان حالات میں ان پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

اس سیاسی اتھل پتھل، اتار چڑھاؤ، اور ہرج مرج کے اثرات فارسی زبان وادب پر بھی ظاہر ہونے لگے تھے۔ جس زبان وادب کا سکہ صدیوں تک رائج تھا اب بیچارگی اور لاچارگی میں چراغ سحری کے مثل نظر آرہی تھی۔ جب کہ ہندوستان میں فارسی زبان کا چلن نہایت شاندار رہا ہے اور ہمارے ملک میں اس زبان وادب کا ماضی جس قدر تابناک اور روشن رہا ہے وہ اہل علم سے پوشیدہ نہیں ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب محمد بن قاسم اور ان کا لشکر ہند میں اپنی فاتحانہ شان وشوکت اور جلال سے وارد ہوا تو اس مٹی میں رچ بس گیا اور ہندوستانیوں نے ان کی شہرۂ آفاق زبان یعنی عربی کو اس طرح اپنایا اور قبول کیا کہ وہ اہل زبان سے بھی چار قدم آگے نکلتے نظر آئے۔ یہی روایت اور معاملہ فارسی زبان وادب کے ساتھ بھی تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی وسعت اور اس کا دامن پورے ملک میں وسیع ہوتا چلا گیا۔ فارسی کا آغاز ہمارے ملک میں غزنوی اور غوری فاتحوں کی آمد سے ہوا جب قطب الدین ۶۰۲ھ میں تختِ دہلی پر متمکن ہوا تو فارسی ہی درباری اور علمی زبان قرار پائی۔ ۴؎

ڈاکٹر زاہدہ پٹھان انیسویں صدی میں فارسی کے مقام کا تعین کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''اگر چہ اس دور کی سب سے نمایاں ترقی، اردو زبان کی ترقی وترویج ہے۔ یہ دور اس کی ابتدائی ترقی کا تھا۔ اس وقت سے یہ زبان برابر آگے ہی بڑھتی رہی۔ اگر چہ رفتہ رفتہ فارسی زبان کی جگہ اردو زبان نے لے لی تھی لیکن اب بھی فارسی زبان کو پڑھے لکھے لوگوں کی زبان ہونے کا فخر حاصل تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس دور کے مشہور ومعروف شاعر غالب اپنے اردو کلام

کے مقابلے میں، جو آج ان کی بے پناہ مقبولیت اور شہرت کا سبب ہے، اپنے فارسی کلام کو زیادہ بیش بہا اور اپنے لیے باعث فخر سمجھتے تھے۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

فارسی بین تا بینی نقشہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است'' ۵؎

صہبائی کا شمار اپنے عہد کے ان اہل قلم حضرات میں کیا جاتا تھا جو فارسی زبان وادب سے فطری دلچسپی اور لگاؤ رکھتے تھے۔ ایک لحاظ سے ان کی منزلت اور اہمیت اس لیے اور عروج پاتی گئی کیوں کہ وہ اس دور کے یک وتنہا شاعر اور انشا پرداز تھے جنھوں نے کبھی فارسی کے مقابلے میں اردو زبان کی جانب زیادہ توجہ صرف نہ کی۔ اسی سبب سے اردو میں ان کے علمی آثار فقط دو تین ہی ہیں جب کہ ان کے اکثر وبیشتر کارنامے خواہ وہ نثر میں ہو یا نظم میں فارسی زبان میں ہی پائے جاتے ہیں۔

صہبائی کا پورا نام امام بخش تھا وہ صہبائی تخلص کرتے تھے۔ صہبائی کا سال تولد کسی تذکرے میں نہیں ملتا لیکن 'طبقات الشعرا' میں ان کے شاگرد مولوی کرم الدین ان کے سنہ ولادت کے بارے میں تحریر کرتے ہیں کہ ۱۲۶۱ھ میں وہ چالیس برس کے ہوں گے۔ ان کے مطابق ان کا سال تولد ۱۲۲۱ھ ۱۸۰۵ء ہوتا ہے۔ چوں کہ مولوی کریم الدین صہبائی کے ہم عصر تھے اس وجہ سے ان کا بیان قابل قبول سمجھا جانا چاہیے۔ صہبائی کے آباواجداد قصبہ تھانیسر کے باشندہ تھے۔ صہبائی کے والد کا نام محمد بخش تھانیسری تھا۔ غالباً محمد بخش تھانیسری ابتدائے شباب میں ہی تلاش معاش میں دہلی آگئے تھے اور کوچۂ چیلاں میں سکونت پذیر ہوئے اور صہبائی کی جائے ولادت دہلی ہی تھی۔ جیسا کہ خود ان کے شاگرد مرزا قادر بخش صابر اپنی کتاب 'گلستان سخن' میں تحریر کرتے ہیں:

''صہبائی' تخلص جناب فیض انتساب' حضرت استادی استاد الانامی قدوۂ کملائے روزگار، اسوۂ افاضل شہر ودیار، ماہر فنون، واقف علوم غربیہ، مخدومی مولائے مولوی امام بخش سلمہ اللہ تعالیٰ وطن آبائی این جناب مستطاب کا شہر کرامت تھانیسر صانہا اللہ من الشر اور مولد گل زمین لطافت آئین، حضرت شاہجہان آباد حفظہا اللہ من الفساد ہے۔'' ۶؎

امام بخش صہبائی کا سلسلۂ نسب اپنے والد کی جانب سے خلیفہ دوم عمر اور اپنی والدہ کی طرف سے سید عبدالقادر جیلانی تک پہنچتا ہے۔ صہبائی کے شاگرد عزیز 'اپنے صہبائی' کے مولف میر منشی انجمنی بھوپال کلیات کے خاتمے پر لکھتے ہیں جس کے وسیلہ سے ان کے سلسلۂ نسب اور حالات زندگی کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہوتی ہے:

''مولانا شیخ امام بخش معمائی تخلص صہبائی کہ پرتو نسب این چشم و چراغ دودۂ شرافت مآب روشن تر از ماہ و آفتاب است کہ از جانب پدر بزرگوار بہ حضرت عمر فاروق اکبر رضی اللہ عنہ می رسد و از طرف مادر عالی تبار بہ جانب سید عبدالقادر جیلانی قدمی پیوندد۔''۷

''مولانا محمد بخش تھانیسری کے دو بیٹے تھے۔ دونوں اپنے اپنے فن میں باکمال ہوئے۔ بڑے کا نام پیر بخش تھا۔ وہ حکیم ہوئے۔ چھوٹے صاحبزادے امام بخش تھے جنھوں نے فارسی دانی میں نام پایا۔''۸

مولانا صہبائی کے خاندان اور ان کی اولاد کے سلسلے میں کوئی زیادہ تفصیل تو حاصل نہیں ہوسکی لیکن اتنا ضرور پتا چلتا ہے کہ ان کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ ان کے بڑے بیٹے کا نام تھا مولوی عبدالعزیز جو عزیز تخلص کرتے تھے، اور ان کے چھوٹے بیٹے کا نام عبدالکریم سوز تھا۔ صہبائی نے اپنے دونوں بیٹوں کی تعلیم و تربیت اپنے زیر سایہ نہایت عمدہ کی تھی۔ چنانچہ دونوں ہی بیٹے پڑھے لکھے، عالم اور مہذب ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے شاعر بھی تھے۔ ان کی منزلت اور عالی ظرفی کا اعتراف نہ صرف اس دور کے مشہور ادیبوں اور تذکرہ نگاروں نے کیا تھا بلکہ بعد کے تذکرہ نگاروں نے بھی کیا ہے۔ ان کے بڑے فرزند کا تذکرہ کرتے ہوئے لالہ سری رام رقم طراز ہیں:

''عزیز مولوی محمد عبدالعزیز دہلوی مہین پور مولانا امام بخش صہبائی۔ علمی استعداد معقول تھی فن میں اپنے پدر عالی قدر کے شاگرد تھے ایام غدر میں ظفریاب لشکر کے ہاتھوں بے گناہ شہید ہوئے۔ طبیعت کا رنگ نرالا تھا۔ بہت پرلطف اور دل میں اتر جانے والے شعر کہتے تھے۔ خیالات میں باریکی ہے۔ زبان صاف ہے۔''۹

''امام بخش صہبائی کی ابتدائی تعلیم کہاں ہوئی کوئی ٹھوس معلومات فراہم نہیں ہیں، جس سے اس بارے میں رہنمائی حاصل کی جائے نیز اس سلسلے میں سارے تذکرے بھی خاموش ہیں۔ صرف قیاساً کہا جا سکتا ہے کہ اپنے والد بزرگوار سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔''۱۰

چوں کہ صہبائی کے پدر بزرگوار اپنے عہد کے باحیثیت افراد میں شمار کیے جاتے تھے اور لوگوں میں مشہور و مقبول بھی تھے اور قد آور افراد سے ان کے گہرے روابط بھی تھے۔ اس لیے ان کے دونوں فرزندوں (پیر بخش، امام بخش صہبائی) کو دہلی کے جید استادوں اور علما تک پہنچنے اور ان حضرات سے علم حاصل کرنے کے مواقع میسر ہوئے۔ چنانچہ جس وقت اپنے والد سے کسب علم کے بعد کچھ لائق ہوئے تو انھیں مولوی عبداللہ خان علوی جیسے جید استاد سے کسب علم کا موقع فراہم ہوا۔ کریم الدین عبداللہ خان علوی کے علم و فضل

کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عبداللہ خان جو شاہجہان آباد میں مشہور تھے، ان سے تحصیل فارسی کی اور کتب عربیہ بھی متفرق جا سے پڑھیں۔ طب میں دست قدرت رکھتے ہیں۔''۱۱

دہلی میں برسرکار آنے سے قبل صہبائی معاشرتی اور اقتصادی اعتبار سے بہت پریشان رہتے تھے۔ ان کا مستقبل کوئی ذریعہ معاش نہیں تھا۔ ذاتی طور سے امرا اور رؤسا کے گھر جا کر ان کے بچوں کو درس پڑھا کر گزر اوقات کیا کرتے تھے۔ ۱۸۴۰ء میں صہبائی کو دہلی کالج میں فارسی زبان و ادب کا استاد مقرر کیا گیا اور آخری وقت تک ان کی یہ استادی حیثیت اور مرتبہ برقرار رہا۔ دہلی کالج میں استاد مقرر ہونے کے بعد ان کی اقتصادی حالت پہلے کی بہ نسبت کچھ بہتر ہوگئی۔ دہلی کالج میں صہبائی کی تقرری کی داستان بہت ہی دلچسپ ہے لیکن اپنے مقالہ کے طولانی ہونے کی وجہ اس سے صرف نظر کرتی ہوں:

''۱۸۴۰ء میں جب آنریبل مسٹر ٹامس لیفٹیننٹ گورنر مدرسے کے معائنے کے لیے آئے تو انھوں نے تجویز پیش کی کہ ایک اعلیٰ وارفع اور مستعد فارسی مدرس کا تقرر ہونا چاہیے۔ مفتی صدرالدین خان صدرالصدور نے بتایا کہ ہمارے قرب و جوار میں فارسی زبان کے استاد فقط تین ہی شخص ہیں ایک مرزا نوشہ، دوسرے حکیم مومن خاں اور تیسرے امام بخش صہبائی، لیفٹیننٹ گورنر نے تینوں حضرات کو بلوایا۔ مرزا نوشہ کو بھلا یہ روگ پالنا کب گوارا تھا۔ انھوں نے انکار کر دیا۔ مومن خاں نے یہ شرط رکھی کہ ماہانہ سو روپے سے کم کی خدمت قبول نہ کروں گا۔ مولوی امام بخش کہ جن کا کوئی مستقل ذریعۂ معاش نہیں تھا انھوں نے یہ خدمت جس کی مقدار چالیس روپے ماہانہ تھی قبول کر لی جو بعد میں پچاس ہوگئی۔

مرحوم دہلی کالج کی ابتدا مدرسہ غازی الدین کے نام سے ۱۷۹۲ء میں ہوئی اور ۱۸۲۵ء میں یہ مدرسہ دہلی کالج میں تبدیل ہوگیا۔''۱۲

مولانا امام بخش صہبائی کا زیادہ تر وقت درس و تدریس میں گزرتا تھا۔ زندگی کے ابتدائی حصہ میں ان کا کوئی مستقل ذریعۂ معاش نہ ہونے کی وجہ سے امیر و غریب بچوں کو گھر پر درس دیا کرتے تھے۔ جب دہلی کالج میں فارسی استاد مقرر ہو گئے تو تعلیم و تعلّم ان کی زندگی کا ایک حصّہ بن گیا جس کا سلسلہ ان کی وفات تک جاری رہا۔ ہزاروں کی تعداد میں شاگردوں نے ان سے استفادہ کیا۔ لیکن افسوس صد افسوس کہ صہبائی کے شاگردوں کے متعلق بہت کم مواد دستیاب ہوتا ہے۔ حالاں کہ ان کے شاگردوں کی فہرست بہت طولانی ہے۔ البتہ ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جن کے بارے میں معلومات فراہم نہیں ہوسکی۔ شروع کے دنوں میں

صہبائی نے جن شاگردوں کو پڑھایا لکھایا تھا، ان کے حالات اور احوال تذکروں میں محفوظ نہیں ہیں۔ کیوں کہ وہ عہد خود صہبائی کے لیے آلام ومصائب اور پریشانی کا دور تھا اور تو اور ان کے شاگرد بھی زیادہ تر غریب ومفلس خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ چند سال بعد جب ان کی علمی لیاقت شہرۂ آفاق پر پہنچی تو کچھ رئیس گھرانوں کے بچے بھی ان سے تعلیم حاصل کرنے لگے۔ وہ طلبا میں بے حد مقبول تھے اور ان کے اکثر وبیشتر شاگرد علم وفضل میں اعلیٰ وارفع مقام رکھتے تھے۔ حافظ محمود شیرانی تحریر فرماتے ہیں:

''(صہبائی) طلبا میں بے حد مقبول تھے۔ ان کے شاگردوں کی فہرست بہت لمبی ہے۔ اکثر ایسے ہیں جنھوں نے فضیلت علمی کے ساتھ اچھے عہدے بھی حاصل کیے۔''۱۳؎

متعدد مآخذ کی ورق گردانی کے بعد صہبائی کے طلبا کا جو سراغ حاصل ہوا ہے اس کا ایک مختصر خاکہ ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

آزاد، شمس العلما مولوی محمد حسین: حافظ محمود شیرانی اور محمد یحییٰ مولانا محمد حسین آزاد کو صہبائی کا شاگرد قبول کرتے ہیں۔ شیرانی لکھتے ہیں:

''مولانا آزاد، صہبائی سے جوان کے شاگرد بھی ہوں گے، کسی وجہ سے خفا ہیں۔''۱۴؎

اور محمد یحییٰ تنہا تحریر فرماتے ہیں:

''مولوی محمد حسین آزاد، ماسٹر پیارے لال آشوب وغیرہ ان (صہبائی) کے شاگرد تھے۔''۱۵؎

آشوب، ماسٹر پیارے لال: صہبائی، غالب اور عبدالکریم سوز سے علم حاصل کیا۔ راجا ٹوڈرمل کے خاندان سے تعلق تھا۔

محمد حسین ہجر انصاری: ہجر نے اپنے استاد (صہبائی) کے رسالہ 'قول فیصل' کی اشاعت اور اس کے لیے زبان فارسی میں منظوم تقریظ لکھی تھی جس سے ان کی لیاقت اور صلاحیت کا کسی قدر اندازہ ہوتا ہے۔

پنڈت دھرم نارائن: صہبائی کے عزیز ترین شاگردوں میں سے ایک تھے۔

پنڈت سروپ نارائن: یہ پنڈت دھنی نارائن کے چھوٹے بھائی اور غالباً صہبائی ہی کے شاگرد تھے۔

مبتلا، پنڈت اجودھیا پرشاد: فارسی کتابوں کی تحصیل اور مشق سخن صہبائی سے کی۔

آہی، عبدالرحمن: پسر میر حسین تسکین، کتب درسیہ جناب استادی مولانا ومخدومنا مولوی امام بخش صہبائی سلمہ اللہ تعالیٰ سے تمام وکمال پڑھیں ہیں اور فن معما کو نہایت تحقیق وتدقیق کے ساتھ جناب موصوف سے حاصل کی۔

کچھ تمھیں بھی خبر ہے آہی کی
لوگ کہتے ہیں مر گئے کب کے ۱۶؎

اثر، عبدالرزاق: عبدالرحمن تمنا کے بیٹے تھے جو بڑے ہی ذہین، فطین اور خوش اخلاق تھے۔ شاہجہان آباد میں کافی دنوں تک صہبائی کی خدمت میں رہ کر فارسی کی تعلیم حاصل کی تھی۔

اصغری (کرانی)، محبوب علی شاہ رمال و جفار: شیخ محمد بخش قادری کے فرزند ارجمند اور امام بخش صہبائی کے شاگرد تھے۔

ایجاد، مرزا رحیم الدین: مرزا حسین بخش کے صاحبزادے اور امام بخش صہبائی اور مرزا قادر بخش صابر سے علم حاصل کیا۔ یہ صہبائی کے بہت خاص شاگرد تھے۔

اوج، لالہ جگل کشور: کایستھ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ فارسی میں طبع آزمائی کیا کرتے تھے۔

بسمل، نواب امیر حسن خان: صہبائی سے غائبانہ طور سے شاگردی کا سلسلہ قائم کیا اور اسے کتابت کے ذریعہ بہت استوار کیا۔

تسکین، میر حسین: یہ مومن اور صہبائی سے اصلاح سخن حاصل کیا کرتے تھے۔ صہبائی ان کو اس قدر دوست رکھتے تھے کہ ان کو دوست کہہ کے پکارتے تھے۔

بلبل، پنڈت گوری شنکر: لاہور کے باشندہ تھے اور شاہجہان آباد میں داخل ہوئے۔ صہبائی سے شرف تلمذ اور مرزا قادر بخش سے علم حاصل کیا۔

تمنا، عبدالرحمن: کتب فارسیہ کی تعلیم صہبائی سے حاصل کی۔

حسرت، منولال: مولوی صہبائی سے کتب فارسیہ کا علم حاصل کرتے تھے اور شعر فارسی کی اصلاح بھی انھیں سے لیا کرتے تھے۔

حسن علی، سید: یہ بھی صہبائی کے ہی شاگرد تھے۔

حیرت، حافظ عبدالرحمن: کتب درسیہ کی تعلیم اور ریختہ کی اصلاح صہبائی سے حاصل کیا کرتے تھے۔

رحیم، مرزا رحیم بیگ: انھوں نے مولانا صہبائی سے مستقیماً شاگردی کا شرف حاصل نہیں کیا تھا لیکن اصلاح کی غرض سے وہ اپنی نگارشات اور کاوشات ان کی خدمات میں بھیجا کرتے تھے۔

شمس العلما مولوی ذکاء اللہ: امام بخش صہبائی سے کتب درسیہ کی تعلیم حاصل کی تھی۔

رحمت، رحمت علی: یہ صہبائی کے قرابت دار تھے اور انھیں سے شاگردی کا شرف بھی حاصل ہوا۔

زار، حافظ امام بخش: یہ بھی صہبائی کی طرح تھانیسر کے رہنے والے تھے اور انھیں بھی صہبائی سے

ہی تلمذ حاصل تھا۔

سحرؔ،احمد علی خان: کتب فارسیہ کی تعلیم صہبائی سے حاصل کی۔

رفعتؔ،مرزا پیارے: ابتدا میں حافظ عبدالرحمن احسانؔ سے اصلاح سخن حاصل کرتے تھے لیکن بعد میں صہبائی کے شاگردوں کے حلقہ سے وابستہ ہو گئے۔

سوزؔ،عبدالکریم: صہبائی کے خلف رشید تھے اپنے والد سے تعلیم حاصل کی۔اپنے والد اور بھائی کے ساتھ ۱۸۵۷ء کی غدر میں انگریزوں کی گولیوں کا نشانہ بنے۔

شاہ رخ،مرزا: بہادر شاہ کے صاحبزادے تھے مولانا صہبائی ان کی تعلیم و تربیت پر مامور تھے۔

شررؔ،منسارام: مولانا امام بخش صہبائی سے کتب درسیہ کی تحصیل حاصل کی اور شعر کی اصلاح بھی صہبائی سے حاصل کیا کرتے تھے۔

شیدائیؔ،مولوی ابوالحسن: بچپن میں ہی اپنے وطن کو خیر آباد کہہ کر شاہجہان آباد میں تعلیم و تربیت کی غرض سے آئے اور صہبائی سے تعلیم حاصل کی۔

شیدائیؔ،مرزا رمضان بیگ: مغل خاندان سے نسبت رکھتے تھے اور صہبائی سے فارسی کی کتب درسیہ کی تعلیم حاصل کی۔

شفقتؔ،میر محمد حسین: وطن اصلی گلاؤٹھی تھا۔کسب فیض وکمالات کے لیے شاہجہان آباد کو آباد کیا اور وہیں صہبائی کی شاگردی نصیب ہوئی۔

شوقؔ عنایت اللہ: وطن فرید آباد،شاگردی مولوی امام بخش صہبائیؔ کی اختیار کی۔

حالیؔ،میر علی تھانیدار: فارسی میں مہارت رکھتے ہوئے بھی صہبائی کی شاگردی نے اسے اور زیادہ ضیا و جلا بخشی۔

ضربؔ،مولوی رحیم بخش: صہبائی کے قرابت دار اور ان (صہبائی) سے اور ان کے بیٹے عبدالکریم سوزؔ کی شاگردی قبول کی۔

صابرؔ،مرزا قادر بخش: مولانا صہبائیؔ کے ارشد شاگردوں میں شمار ہوتے ہیں۔

مولوی صدرالدین خاں: مولانا امام بخش صہبائی سے علوم متداولہ حاصل کیا۔

عزیزؔ،عبدالعزیز: صہبائی کے فرزندار جمند تھے اور انھیں سے شرف تلمذ حاصل ہوا۔

عیشؔ،رائے عزت سنگھ: ریختہ میں شاہ نصیر اور فارسی میں صہبائی سے شرف تلمذ تھا۔

فروغؔ،مرزا بلند بخت: مرزا قادر بخش کے برادر بزرگ،صہبائیؔ سے کسب علم کیا۔

قاصرؔ،حکیم علی حسین: فارسی میں صہبائیؔ سے مشورہ لیا کرتے تھے۔

غریبؔ،غریب اللہ: ابتدائی دور میں مومن سے اصلاح لیا کرتے تھے لیکن بعد میں صہبائی کے طلاب کے حلقہ میں شامل ہو گئے۔

فغانؔ،پنڈت لال جی پرساد: صہبائی سے فارسی کی تعلیم حاصل کی۔

قناعتؔ،مرزا غلام نصیرالدین: پہلے مشق سخن احسانؔ سے حاصل کی۔بعد میں صہبائی اور صابرؔ کی شاگردی اختیار کی۔

قلقؔ،مولا بخش: ۱۸۱۴ء کے آس پاس پیدا ہوئے،صہبائیؔ سے فارسی کی تکمیل کی۔

قلقؔ،سلطان خاں: مولانا امام بخش صہبائیؔ کے شاگرد تھے۔

مولوی کریم الدین: یہ صہبائیؔ کے خرمن کے خوشہ چیں تھے۔

ماہرؔ،جمعیت شاہ: صہبائیؔ،صابرؔ اور سوز کے شاگردوں میں سے تھے۔

نثارؔ،سید نثار علی: مولوی عبداللہ خان علوی اور صہبائیؔ سے تعلیم حاصل کی۔

محویؔ،محمد بیگ: نظم و نثر فارسی اور ریختہ میں صہبائی کی شاگردی اختیار کی۔

نامی بلدیو سنگھ: صہبائیؔ کے شاگردوں کی فہرست میں شامل تھے۔

ہجر انصاری،محمد حسین: صہبائی سے کسب فیض کا شرف حاصل تھا۔

نکہتؔ،حافظ غلام احمد: صہبائی سے علوم وفنون جدیدہ حاصل کیا۔

ڈپٹی نذیر احمد: صہبائی سے خاندانی نسبت رکھتے تھے اور انھیں سے علم بھی حاصل کیا۔

نور حقؔ شاہ محمد جمیل: ریختہ کہتے تھے۔صہبائی سے کسب فیض کیا۔

یقین واسطی گلاؤٹھوی،محمد حسین: امام بخش صہبائی کے چنندہ شاگردوں میں سے ایک تھے۔

اکثر و بیشتر معاصرین سے صہبائیؔ کے تعلقات بہت ہی اچھے اور خوش گوار تھے اور شاید ہی کوئی شخص ہوگا،جس کے ساتھ ان کے ارتباط اور مراسم اچھے نہ رہے ہوں۔ذیل میں ان کے چند ہم عصروں کا ذکر اختصار کے ساتھ کیا جاتا ہے:

سرسید احمد خاں: ان کی ولادت ۱۲۳۲ھ/ ۱۸۱۷ء میں ہوئی۔اس لحاظ سے سرسید،صہبائی سے عمر میں کافی چھوٹے تھے۔وہ صہبائی کی ایک بڑے بھائی کے نظریے سے بہت تعظیم وتکریم کرتے تھے۔

آزردہ: مفتی صدرالدین آزردہ کی پیدائش ۱۲۰۴ھ/ ۱۷۸۹ء میں ہوئی۔آزردہ سے امام بخش صہبائی اتنے متاثر تھے کہ ان کو وہ ایرانیوں کا ہم پلہ تصور کرتے تھے۔

چو دیدم غالبؔ و آزردہؔ را از ہند صہبائی
بخاطر ہیچ یاد از خاک ایرانم نمی آید ۱۷

آزردہ بھی صہبائی کے اتنے عقیدت مند تھے کہ جب صہبائی کی شہادت ہوئی تو اس کا ان پر اتنا اثر ہوا کہ بے ساختہ کہہ اٹھے ۔

کیوں کر آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہوں
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہوں

شیفتہؔ: نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ ۱۲۲۱ھ/ ۱۸۰۶ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی نظر میں صہبائی کی تحریر اتنی با منزلت تھی کہ انھوں نے اسے اپنے تذکرے کے لیے باعث زینت سمجھ کر اس میں شامل کیا۔

فضل حق خیر آبادی: ۱۲۱۲ھ/ ۱۷۹۷ء میں ولادت ہوئی۔ صہبائی سے ان کے تعلقات استوار تھے اور کبھی بگڑے نہیں۔

غالبؔ: غالب بھی صہبائی کی صلاحیتوں کا اور ان کی شاعری کا اعتراف کرتے تھے۔

ذوقؔ: ذوق تخلص، نام شیخ محمد ابراہیم سال ولادت ۱۲۰۵ھ/ ۱۷۹۰ء، مولانا امام بخش کے ہم عصر تھے۔

حکیم مومنؔ خاں مومن: حکیم مومن خاں مومن کی ولادت ۱۲۱۵ھ/ ۱۸۰۰ء میں دہلی کے ایک مشہور محلہ کوچہ چیلاں میں ہوئی۔ یہ تقریباً صہبائی سے چھ سال بڑے تھے۔

علویؔ: صہبائی کے عہد کے مشہور عالم عربی اور فارسی کے ماہر، علم طب میں مہارت رکھتے تھے۔ عبداللہ خان علوی سے ہی صہبائی نے علم حاصل کیا تھا۔

تفتہؔ: ان کا پورا نام منشی ہر گوپال تفتہ تھا۔ یہ بڑے مشہور فارسی داں تھے۔

نیرؔ: یہ صہبائی کے ہم عصروں میں ہیں۔ فارسی جانتے تھے۔

اشرفؔ: یہ بھی صہبائی کے ہم عصروں میں سے تھے۔ اچھے فارسی داں تھے۔ ۱۸۵۷ء/ ۱۲۷۴ھ میں صہبائی انگریزوں کے ہاتھوں شہید کر دیئے گئے۔ ان کی موت کا واقعہ نہایت دردناک ہے۔ مفتی انتظام اللہ شہابی ان کی شہادت کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

''مولانا امام بخش صہبائی اور ان کے دو بیٹے، میر نیاز علی قصہ خوان اور چیلوں کے کوچے کے اور بہت سے شریف خاندانی لوگ، سنا گیا ہے کہ اسی محلے کے چودہ سو آدمی گرفتار کر کے راج گھاٹ کے دروازے سے دریا پار لے جا کر بندوقوں کی باڑیں مار دی گئیں۔ لاشیں دریا

میں پھنکوا دی گئیں۔''۱۸

صہبائی کی موت پر اکبر نے اپنے رنج و غم کا اظہار ان اشعار میں کیا ہے۔

نوجوانوں کو ہوئی پھانسیاں بے جرم و قصور مار دی گولیاں پایا جیسے کچھ روز آور
وہی صہبائی جو تھے صاحب قول فیصل ایک ہی ساتھ ہوئے قتل پدر اور پسر ۱۹

صہبائی کی فارسی تصانیف: مولانا امام بخش صہبائی شہید نے تقریباً چون برس کی عمر پائی اور اس مختصر سی حیات میں انھوں نے فارسی نظم ونثر کی چھوٹی بڑی تقریباً تین درجن کتابیں لکھیں۔ ان کی تصانیف نایاب ہیں۔ ان میں بعض کا کوئی سراغ ہی نہیں ملتا۔ کچھ ایسی ہیں کہ صرف جن کے نام کا پتا چلتا ہے لیکن دستیاب نہیں ہیں۔

صہبائی کے ادبی کارنامے کلیات کی شکل میں آج بھی موجود ہیں۔ ان کی کلیات دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ دوسری جلد کے دو حصے ہیں۔ حصہ اول و حصہ دوم۔ کلیات کی پہلی جلد صہبائی کے عزیز شاگرد منشی دین دیال کی کوشش سے مع ان کے دیباچے کے ۹۶۔ ۱۲۹۵ھ ۷۹۔ ۱۸۷۸ء میں مطبع نظامی کانپور سے چھپی تھی۔ ان کے کچھ اور شاگرد جیسے مولوی حسین ہجر ناظم عدالت اندور اور منشی دھرم نرائن میر منشی ایجنٹی سینٹرل انڈیا اور لالہ بلدیو سنگھ نامی نے بھی اس کی ترتیب و طبع میں کافی تعاون دیا۔ سید محمد صدیق اور مولوی محمد حسین ہجر نے تصحیح کا کام انجام دیا۔ ۲۰

کلیات صہبائی کی جلد اول ذیل کی تصانیف پر مشتمل ہے۔ ابتدا میں مرتب کلیات صہبائی، منشی دین دیال کا تقریباً چار صفحات کا ایک مقدمہ بھی ہے۔

ریزۂ جواہر: یہ تصنیف صہبائی نے مرصع عبارت میں لکھی ہے۔ صہبائی کی تمام تصنیفات میں اسی تصنیف کو خاص اہمیت اور منزلت حاصل ہے کیوں کہ یہ سہ نثر ظہوری کے طرز پر لکھی گئی ہے۔ جس طرح ظہوری نے اپنے ممدوح ابراہیم عادل شاہ کو نو اوصاف سے مزین کیا ہے اسی طرح صہبائی نے بھی اس رسالے کو بہادر شاہ ظفر کی تعریف میں لکھا ہے۔ انھوں نے اپنے ممدوح کو سات اوصاف مثلاً معرفت، اتباع شریعت، سخنوری، عیش و عشرت، سخاوت، شجاعت اور عدالت سے متصف کیا ہے۔

فرہنگ ریزۂ جواہر: یہ رسالہ کوئی جداگانہ رسالہ نہیں ہے بلکہ رسالہ ریزۂ جواہر کے ہی حاشیہ پر جن مشکل الفاظ کی تشریح کی گئی اسی کا نام فرہنگ ریزہ جواہر رکھا گیا ہے۔ یہ فرہنگ ہر چہ مختصر ہے مگر ''ہر کہ بقامت کہتر بہ قیمت بہتر'' کے مصداق اہم اور سودمند ہے۔

بیاض شوق پیام: بیاض شوق پیام تقریباً ۱۶۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس بیاض میں صہبائی کی وہ

تقریظیں بھی ہیں جو انھوں نے حافظ، سرسید، آزردہ اور مولوی عبداللہ خان علویؔ کی تالیفات پر تحریر کی تھیں۔ ان کے علاوہ صہبائی کے خطوط بھی اسی میں شامل ہیں۔ ان خطوط میں کوئی بات قابل ذکر نہیں ہے۔ الفاظ کی رنگینی تو ہے پر مطالب کی کم مائیگی بھی ہے لیکن اپنے استاد مولوی عبداللہ خان علوی کو لکھے ایک رقعہ میں 'مین پوری' کے واقعات اور حالات کا ذکر ہے۔

رسالہ در نحو فارسی: ۱۷ صفحات پر مشتمل یہ رسالہ فارسی زبان کے نحو و قواعد کے مسائل پر ہے، جو کہ فارسی سیکھنے اور سکھانے پڑھنے اور پڑھانے والوں کے لیے نہایت اہم اور کارآمد ہے۔

کافی در علم قوافی: اس رسالے میں علم قوافی اور مختلف حروف و حرکات کی شرح، اس کی خوبیاں اور عیوب کا بیان، اساتذہ کے اشعار کے ساتھ اور شمس بن قیس رازی اور احمد بن خلیل کے اقوال و دلائل کے ساتھ ہے۔ یہ رسالہ دراصل عروض و قوافی کے اصول و قواعد پر مبنی ہے۔

وافی شرح کافی: یہ رسالہ کافی کی شرح ہے جس میں صہبائی نے علم قوافی کے دقیق نکات اور باریک رموز کو دو صفحات میں واشگاف کیا ہے۔

رسالہ گنجینۂ رموز: صہبائی کی یہ ایک عجیب و غریب تصنیف ہے جس میں فن معما کے دقیق مسائل اور ان کا حل بیان کیا گیا ہے۔ اس میں ایک بیت سے ۳۶۰ مختلف نام مستخرج ہوتے ہیں۔ اس رسالے میں صہبائی نے اعمال معمائی کی تشریح بڑی اچھی طرح سے کی ہے۔

جواہر منظوم: صہبائی کا یہ رسالہ ۳۰ صفحات پر مشتمل رباعیات کا مجموعہ ہے۔ اپنے فن (معما) میں گوہر نایاب ہے۔ انھوں نے معما کی طرز پر رباعی کہہ کر اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام نکالے ہیں اور اس کے حاشیے میں اس کے استخراج کا طریقہ بھی بیان کیا ہے۔

قطعہ معمائی: ۳ صفحات پر مشتمل قطعہ ہے جس میں اللہ کے نام سے علی کا نام اور علی کے نام سے اللہ کا نام نکلتا ہے۔

رسالہ نادرہ: صہبائی کا یہ رسالہ فن معما کی مختلف مصطلحات کے بیان میں ہے۔ اس رسالے میں انھوں نے اعمال معمائی کی تشریح بھی کی ہے۔

مخزن اسرار: یہ رسالہ ملّا کوبکی کے ایک بیت سے مختلف ناموں کے استخراج کے بیان میں ہے جو ۵۷ صفحات پر مبنی ہے۔

نتائج الافکار: یہ ایک مختصر رسالہ ہے، جو بطور بیاض مرتب کیا گیا ہے۔ مولانا صہبائی نے اس میں مدت العمر کے تجربات، نتائج اور تاثرات کا احاطہ کیا ہے۔ اس رسالے کو دو فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلی

فصل صنعت معما کے متعلق ہے جس میں مولانا صہبائی نے اپنے اور کچھ دوسرے اساتذہ کے فن معما کا حل بیان کیا ہے۔ دوسری فصل میں ان امور کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اہل ہند کے فارسی داں بے راہ روی کے شکار ہیں۔ یہ بیاض ۴۳ صفحات پر مشتمل ہے۔

غوامض سخن: رسالہ غوامض سخن میں صہبائی نے زبان فارسی کے لفظوں، محاوروں اور ترکیبوں کی الفبائی ترتیب سے تشریح کی گئی ہے اور اس کی سند میں اساتذہ کا کلام پیش کیا ہے۔ اس نظریے سے یہ ایک کارآمد اور مفید رسالہ ہے۔ یہ رسالہ ۸۳ صفحات پر مشتمل ہے۔

تحقیق دوائر: مرزا قادر بخش صابر کے تذکرہ گلستان سخن کے مطالعے سے امام بخش صہبائی کی اس تصنیف و تالیف کا پتا چلتا ہے۔ اس کا نسخہ کہیں نہیں ملتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسالہ صہبائی کامل نہیں کر سکے تھے یا تو یہ حوادث روزگار کی نذر ہو گیا۔

رسالہ اعلاء الحق: یہ رسالہ ۱۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں صہبائی نے ان اعتراضات کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جو 'احقاق الحق' میں سراج الدین علی خاں نے علی حزیں پر لگائے تھے۔

مذکورہ بالا ساری تصانیف کلیات صہبائی کی جلد اول میں شامل ہیں۔ جن کو منشی دین دیال نے ۱۲۹۵ھ میں مرتب کر کے مطبع نظامی کانپور سے شائع کیا تھا۔

کلیات صہبائی کی دوسری جلد مشمولہ حصہ اول و دوم انھوں نے ۱۲۹۶ھ/ ۱۸۷۹ء میں جداگانہ مطبع نول کشور لکھنؤ سے چھپوایا تھا۔ دوم کے دو حصے ہیں۔ جلد دوم کے حصہ اول میں درج ذیل تصانیف شامل ہیں۔

شرح سہ نثر ظہوری: چوں کہ سہ نثر ظہوری کی نثر کی مرصع عبارت کی پیچیدگی کو سمجھنے میں لوگ قاصر تھے۔ لہٰذا اس کے افادہ کو عوامی کرنے کے لیے اس کی متعدد شرحیں تحریر کی گئیں۔ اس کا سلسلہ صہبائی سے پہلے آغاز ہو گیا تھا۔ لیکن صہبائی کی شرح دوسری شرحوں کے مقابلے میں نہایت وقیع اور اہمیت کی حامل ہے۔ انھوں نے شرح تحریر کرتے وقت زبان و بیان کے تمام رموز و نکات پر روشنی ڈالی ہے۔

شرح مینا بازار: چوں کہ ان رسالوں سے صہبائی کو اپنے فرزندوں کی تعلیم و تربیت کی فکر دامن گیر تھی لہٰذا شرح سہ نثر ظہوری کے بعد انھیں کی تعلیم و تربیت کے لیے اس رسالے کی تشریح کی طرف بھی متوجہ ہوئے۔ شارح (صہبائی) نے الفاظ کی تحقیق، عبارت کی تشریح اور متعلقات کی وضاحت کا حق بخوبی ادا کر دیا۔

شرح پنج رقعہ: صہبائی سے قبل پنج رقعہ کی متعدد شرحیں تحریر کی گئی تھیں، جن میں عبدالرزاق کی شرح عمدہ ہے لیکن صہبائی کو اس شرح سے اطمینان قلب نہ تھا اور طلاب کے لیے مفید نہیں سمجھتے تھے۔ اس لیے

انھوں نے اپنے فرزندوں کے لیے اور سرسید کی فرمائش پر اس کی شرح لکھنے پر آمادہ خاطر ہوئے۔ دوسری شرح کی طرح اس میں بھی وہی اصول وضوابط قائم کیا۔

شرح شبنم وشاداب: شرح شبنم وشاداب صہبائی کی ابتدائی شرحوں میں شمار کی جاتی ہے۔ ۲۵ صفحوں کے اس رسالہ کی تشریح میں انھوں نے ۲۰۷ صفحات استعمال کیے۔ چوں کہ صہبائی قواعد زبان، علم بیان و عروض وقوافی میں خصوصی مہارت رکھتے تھے اور لغوی، اصطلاحی، املائی، تلمیحی اور دوسرے فنی امور ومسائل پر وہ مہارت تامہ رکھتے تھے اس لیے باریک سے باریک مسائل ان کی گرفت میں با آسانی آجاتے تھے۔

کلیات صہبائی کی جلد دوم کا حصہ دوم مندرجہ ذیل تصانیف پر مشتمل ہے:

شرح حسن وعشق: اس شرح میں مولانا صہبائی نے تدقیق معانی کا حق ادا کیا ہے چوں کہ زبان فارسی کے قدیم فنون اور مستند مآخذ اور اساتذہ کے دواوین پر ان کی گہری نظر تھی۔ اسی وجہ سے انھوں نے ہر جگہ اپنی قابلیت کا استعمال کر کے شرح کو ایک مستند ماخذ کا حامل بنا دیا ہے۔

شرح معمائی نصیرؔ ہمدانی: اس شرح کے مختلف اسامی ہیں جیسے شرح معمائی ہمدانی، شرح نصیرائی ہمدانی اور حل مقامات انشائے نصیرؔ ہمدانی۔ اس میں فقط معما ہی کی تشریح کی گئی ہے۔ دور حاضر میں ایسے عالم ملتے ہی نہیں ہیں جو اس فن میں مہارت رکھتے ہوں۔

شرح معمائے جامیؔ: شرح کی ابتدا میں صہبائی نے معما کی تعریف وتوصیف اور اس سلسلے میں جامی اور دوسرے اساتذہ کے اقوال کو نقل کیا ہے۔ انھوں نے اس کتاب کی تشریح بڑی مہارت سے کی ہے، اور اس کے معانی اور مطالب کو دل کش اور رنگین عبارتوں کے ذریعے واشگاف کیے ہیں۔

رسالہ مناقشات سخن: مولانا صہبائی کے دور میں مولوی امام علی مقتول نے خطوط کی شکل میں اپنی انشا پردازی کا نمونہ پیش کیا، اور اس پر مولوی مقتول کو بڑا ناز تھا۔ اس پر صہبائی نے ان کی مخالفت میں قلم اٹھایا اور ان کی انشا پردازی کا مقائسہ کر کے ایک محاکمہ کتابی صورت میں پیش کیا اور ان کی لفظی، نحوی اور معنوی غلطیوں کی نشاندہی کی۔

قول فیصل: صہبائی کا رسالہ قول فیصل اپنے دور کا بہترین اور معیاری رسالہ شمار کیا جاتا ہے، اس نقطۂ نظر سے اس کی شہرت بھی کافی ہوئی۔ یہ رسالہ اصل میں 'اعلاء الحق' کی طرح بطور محاکمہ لکھا گیا ہے۔ اس ادبی محاکمہ میں مولانا صہبائی نے جانب داری سے کام نہیں لیا ہے بلکہ بلا لحاظ دونوں نابغۂ زمانہ کا مقائسہ اور موازنہ پیش کیا ہے اور حق کی نشاندہی کی ہے۔

دیوان صہبائی: دیوان صہبائی کلیات کی جلد اول میں شامل ہے جس میں ردیف وار ۶۱ غزلیں، ۶

قصائد، ۴ فردیات، ۱۲ رباعیات اور ایک مخمس شوکت بخاری کی غزل پر شامل ہیں۔ دیوان صہبائی کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ان کی شعری شخصیت کی تعمیر وتشکیل میں طرز بیدل کا اثر ہے۔ اگرچہ ان کے اشعار میں طرز بیدل کے اثرات واضح اور روشن طور پر پائے جاتے ہیں مگر اس کے باوجود بھی ان کی انفرادیت برقرار ہے۔

رسالہ حل مقامات جواہر الحروف: اس رسالہ کا ذکر 'شرح سہ نثر ظہوری' میں ایک سے زائد جگہ پر آیا ہے۔ لیکن اب یہ رسالہ ناپید ہے۔ لیکن کلیات صہبائی کی جلد اول میں اس کا دیباچہ ملتا ہے۔ صہبائی نے اس میں تحریر کیا ہے کہ انھوں نے جواہر الحروف کے جس نسخہ سے استفادہ کیا تھا، وہ مصنف کا خود نوشت تھا۔

شرح مختصر رسالہ جواہر الحروف: 'رسالہ حل مقامات جواہر الحروف' کو علمی حلقوں میں بہت سراہا گیا۔ اس کو دیکھتے ہوئے صہبائی کے دوست واحباب نے رسالہ جواہر الحروف کی مختصر سی شرح لکھنے کی فرمائش کی، اور وہ ان کی فرمائش اور خواہش کو نظر انداز نہ کر سکے۔ یہ رسالہ بھی رسالہ حل مقامات جواہر الحروف کی طرح ناپید ہو گیا اور فقط اس کا دیباچہ کلیات صہبائی کی پہلی جلد میں موجود ہے۔

شرح الفاظ مشکلہ ٹیک چند بہار: مولوی کریم الدین کے بیان کے مطابق شرح الفاظ مشکلہ ٹیک چند بہار کے نام سے صہبائی کی ایک کتاب ۱۸۴۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ محققین کے نزدیک یہ طے نہیں ہو پایا ہے کہ یہ الگ رسالہ ہے یا شرح جواہر الحروف کا ہی دوسرا نام ہے۔

رسالہ حل مقامات عبدالواسع ہانسوی: یہ کوئی مستقل کتاب نہیں ہے بلکہ صہبائی کے شاگردوں نے تعلیم کے دوران جو بھی فوائد واشارات ان سے فراہم کیے تھے ان کی جمع آوری کی تھی۔ منشی دین دیال نے ان کو یکجا کر کے کلیات صہبائی میں شامل کر دیا ہے۔ رسالہ اگرچہ مختصر ہے مگر مطالب ومفاہیم کے اعتبار سے بہت گراں قدر اور استفادہ کے لائق ہے۔

رسالہ حرف فارسی: فہرست مخطوطات فارسی کتابخانۂ رضا، رام پور، صفحہ ۳۴۵ میں صہبائی کی ایک اور کتاب بعنوان 'رسالہ حرف فارسی' دستیاب ہے۔ یہ رسالہ ۱۹۴ اوراق پر مشتمل ہے، جس کی کتابت غلام حسین خان رام پوری نے کی ہے۔

☆☆☆

حوالہ جات:

۱۔ قومی تہذیب کا مسئلہ، سید عابد حسین، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۱۹۸۰ء، ص ۷۷

۲۔قومی تہذیب کا مسئلہ، ڈاکٹر سید عابد حسین، ص ۱۱۱

۳۔تحقیقی مطالعۂ حالی، ظہیر احمد صدیقی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، سول لائن علی گڑھ، ص ۱۱

۴۔مسالک ومنازل، ضیاء احمد بدایونی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۱۱ء، ص ۳۴۲

۵۔صہبائی کی فارسی تصانیف کا تنقیدی مطالعہ، ڈاکٹر زاہدہ پٹھان، کبیر کالونی، انٹرنیشنل پرنٹنگ پریس، علی گڑھ، ۱۹۹۳ء، ص ۴۰

۶۔گلستانِ سخن، مرزا قادر بخش صابر، ج دوم مجلس ترقی ادب، لاہور، ص ۱۴۷

۷۔کلیات صہبائی (خاتمہ)، نظامی، کانپور، ص ۸۱۱

۸۔صہبائی ایک مختصر تعارف، ڈاکٹر محمد انصار اللہ، ناشر مصنف، ۱۹۸۶ء، ص ۱۴

۹۔تذکرہ ہزار داستان المعروف بہ خمخانہ جاوید، ج ۵، جناب لالہ سری رام، ص ۵۸۵

۱۰۔صہبائی ایک مختصر تعارف، ڈاکٹر محمد انصار اللہ، ناشر ڈاکٹر محمد انصار اللہ، ۱۹۸۶ء، ص ۲۱

۱۱۔طبقات شعرائے ہند، مولوی کریم الدین، طبقۂ چہارم، ص ۳۷

۱۲۔مرحوم دہلی کالج، ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب، انجمن ترقی اردو، (ہند) دہلی، ۱۹۴۵ء، ص ۲

۱۳۔مقالات حافظ محمود شیرانی، سید امتیاز علی تاج، ستارۂ امتیاز ناظم مجلس ترقیِ ادب، لاہور، ۱۹۶۹ء، ص ۱۴

۱۴۔مقالات حافظ محمود شیرانی، ج ۳، سید امتیاز علی تاج مجلس ترقی ادب، لاہور، شفیق پریس، لاہور، ۱۹۶۹ء، ص ۱۸۸

۱۵۔سیر المصنفین، محمد یحییٰ تنہا، جلد ۱، عالم گیر الیکٹرک پریس، لاہور، ص ۲۳۴

۱۶۔گلستان سخن ج ۱، مرزا قادر بخش صابر دہلوی، سید امتیاز علی تاج مجلسِ ترقی ادب، لاہور، شفیق پریس لاہور، ۱۹۶۶ء، ص ۴۴۔۲۴۳

۱۷۔کلیات صہبائی (دیوان صہبائی)، منشی دین دیال، ج ۱ مطبع نظامی، کانپور، ص ۲۵۹

۱۸۔غدر کے چند علما، مفتی انتظام اللہ شہابی اکبر آبادی، دینی بک ڈپو، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی، ص ۲۷

۱۹۔غدر کے چند علما، مفتی انتظام اللہ شہابی اکبر آبادی، ص ۲۷

۲۰۔مسائل ومنازل، ضیاء الدین بدایونی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی، ۲۰۱۱ء، ص ۳۴۲

☆☆☆

ڈاکٹر عائشہ عبدالعزیز پٹھان

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، پنیہ شلوک اہلیہ، دیوی ہولکر شولا پور یونیورسٹی، شولا پور

علامہ راشد الخیری کی شخصیت

تلخیص:

غدر کے بعد ہندوستان کی سیاسی، سماجی، تہذیبی اور تعلیمی زندگی میں ایک زبردست تبدیلی رونما ہوئی۔ اس وقت ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ مسلمانوں میں تعلیم سے عام بیزاری کو دور کرنا تھا۔ ایسے میں سرسید نے مسلمانوں کو جدید تعلیم سے روشناس کرانے کا بیڑا اٹھایا۔ ایسے وقت میں ادبا نے بھی اصلاحی ادب بالخصوص تعلیم نسواں کی ترغیب کے لیے ادب تخلیق کرنے کی طرف توجہ دی۔ ان ہی میں ایک راشد الخیری بھی ہیں، جو صحیح معنوں میں نذیر احمد کے جانشین تھے۔ انھوں نے بیشتر تصانیف میں طبقۂ نسواں کے مسائل اور ان کی ذہنی کشمکش اور الجھنوں کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ ان کے فن، کارنامے اور اردو ادب پر ان کارناموں کے اثرات کا جائزہ اور مطالعہ ہر لحاظ سے توجہ طلب ہے۔ اسی مقصد کے تحت یہ مضمون لکھا جا رہا ہے، جس میں راشد الخیری، اردو کے ممتاز اور محسن نسواں کی زندگی کے حالات اور مکمل روداد موجود ہے۔

ایک زمانہ وہ بھی تھا جب راشد الخیری کے ناول اور ان کی بہت سی تحریریں مختلف سطحوں پر اسکولوں اور کالجوں کے نصاب میں شامل تھیں۔ آزادی سے پہلے ہر سال دو سال کے بعد ان کی بعض کتابوں کے نئے ایڈیشن شائع ہوتے گئے مگر آزادی کے بعد یہ سلسلہ بند ہو گیا۔ اس لیے راشد الخیری جیسے صاحبِ طرز اور صاحب اسلوب کی تحریریں بہت کم پڑھی جاتی ہیں یا بالکل نہیں پڑھی جاتیں۔ یہ بدنصیبی راشد الخیری کی نہیں، ہماری ہے کہ ہم اپنے عظیم ادبی اور تہذیبی سرمائے سے محروم ہوتے جا رہے ہیں ان کی تصانیف دہلوی نثر کا بہترین نمونہ ہیں، اور دہلی کے سماجی اور تاریخی واقعات کا اہم ماخذ ہیں۔ ان کی خدمات کو اردو ادب کی تاریخ میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

کلیدی الفاظ:

علامہ راشدالخیری، ولادت، حلیہ، شادی، ملازمت، ابتدائی تخلیق، سیرت وشخصیت، وضع داری۔

علامہ راشدالخیری دلّی کے اس مقتدراورممتاز خاندان کے فرزندِرشید تھے،جس کا سلسلۂ نسب رسولِ اکرم کے جلیل القدر صحابی عکرمہ بن ابوجہل سے ملتا ہے،اورجس کو خاندانِ مغلیہ کے استاد رہنے کا نسل درنسل فخر حاصل رہا ہے۔ یہ وہ خاندان تھا جس نے مولوی عبدالقادر مرحوم ،مولوی عبدالخالق مرحوم ، اور مولوی عبدالرب جیسے جید علما اور قرآن وحدیث کے ماہرین پیدا کیے۔ علامہ کے والد حافظ عبدالواجد صاحب انگریزی میں ماہر تھے۔ وہ پہلے ہندوستانی تھے جو منصف مقرر ہوئے۔آپ کی والدہ رشیدالزمانی صاحبہ اردو کی شاعرہ تھیں۔علامہ راشدالخیری کی پیدائش دہلی میں ۱۸۶۸ء میں ہوئی۔عبدالقادر صاحب نے اپنے پوتے کا نام عبدالراشد رکھا اورصحیح معنوں میں علامہ نے اپنی قوم کو ہدایت دینے کا حق ادا کیا۔[۱]

علامہ نے سب سے پہلے قرآن شریف اپنی دادی سے پڑھا۔اس کے بعد دلّی کے عربک اسکول میں داخل ہوئے ،لیکن مدرسے میں انھیں انگریزی کے کسی مضمون سے دلچسپی نہیں تھی اس کے باوجود اس مضمون میں ہمیشہ اپنی جماعت میں اول رہتے تھے،اوراسی وجہ سے جماعت میں کبھی فیل نہیں ہوئے۔اس سلسلے میں انھوں نے خود ایک واقعہ اپنے بیٹے رازق الخیری کو سنایا تھا کہ:

”میں ساتویں یا آٹھویں جماعت میں تھا کہ امتحان ہوا۔ایک ہم جماعت تھے عبدالرشید، ان کا حساب بہت اچھا تھا لیکن انگریزی کمزور تھی اور انگریزی میں میرے ۱۰۰ میں سے ۸۸ نمبر آتے تھے اور عبدالرشید کے سولہ۔۔۔بے چارے عبدالرشید فیل ہوگئے اور میں اول آ گیا۔“[۲]

مگر والد اوردادا کی شفقت سے محروم ہونے کے بعد انھوں نے نویں جماعت میں اسکول جانا چھوڑ دیا اوراس کے بعد ان کے پھوپھا ڈپٹی نذیراحمد کی نگرانی میں ان کی تعلیم مکمل ہوئی۔علامہ کو سیر وتفریح کا بہت شوق تھا اور موسیقی سے بہت دلچسپی تھی۔ بانسری بہت اچھی بجاتے تھے۔کبڈّی کے بہت اچھے کھلاڑی تھے اور کرکٹ بھی اچھا کھیلتے تھے۔انھیں تیراکی کا بہت شوق تھا۔پچیسی اورتاش تواس وقت ایک عام چیز تھی۔گھر گھر میں کھیلی جاتی تھی۔علامہ نے اپنے لڑکپن میں پتنگ بازی بھی کی اوراپنے چچازاد بھائیوں کے ساتھ گلی ڈنڈا بھی کھیلا۔ان کا یہ سیر وتفریح کا شوق اورکھیلوں سے دلچسپی آخری عمر تک رہی۔

حلیہ: لمبا قد۔جوانی میں رنگ صاف، بڑھاپے میں گندمی لیکن چہرہ پر سرخی ،بدن کسرتی ،ڈیل

بھاری،جسم دوہرا،سینہ کشادہ،چہرہ کتابی،وجیہ اور بارعب،پشت کے اوپر کا حصہ چلتے وقت جھکا ہوا معلوم ہوتا تھا۔کلائی کی ہڈی چوڑی،چہرے پر داڑھی بھری ہوئی،مونچھیں اوسط جھکی ہوئی،عینک صرف لکھتے یا پڑھتے وقت دس بارہ سال سے لگانے لگے تھے۔آگے اوپر کا ایک دانت، بائیں طرف کا اور کئی ڈاڑھیں ٹوٹ گئی تھیں۔دائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور کلمہ کی انگلی کے درمیان روپیہ کے برابر لسّن تھا۔جب لکھتے تھے تو اس لسن پر ہی قلم کا بالائی حصہ ہوتا تھا۔

بال انھوں نے بڑے نہیں رکھے، ہمیشہ خش خش رکھے۔داڑھی ہمیشہ رکھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ اگر بڑھ گئی تو خود بھی کتر کر چھوٹی کر لی۔ان کے سراور داڑھی کے بال پچاس پچپن سال کی عمر ہی میں سفید ہو گئے تھے۔مونچھیں کترے اور جھکی ہوئی رکھتے۔گرمیوں میں روزانہ صبح وشام اور کبھی تیسرے پہر بھی غسل کیا کرتے اور جاڑے میں پانی گرم کروا کر دوسرے تیسرے دن غسل کرتے۔صابن غسل کرتے وقت یا منہ دھوتے وقت بہت کم استعمال کرتے۔کوئلے کے منجن سے علی الصبح روزانہ دانت مانجھتے تھے۔دانت پچاس سال کے بعد ٹوٹنے شروع ہوئے تھے۔

شادی ،ملازمت اور ابتدائی تخلیق : راشدالخیری اپنے خاندان کے بڑے بیٹے کے پہلے پوتے تھے۔اس لیے ددھیال ونھیال میں سب کو ان سے بے حد محبت تھی۔دادا،دادی اور پھوپھیوں کی آنکھ کے تارے تھے۔دادا کے جگر کی ٹھنڈک تھے۔آخری عمر میں دادا کی آنکھیں جاتی رہی تھیں،لیکن وہ خود مدرسے چھوڑنے اور لینے جاتے تھے۔مگر باپ کے بعد دادا کی شفقت سے بھی محروم ہو گئے تو مدرسے سے دل اچاٹ ہو گیا۔نویں جماعت میں تھے کہ اسکول جانا بند کر دیا اور گھر پر رہنے لگے۔سارا دن چھت پر گاتے، تاش کھیلتے، پتنگ اڑاتے اور باہر نکلنے کا موقع ملتا تو شام کو کرکٹ کھیلتے۔راشدالخیری کے چچا خان بہادر عبدالحامد ڈپٹی کلکٹر جن کی سرپرستی میں راشدالخیری باپ اوردادا کے انتقال کے بعد تعلیم حاصل کر رہے تھے، اس وقت اناؤ میں تھے جب علامہ نے اسکول جانا بند کر دیا اور سارا دن کھیل تماشوں میں بتانے لگے تو ان کی خالائیں، ماموں، پھوپھیاں اور سب سے بڑھ کر دادی اور ماں سخت پریشان تھیں کہ کیا علاج کیا جائے کہ ابی میاں کا پڑھنے میں دل لگے۔لہٰذا ان کے پھوپھا ڈپٹی نذیراحمد کی نگرانی میں ان کی تعلیم شروع ہوئی۔

ڈپٹی نذیراحمد علامہ کو کوئی کتاب دے دیتے اور کہتے اس کو پڑھو اور مجھے بتاؤ کہ کیا پڑھا۔دوسرے دن جگہ جگہ سے پوچھتے۔علامہ کچھ پڑھتے تو صحیح جواب دیتے۔بغیر پڑھے اناپ شناپ جواب دے دیتے۔جواب سن کر نذیراحمد کتاب پھینک دیتے اورخفا ہوتے۔پھر دھیرے دھیرے صحیح جواب دینے لگے تو کہا اب مضمون لکھو۔کتاب اپنے سامنے رکھو اور اپنے الفاظ میں یہی بات لکھو۔وہ غلط سلط لکھ کر لاتے تو نذیراحمد

بغیر پڑھے پھینک دیتے تھے۔

تکمیلِ تعلیم کے بعد مولوی عبدالرحیم مرحوم باقی جامع مسجد جھجھر کی اکلوتی بیٹی محترمہ فاطمہ بیگم سے جنوری ۱۸۹۰ء میں شادی ہوئی، اور ۱۸۹۱ء میں محکمہ بندوبست اناؤ میں جہاں ان کے چچا ڈپٹی کلکٹر تھے، کلرک کی حیثیت سے نوکری مل گئی۔ مگر ملازمت کی پابندی علامہ کی طبیعت کے خلاف تھی اور دفتر کے خشک کاموں میں ان کا جی نہیں لگتا تھا، اور پھر ان کی والدہ اپنے اکلوتے بیٹے کی جدائی سے مغموم تھیں اور وہ ان کی جدائی زیادہ دن برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔ ان وجوہ سے جم کر ایک جگہ نوکری نہیں کر سکے اور ترقی کے نہایت معقول مواقع میسر آنے پر بھی ان پر توجہ نہیں کی۔ اناؤ، مین پوری، علی گڑھ اور دہرادون میں تبدیلی ہوتی رہی۔ آخر دلّی کے پوسٹل آڈٹ آفس میں تبادلہ ہوا۔ مگر چند سال بعد ہی ۱۹۱۰ء میں ۱۸، ۱۹ سال کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔

ادبی تخلیق کی ابتدا: راشدالخیری میں ادبی ذوق اپنے پھوپھی زاد بھائی اشرف حسین کی صحبت میں پیدا ہوا۔ پھر مولانا حالی اور ڈپٹی نذیر احمد کی شاگردی نے اسے جلا بخشی۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع اور مشاہدہ بہت تیز تھا، اور حافظہ بھی غضب کا تھا۔ انھوں نے مدرسے کی تعلیم سے نہیں، ذاتی مطالعہ سے بہت ترقی کی۔ نذیر احمد ان کے متعلق لکھتے ہیں:

''مولوی عبدالراشد مولویوں کے خاندان کے ایک ممتاز ممبر ہیں جو ان کی تعلیم کا زمانہ تھا۔ تعصب اس وقت مذہبی مسلمانوں میں اس قدر تھا کہ مولوی عبدالراشد جیسے خیالات کا آدمی مسلمانوں کی سوسائٹی میں نہیں رہ سکتا تھا۔ اس سے ہمیں اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ ترقی کا مادہ فطرتاً ہر شخص میں موجود ہے۔ انھوں نے جو کچھ سیکھا اپنے سے سیکھا۔ اس نسل میں انھیں میں ان کے خیالات اور سیلف سٹڈی کے لحاظ سے سب سے ممتاز رکھتا ہوں۔''(۳)

علامہ راشدالخیری کی سب سے پہلی تصنیف جو شائع ہوئی وہ 'صالحات' ہے۔ اس کے بعد انھوں نے ۱۸۹۷ء میں 'منازل السائرہ' لکھی جو ان کی شاہکار تصنیف کہلائی۔ اس ناول کی وجہ سے انھیں اردو میں چالس ڈکنس کے نام سے یاد کیا گیا اور نذیر احمد اور مولانا الطاف حسین حالی نے ہمت اور حوصلہ افزائی کی اور فرمایا: ''مجھے امید ہے میرا بھتیجا میرا نام میرے بعد قائم رکھے گا۔''

ان دونوں اصلاحی ناولوں کے بعد ان کی شہرت ایک بلند پایہ مصنف کی حیثیت سے پھیلنی شروع ہوئی۔ ۱۹۰۳ء سے رسالہ 'مخزن' میں افسانے اور مضامین شائع ہونے لگے۔ علامہ کی ادبی اور تصنیفی زندگی کا آغاز باقاعدہ ان کے رومانوی ناول 'احسن و میمونہ' (سالِ تصنیف ۱۸۹۴ء) سے ہوا۔ یہ ناول 'روہیل کھنڈ

گزٹ' بریلی میں قسط وار شائع ہوتا تھا۔ اس ناول کی اشاعت سے اخبار کا سیل کافی بڑھ گیا تھا۔ لیکن اپنے پھوپھا ڈپٹی نذیر احمد کی ناراضگی کی وجہ سے بقیہ مسودات کو نذرِ آتش کر دیا۔ علامہ نے اپنے ناول (احسن و میمونہ) کے غیر مطبوعہ مسودے کو نذرِ آتش کرنے کے بعد ڈپٹی نذیر احمد کی کتابوں کا مطالعہ کیا اور پھر ان کے طرزِ تحریر کا تتبع کرتے ہوئے 'صالحات' اور 'منازل السائرہ' تصنیف کیا۔ خود مصنف کا بیان اس تصنیف کے متعلق دیباچۂ 'صالحات' آٹھویں ایڈیشن کے صفحہ نمبر ۸ پر اس طرح ہے:

''رستہ سنسان تھا اور ہو کا میدان۔ راہ کٹھن تھی اور منزل کڑی۔ جرأت نہ ہوتی تھی کہ قدم رکھوں۔ مگر ارادہ مصمم تھا اور غیرت ہمراہ خدا کا نام لیا اور قدم بڑھایا۔''

اس طرح علامہ راشدالخیری نے حوصلے اور ہمت سے کام لیتے ہوئے ڈپٹی نذیر احمد کے مشوروں کی روشنی میں اپنے عقل و شعور کو رہنما بناتے ہوئے اپنے تخلیقی سفر کو آگے بڑھایا اور ۱۸۹۶ء میں ناول 'صالحات' تصنیف کیا۔ مگر اس کی اشاعت ۱۹۰۰ء میں عمل میں آئی۔ محمد احسن وکیل مرحوم لکھتے ہیں:

''یہ کتاب افضل المطابع دہلی میں طبع ہوئی۔ اس کتاب کے طبع ہونے کے دوران مالک مطبع نے مولانا مرحوم سے کہا کہ تمہاری کتاب نے ناک میں دم کر دیا ہے۔ کاتب، صحیح کنندہ، مقابلہ کنندہ، سب روتے ہیں اور بعض اوقات ایک ایک ورق لکھنے میں دن دن بھر گزر جاتا ہے۔ جب جی بھر کر رو لیتے ہیں پھر آگے لکھنا شروع کرتے ہیں۔ اس وجہ سے اشاعت میں دیر ہو رہی ہے۔''[۶]

علامہ کی سیرت و شخصیت: علامہ راشدالخیری کی سیرت و شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں ان کے خاندانی ماحول اور ان کی مذہبی روایتوں کا زبردست حصہ رہا ہے جن میں انھوں نے آنکھیں کھولیں۔ ان کا خاندان جید عالموں کا خاندان تھا، اس خانوادے میں عورتیں بھی قاریہ اور حافظہ تھیں۔ ان کے دادا مولانا عبدالقادر اپنے وقت کے جید عالم تھے۔ انھیں شاہانِ مغلیہ کے استاد ہونے کا فخر حاصل تھا۔ ان کے گھر میں روزانہ ایک قرآن مجید ختم کیا جاتا تھا۔ مذہبی امور کی سختی سے پابندی کی جاتی تھی۔ اسی ماحول میں علامہ کی تربیت ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی سیرت و شخصیت کی تشکیل میں مذہبی عناصر کا زبردست اثر کارفرما رہا ہے۔ ان کے والد ملازمت کے سلسلے میں ہمیشہ شہر سے باہر رہتے تھے۔ اس لیے ان کی پرورش دادا کے زیرِ نگرانی خالص مشرقی انداز سے ہوئی۔ آٹھ نو سال کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ دادا نے بہت ہی لاڈ و پیار سے پرورش کی اور باپ کی محرومی کا احساس نہ ہونے دیا۔

علامہ انتہائی شریف النفس، دردمند اور بڑے عزم و حوصلہ کے انسان تھے۔ وضعداری، خوش

اخلاق اور شفقت ومحبت ان کے خمیر میں شامل تھی۔ انھوں نے اپنے اہلِ خانہ کے درمیان بڑی کامیاب اور مثالی زندگی گزاری۔ ہر کسی کو ان سے اپنے رشتے پر ناز تھا۔ ماں کو اپنے بیٹے کی سعادت مندی پر فخر تھا۔ بیٹے نے بھی ساری زندگی ماں کی اطاعت وفرماں برداری اور خوشنودی میں کوئی کسر نہ چھوڑی اور زندگی کے آخری لمحے تک ان کی دلجوئی کرتے رہے۔ باپ کی حیثیت سے ایک بہترین اور انتہائی شفیق باپ۔ اپنے بچوں سے بے انتہا پیار کرتے تھے۔ ان کی ذرا ذرا سی تکلیفوں پر دکھی اور فکر مند ہوتے تھے۔ علامہ دوستوں کے دوست تھے۔ ان کے ساتھ بے حد اخلاق اور محبت کا مظاہرہ کرتے۔ ان کے دکھ درد میں شریک رہتے۔ ان کے تکلیف وآرام کا خیال رکھتے۔ ان کی دلجوئی کی ہر ممکن کوشش کرتے۔ اگر کوئی بیمار ہو جاتا یا اور کسی وجہ سے پریشان نظر آتا تو اس کی عیادت اور دل دہی کے لیے کئی کئی بار اس کے پاس جاتے مگر دوستی کی وجہ سے اپنے کسی اصول سے سمجھوتہ نہیں کرتے۔

مولانا کی دل سوزی، ہمدردی، غم گساری ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ علامہ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ بچوں یا دوستوں کے دباؤ میں آکر ہی قلم اٹھاتے تھے لیکن جم کر بیٹھ نہ سکتے تھے۔ دس سے گیارھواں منٹ لکھنے میں صرف نہیں کرتے تھے۔ دس منٹ لکھا اور باہر آ گئے اور یہ سلسلہ دن بھر چلتا رہتا۔ انسان دوستی اور غریب پروری علامہ کی شخصیت کا ایک بنیادی جزو ہے۔ لوگ اپنوں کے دکھ درد میں شریک نہیں ہو پاتے ہیں۔ اپنے ملازم اور کم حیثیت لوگوں کے دکھ درد میں برابر کا شریک ہونا اور دوسروں کے غموں کو اوڑھ لینا اور رات رات بھر دوسروں کے لیے بیٹھ کر کاٹ دینا، کفن دفن کا بندوبست کرنا، کاندھے دے کر قبرستان لے جانا، ایسی اعلیٰ اقدار اور اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ ہر کوئی نہیں کر سکتا۔ یہ علامہ راشد الخیری جیسے صاحب کردار شخصیت ہی سے ممکن ہے۔

علامہ راشد الخیری کی سیرت وشخصیت کے اتنے تابناک اور روشن پہلو ہیں کہ ان سے بڑے اتنے واقعات ہیں کہ ان کا احاطہ ایک مختصر ترین مصنف، جن کی کتابوں کے بیس بیس ایڈیشن اس کی حیات میں شائع ہوئے جن کا نام بچوں نے پہلے اپنی ماؤں کی گود میں سنا پھر پڑھا، وہ شخص کتنا سادہ اور منکسر المزاج تھا۔ آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس آدمی نے کبر ونخوت کو اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیا۔ اس آدمی کی محبوبیت اور مقبولیت گھر سے لے کر باہر تک ہر حلقے میں یکساں تھی۔ اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ راشد الخیری کی شخصیت کا خمیر، شریف النفسی، انسان دوستی، وضع داری، انکساری اور سادگی، اعلیٰ اخلاق، غریب پروری، خودداری، حق گوئی، مہمان نوازی، خوش مزاجی، اور زندہ دلی وغیرہ کے بنیادی عناصر سے مل کر تیار ہوا تھا۔ اتنی ساری خوبیاں جس شخص کے اندر جمع ہوں اس کی عظمت کا انکار کیوں کر ممکن ہے۔ ایسی نابغہ شخصیتیں کبھی

کبھی پیدا ہوتی ہیں، جو اپنے پورے عہد کو متاثر کرتی ہیں اور اپنے عہد کا اشاریہ بن جاتی ہیں۔ آغا شاعر قزلباس جو علامہ کے ہم عصروں میں تھے اور اپنے وقت کے ایک معتبر شاعر تھے، انھوں نے علامہ راشد الخیری کو اس طرح خراج عقیدت پیش کیا ہے ؎

علم کا وہ دیوتا تھا فضل کی وہ جان تھا
سچ یہ ہے اس عہد کا سب سے بڑا انسان تھا

☆☆☆

حوالہ جات:

۱۔ 'عصمت'، جولائی ۱۹۶۴ء، راشد الخیری، ص ۶۲
۲۔ 'عصمت'، جولائی، ۱۹۶۴ء، راشد الخیری، ص ۶۶
۳۔ تمدن، اپریل ۱۹۱۱ء بحوالہ: عصمت، جولائی، ۱۹۶۴ء، راشد الخیری، ص ۱۰۰
۴۔ علامہ راشد الخیری (مونوگراف)، نجیب اختر، ص ۲۶
۵۔ دیباچہ صالحات، آٹھواں ایڈیشن، راشد الخیری، ص ۸
۶۔ عصمت، فروری ۱۹۳۹ء بحوالہ: عصمت، راشد الخیری نمبر ۱۹۶۴ء، ص ۹۹

☆☆☆

محمد معروف عالم ندوی
ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو، للت نارائن متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ

ساحر لدھیانوی کی شاعری میں عورت کا تصور

تلخیص:

پدم شری ساحر لدھیانوی جن کا اصل نام عبدالحی ہے، دنیائے ادب میں محتاج تعارف نہیں ۔ترقی پسند تحریک سے وابستہ اردو شعرامیں ان کا نام سرفہرست ہے۔انھوں نے کالج کے زمانے سے ہی شاعری کا آغاز کر دیا تھا اور یہ سلسلہ آخر تک جاری رہا۔ان کی شاعری زندگی کے مختلف گوشوں کا احاطہ کرتی ہے ۔ان کی شاعری کے متعدد موضوعات میں سے عورت کی بے بسی بھی ایک اہم موضوع ہے جو میرے مقالہ کا عنوان ہے ۔ان کی شاعری میں عورت کا پیکر متعدد صورتوں جیسے کبھی ماں کی شکل میں ، کبھی بہن کے روپ میں، کبھی بیٹی کی صورت میں اور کہیں شریک حیات اور محبوبہ کے انداز میں جلوہ فگن ہے ۔وہ عورتوں کی بے بسی ، بے چارگی ،محکومیت ومظلومیت ،زبوں حالی ،معاشرتی پستی اور بے کیف زندگی کے باوجود ان کی عظمت واحترام کے دل سے قائل ہیں ۔وہ اپنی زندہ دلی اور حساس طبیعت کی بنا پر طبقاتی کشمکش میں عورتوں کے پاکیزہ وجود کو خطرہ لاحق ہونے اور نسوانی اقدار کو پامال ہونے سے بچانے کے لیے احتجاج کرتے ہیں اور ان کے مسائل کو اپنے تعمیری و تشکیلی افکار وخیالات کی اساس بناتے ہیں ۔ان کی شاعری میں عورت کے حوالے سے اس قدر شدید رویہ ان کی نجی زندگی ، گھریلو ماحول اور اس عہد کے سماجی حالات کی دین ہے۔آج ملک ومعاشرے میں عورتوں کو جو مقام حاصل ہے وہ ساحر جیسے عورت دوست افراد کی کدوکاوش کا نتیجہ ہے۔

کلیدی الفاظ:

ساحر لدھیانوی، ترقی پسند تحریک، شاعری کے موضوعات، عورت کی بے بسی ، بے چارگی ،محکومیت و مظلومیت ،زبوں حالی ،معاشرتی پستی ، بے کیف زندگی۔

....

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہاہوں میں

پدم شری ساحر لدھیانوی جن کا اصل نام عبدالحی ہے، دنیائے ادب میں محتاج تعارف نہیں ۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ اردو شعرامیں ان کا نام سرفہرست ہے ۔انھوں نے کالج کے زمانے سے ہی شاعری کا آغاز کر دیا تھا اور یہ سلسلہ آخر تک جاری رہا۔ان کی شاعری زندگی کے مختلف گوشوں کا احاطہ کرتی ہے ۔ان کی شاعری کے متعدد موضوعات میں سے عورت کی بے بسی بھی ایک اہم موضوع ہے جو میرے مقالہ کا عنوان ہے ۔

عصر حاضر میں جہاں ہر مجلس ومحفل میں عورتوں کی برتری وبہتری کا چرچہ ہے وہیں ان کی حالت زار،عزت وناموس کے تحفظ کی خاطر قربانی اور سماج کا ان کے ساتھ منافقانہ رویہ ناقابل بیان ہے ۔عورت جو سماج میں باعزت و پاک دامن اور دیوی تصور کی جاتی ہے اسی سماج کے چند بدکردار افراد واشخاص نے اسے بری طرح لتاڑا بھی ہے ۔اس کی بازگشت ساحر کی شاعری میں جابجا سنائی دیتی ہے ۔ان کی شاعری میں عورت کا پیکر متعدد صورتوں جیسے کبھی ماں کی شکل میں ،کبھی بہن کے روپ میں ،کبھی بیٹی کی صورت میں اور کہیں شریک حیات اور محبوبہ کے انداز میں جلوہ فگن ہے ۔وہ عورتوں کی بے بسی ، بے چارگی ،محکومیت و مظلومیت ،زبوں حالی ،معاشرتی پستی اور بے کیف زندگی کے باوجود ان کی عظمت واحترام کے دل سے قائل ہیں ۔وہ اپنی زندہ دلی اور حساس طبیعت کی بنا پر طبقاتی کشمکش میں عورتوں کے پاکیزہ وجود کو خطرہ لاحق ہونے اور نسوانی اقدار کو پامال ہونے سے بچانے کے لیے احتجاج کرتے ہیں اور ان کے مسائل کو اپنے تعمیری و تشکیلی افکار وخیالات کی اساس بناتے ہیں ۔وہ عورتوں کو محض آلہ دل بستگی نہیں بلکہ مساوی عزت و احترام کا مستحق سمجھتے ہیں جو ان کے مندرجہ ذیل اشعار سے بخوبی عیاں ہے ۔

لوگ عورت کو فقط جسم سمجھ لیتے ہیں
روح بھی ہوتی ہے اس میں یہ کہاں سوچتے ہیں
روح کیا ہوتی ہے اس سے انھیں مطلب ہی نہیں
وہ تو بس تن کے تقاضوں کا کہا مانتے ہیں
روح مرجاتی ہے تو جسم ہے چلتی ہوئی لاش
اس حقیقت کو سمجھتے ہیں نہ پہچانتے ہیں
کتنی صدیوں سے یہ وحشت کا چلن جاری ہے

کتنی صدیوں سے ہے قائم یہ گناہوں کا رواج
لوگ عورت کی ہر اک چیخ کو نغمہ سمجھے
وہ قبیلوں کا زمانہ ہو کہ شہروں کا رواج
جبر سے نسل بڑھے، ظلم سے تن میل کریں
یہ عمل ہم میں ہے بے علم پرندوں میں نہیں
ہم جو انسانوں کی تہذیب لیے پھرتے ہیں
ہم سا وحشی کوئی جنگل کے درندوں میں نہیں
اک بجھی روح لیے جسم کے ڈھانچے میں لیے
سوچتی ہوں میں کہاں جا کے مقدر پھوڑوں
میں نہ زندہ ہوں کہ مرنے کا سہارا ڈھونڈوں
اور نہ مردہ ہوں کہ جینے کے غموں سے چھوٹوں
کون بتلائے گا مجھ کو کسے جا کر پوچھوں
زندگی قہر کے سانچوں میں ڈھلے گی کب تک
ظلم اور جبر کی یہ رات چلے گی کب تک

(کلیات ساحر، ص ۷۴۴)

جہاں سماج میں عورت عفت و پاکدامنی کی مثال اور دیوی کا درجہ رکھتی ہے وہیں جگہ جگہ طوائف خانے موجود ہیں۔ ساحر لدھیانوی معاشرے کی اس دوہری پالیسی کو بے نقاب کرتے ہوئے سوالیہ انداز میں اپنی مشہور زمانہ نظم ’چکلے‘ میں کہتے ہیں۔

یہ کوچے یہ نیلام گھر دل کشی کے
یہ لٹتے ہوئے کارواں زندگی کے
کہاں ہیں، کہاں ہیں محافظ خودی کے
ثناخوان تقدیس مشرق کہاں ہیں

یہ پر پیچ گلیاں، یہ بے خواب بازار
یہ گمنام راہی، یہ سکوں کی جھنکار
یہ عصمت کے سودے یہ سودوں پہ تکرار

ثناخوان تقدیس مشرق کہاں ہیں

تعفن سے پرنیم روشن یہ گلیاں
یہ مسلی ہوئی ادھ کھلی زرد کلیاں
یہ بکتی ہوئی کھوکھلی رنگ رلیاں
ثناخوان تقدیس مشرق کہاں ہیں

یہ بھوکی نگاہیں حسینوں کی جانب
یہ بڑھتے ہوئے ہاتھ سینوں کی جانب
لپکتے ہوئے پاؤں زینوں کی جانب
ثناخوان تقدیس مشرق کہاں ہیں

مدد چاہتی ہے یہ حوا کی بیٹی
یشودھا کی ہم جنس، رادھا کی بیٹی
پیمبر کی امت، زلیخا کی بیٹی
ثناخوان تقدیس مشرق کہاں ہیں

مذکورہ بالا نظم ’چکلے‘ کی معنویت، عورتوں کی سماجی حیثیت اور ساحر لدھیانوی کے نظریہ اور عمل کی تفہیم میں ان کے معاصر شاعر کیفی اعظمی کا مندرجہ ذیل اقتباس سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے:

’’اس محکوم و مجبور اور بھوکے ملک میں جس کی تقدیس اور روحانیت کے نغمے آنکھ بند کر کے گائے جاتے ہیں۔ قدم قدم پر چکلے قائم ہیں، اس لیے ہندوستانی ادب میں بھی چکلے ہیں۔۔۔ ساحر نے ثناخوان تقدیس مشرق کو جس شدت، جس نفرت اور خلوص سے جھنجھوڑا ہے اس کی مثال مجھے کسی دوسرے فن پارے میں نہیں ملتی۔ چکلے میں ساحر کی غیرت، اس کی روح، اس کے احساس کی تلملاہٹ بلندی کے انتہائی نقطے پر نظر آتی ہے۔‘‘

اسی قبیل کی ایک اور نظم ’گریز‘ ہے جو زمانے کے مخرب اخلاق پہلوؤں کے ساتھ ساتھ عورتوں کی بے بسی کے اسباب کو بھی اجاگر کرتی ہے۔

وہ دیکھ سامنے کے پرشکوہ ایواں سے
کسی کرائے کی لڑکی کی چیخ ٹکرائی
پھر ایک تیرہ و تاریک جھونپڑی کے تلے

سسکتے بچے پہ بیوہ کی آنکھ بھر آئی
وہ پھر بکی کسی مجبور کی جواں بیٹی
وہ پھر جھکا کسی در پر غرور برنائی

سماجی رویہ اور درپیش مسائل ومشکلات کی وجہ سے عورتیں اگر عفت وعصمت کا سودا کرتی ہیں تو ہمارا سماج ان کو طوائف اور ان کے گھر کو طوائف خانہ سے موسوم کرتا ہے مگر یہ بدفعلی کسی عالی شان محل میں ہوتی ہے تو کوئی صدائے احتجاج بلند نہیں کرتا، مگر ساحر کسی لڑکی کی بربادی اور چیخ وپکار سے تلملا جاتے ہیں اور بورژوا طبقہ کو ہدف ملامت گردانتے ہیں۔ عورتوں کے تئیں ان کا یہی لب ولہجہ اور فکر وخیال ان کو معاصرین میں ممتاز بناتا ہے۔ وہ ایک ایسے سماج اور معاشرہ کی تعمیر وتشکیل کرنا چاہتے ہیں جہاں عورتوں کو مساوی حقوق ملے اور ایسے سماج کو اکھاڑ پھینکنے کا خواہاں ہیں جہاں چند سکوں کی خاطر عورتیں اپنی عفت وعصمت کا سودا کریں۔

اسی طرز کی ایک اور نظم 'جاگیر' کے ذریعہ ساحر لدھیانوی نے مالدار وسرمایہ دار طبقہ پر ضرب لگانے کی کوشش کی ہے۔ حقیقت کے انکشاف میں غیر جانب داری سے کام لیتے ہوئے جاگیر دار طبقہ کو انھوں نے براہ راست طنز کا نشانہ بنایا ہے جو نسوانی اعلی اقدار سے قطع نظر عورتوں کو محض دل بہلانے کا ذریعہ یا سامان تعیش خیال کرتا ہے اور مفلس گھرانے کی دوشیزاؤں سے جنسی تلذذ حاصل کرتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

پھر اسی وادی شباب میں لوٹ آیا ہوں
جس میں پنہاں مرے خوابوں کی طرب گاہوں ہیں
میرے احباب کے سامان تعیش کے لیے
شوخ سینے ہیں، جواں جسم، حسیں بانہیں ہیں
سبز کھیتوں میں یہ دبکی ہوئی دوشیزائیں
ان کی شریانوں میں یہ کس کا لہو جاری ہے
وہ دبے پاؤں ادھر کون چلی جاتی ہے
بڑھ کے اس شوخ کے ترشے ہوئے لب چوم نہ لوں

ساحر لدھیانوی نے معاشرہ کی اس کھوکھلی تہذیب کا برسرعام مذاق اڑایا ہے جہاں غریب ونادار گھرانے کی عورتوں کی ضروریات، مجبوریاں اور مصائب ومشکلات کا واحد حل جسم فروشی خیال کیا جاتا ہے۔
نظم 'صبح نوروز' کا دوسرا بند ملاحظہ ہو۔

نکلی ہے بنگلے کے در سے

اک مفلس دہقاں کی بیٹی
افسردہ مرجھائی ہوئی سی
جسم کے دکھتے جوڑ دباتی
آنچل سے سینے کو چھپاتی
مٹھی میں اک نوٹ دبائے
جشن مناؤ سال نو کے

اس نظم میں ساحر لدھیانوی کی صدائے احتجاج ان کے ذہنی رویہ اور فکری کیفیت کی غماز ہے۔ اسی نوع کی ایک اور نظم 'نور جہاں کے مزار پر' ہے جس میں شاہی رعب وداب اور حاکمانہ جاہ وجلال کی شکار عورتوں کی منظر کشی خوب صورت انداز میں کی گئی ہے۔

کیسے مغرور شہنشاہوں کی تسکیں کے لیے
سالہا سال حسیناؤں کے بازار لگے
کیسے بہکی ہوئی نظروں کے تعیش کے لیے
سرخ محلوں میں جواں جسموں کے انبار لگے

یہ نظم شاہانہ وجاگیردارانہ نظام کی عکاس ہے کہ کس طرح حرم کی نمائش کی خاطر کمسن لڑکیوں کو عنفوان شباب میں تزئین حرم کے لیے اٹھوا لینے کا رواج تھا اور اپنی زندگی کا وافر حصہ گزارنے کے بعد بھی اسے حرم سے آزادی نہیں ملتی تھی۔ حاکم طبقہ جس سے عوام کی انصاف پرور امیدیں وابستہ ہوتی ہیں وہی اگر عورتوں کا استحصال کرنے لگے تو ایسی تہذیب اکھاڑ پھینکنے کی قابل ہے۔

ساحر لدھیانوی کے فلمی گیتوں میں بھی عورتوں کا ذکر بکثرت ملتا ہے۔ عورت ساحر کے کلام میں وفا شعار، قابل احترام، لائق پرستش اور دیوی کا درجہ رکھتی ہے۔ یہی عورت شاہان وقت اور برگزیدہ ہستیوں کو جنتی ہے اور اوتار و پیمبر کو دنیا میں آنے کا سبب بنتی ہے۔ بقول علامہ اقبال: ''وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ'' بایں ہمہ ہمارا سماج عورتوں کے ساتھ ظلم وزیادتی روا رکھتا ہے۔ ان کی عزت وآبرو کو سرعام نیلام کرتا ہے اور مساوی درجہ دینے کے بجائے انھیں ثانوی درجہ دیتا ہے۔

عورت نے جنم دیا مردوں کو مردوں نے اسے بازار دیا
جب جی چاہا مسلا کچلا، جب جی چاہا دھتکار دیا
تلتی ہے کہیں دیناروں میں، بکتی ہے کہیں بازاروں میں

ننگی نچوائی جاتی ہے عیاشوں کے درباروں میں
وہ بے عزت شے ہے جو بٹ جاتی ہے عزت داروں میں
عورت نے جنم دیا مردوں کو مردوں نے اسے بازار دیا
جن سینوں نے ان کو دودھ دیا، ان سینوں کو بیوپار کیا
جس کوکھ میں ان کا جسم ڈھلا، اس کوکھ کا کاروبار کیا
جس تن سے اگے کونپل بن کر، اس تن کو ذلیل وخوار کیا
سنسار کی ہر اک بے شرمی، غربت کی گود میں پلتی ہے
چکلوں ہی میں آ کر رکتی ہے فاقوں سے جو راہ نکلتی ہے
عورت نے جنم دیا مردوں کو مردوں نے اسے بازار دیا
عورت سنسار کی قسمت ہے پھر بھی تقدیر کی ہیٹی ہے
اوتار پیمبر جنتی ہے پھر بھی شیطان کی بیٹی ہے

اس گیت کے متعلق عبدالقیوم لکھتے ہیں:

''میرے اپنے خیالوں میں عورت کی عظمت کے بارے میں کوئی فلمی گیت اس قدر موثر انداز میں نہیں لکھا گیا جتنا یہ گیت ہے۔''

فلم 'سادھنا' کے اس گیت کو لتا منگیشکر نے اپنی خوش الحانی سے لافانی بنادیا۔اسی قسم کا ایک اور گیت دیکھیے جو مشرق کی کھوکھلی تہذیب اور عورتوں کی بے بسی کی منظر کشی کرتا ہے۔

یہ اجلے دریچوں میں پائل کی چھن چھن
تھکی ہاری سانسوں پہ طبلے کی دھن دھن
یہ بے روح کمروں میں کھانسی کی ٹھن ٹھن
جنھیں ناز ہے ہند پر وہ کہاں ہیں
کہاں ہیں، کہاں ہیں، کہاں ہیں، کہاں ہیں
یہاں پیر بھی آچکے ہیں، جواں بھی
تنومند بیٹے بھی، ابا میاں بھی
یہ بیٹی بھی ہے اور بہن بھی ہے ماں بھی
جنھیں ناز ہے ہند پر وہ کہاں ہیں

کہاں ہیں، کہاں ہیں، کہاں ہیں، کہاں ہیں
(گاتا جائے بنجارہ)

مذکورہ بالا گیت کے مطالعہ سے ساحر کے نظریہ کا پتا چلتا ہے کہ جب ایک عورت بدکاری کے ذریعہ دائرۂ شرافت سے باہر ہوجاتی ہے تو اس افعال ذمیمہ میں شامل افراد واشخاص کو سماج کیوں عزت واحترام کی نظر سے دیکھتا ہے۔طوائف خانے جہاں رقص کرتی عورتیں جو کسی کی بہن، ماں، بیٹی، یا شریک حیات ہیں، ان کی عزت و ناموس بیٹے، جوان حتی کہ ابامیاں جیسے ضعیف العمر افراد لوٹ لیتے ہیں جن کا نسبی سلسلہ یشودھا، رادھا اور زلیخا سے ہوتا ہوا ماں حوا سے ملتا ہے، اس کا انھیں خیال ہی نہیں ہوتا۔

ساحر لدھیانوی کے ہم عصر شاعروں جیسے راجا مہدی علی خاں، شیلندر کمار، کیفی اعظمی، جاں نثار اختر، شکیل بدایونی، اختر الایمان، امریتا پریتم، مجروح سلطان پوری، قتیل شفائی اور علی سردار جعفری وغیرہ نے عورتوں کا سراپا، خدوخال، زلف وگیسو اور رخ ورخسار وغیرہ پر زور دیا اور انھیں بطور محبوبہ پیش کیا تاہم انھوں نے عورتوں کے حقوق کا شعور خواتین کی برابری کا ادراک اور ان کے ساتھ دوستانہ رویہ اختیار کرنے کی تعلیم دی۔ یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ آٹھ مارچ ساحر کی تاریخ پیدائش ہے اور اسی دن عالمی یوم خواتین منایا جاتا ہے جس کا مقصد دنیا کو خواتین کی اہمیت سے آگاہ کرنا، ان پر ہورہے ظلم وتشدد کی روک تھام کے لیے عملی اقدامات کی ترغیب دینا اور ان کو اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے پیدا کرنا وغیرہ رہا ہے۔ یہ بھی اتفاق ہی ہے کہ عالمی یوم خواتین کے مقاصد کی بھرپور نمائندگی ان کی شاعری میں ملتی ہے۔اس کی ایک ہلکی سی جھلک ملاحظہ ہو۔

بابل کی دعائیں لیتی جا، جا تجھ کو سکھی سنسار ملے
میکے کی کبھی نہ یاد آئے، سسرال میں اتنا پیار ملے
نازوں سے تجھے پالا میں نے کلیوں کی طرح پھولوں کی طرح
بچپن میں جھلایا ہے تجھ کو بانہوں نے مری جھولوں کی طرح
مرے باغ کی اے نازک ڈالی تجھے ہر پل نئی بہار ملے
جس گھر میں بندھے ہیں بھاگ ترے اس گھر میں سدا ترا راج رہے
ہونٹوں پہ ہنسی کی دھوپ کھلے، ماتھے پہ خوشی کا تاج رہے
کبھی جس کی جوت نہ ہو پھیکی، تجھے ایسا روپ سنگھار ملے
(گاتا جائے بنجارہ)

عورتوں کے معاملے میں سماج کے تئیں ساحر لدھیانوی کا اس قدر باغیانہ لب ولہجہ اس لیے ملتا ہے کہ انھوں نے غربت وافلاس کے سبب پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس کوئلے چننے والی لڑکیوں اور خواتین کو بے یارو مددگار دیکھا تھا۔سماج کے منفی رویہ کے تحت جاگیرداروں کی ہوسناکیوں کی شکار عورتوں کو سماج بدر ہوتے اور کوٹھے کی زینت بنتے ہوئے بکثرت دیکھا تھا اور خود اپنے والد فضل محمد اور والدہ سردار بیگم کے درمیان باہمی چشمک ،ماں کا خوف و ہراس کے ماحول میں ذہنی وفکری تناؤ میں رہنا اور روحانی تکالیف برداشت کرتے ہوئے ،بے کسی و بے بسی کے شدید احساس کے ساتھ برے حالات میں زندگی گزارتے ہوئے پایا تھا۔

جب بھی جی چاہے نئی دنیا بسا لیتے ہیں لوگ
ایک چہرے پہ کئی چہرے لگا لیتے ہیں لوگ
جانے وہ کیا لوگ تھے جن کو وفا کا پاس تھا
دوسرے کے دل پہ کیا گزرے گی یہ احساس تھا
اب ہیں پتھر کے صنم
جن کو احساس نہ غم
(گاتا جائے بنجارہ)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ ساحر لدھیانوی نے اپنی شاعری کے ذریعہ سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں کا ذکر کرتے ہوئے عورتوں کے مسائل کی ترجمانی انتہائی بیدار مغزی کے ساتھ کی ہے اور ان کی عظمت ورفعت ، ان کے حقوق کا تحفظ اور ان کے مخدوش ومجروح وجود کو مختلف پیرائے میں بیان کیا ہے تاکہ عورت کے تئیں ایک اچھے اور صحت مند سماج کی تشکیل ہو سکے۔ان کی شاعری میں عورت کے حوالے سے اس قدر شدید رویہ ان کی نجی زندگی ،گھریلو ماحول اور اس عہد کے سماجی حالات کی دین ہے۔آج ملک ومعاشرے میں عورتوں کو جو مقام حاصل ہے وہ ساحر جیسے عورت دوست افراد کی کدوکاوش کا نتیجہ ہے۔

☆☆☆

فیاض احمد
ریسرچ اسکالر شعبہ فارسی ،مانو ،حیدرآباد

عہد اورنگ زیب میں فن موسیقی کا مختصر جائزہ

تلخیص:

ستر ہویں صدی کے دوران ہندوستان میں موسیقی میں نمایاں تبدیلیاں اور جدتیں آئیں۔یہ وہ وقت تھا جب کلاسیکی موسیقی کی روایات پروان چڑھ رہی تھیں ،اور موسیقی کی بہت سی نئی شکلیں ابھر کر سامنے آئیں۔اس دور میں ہندستانی موسیقی میں سب سے اہم پیش رفت شمالی ہندستانی کلاسیکی موسیقی کی روایت کا عروج تھا جسے ہندستانی موسیقی کہا جاتا ہے۔موسیقی کا یہ انداز فارسی اور اسلامی موسیقی کی روایات کے ساتھ ساتھ مقامی ہندستانی روایات سے بہت زیادہ متاثر تھا۔

اورنگ زیب موسیقی کے لیے کافی بدنام رہا ہے مگر یاد رہے کہ اسی عہد میں موسیقی کی کچھ اہم کتابیں بھی لکھی گئی ہیں۔کچھ اہم کتابوں کا فارسی اور ہندی میں ترجمہ بھی کیا گیا ہے۔خوش حال خان سکونت جو کہ تیرہویں صدی کے عظیم موسیقاروں میں شمار ہوتے تھے، انھوں نے موسیقی کے بارے میں بہت سارے ثبوت فراہم کیے ہیں۔شہزادہ داراشکو اور اورنگ زیب کے مابین جنگ کے حوالے سے جو دستاویزات برٹش لائبریری میں ملتے ہیں ان میں موسیقی کے آثار پر بھی نظر ثانی کی گئی ہے۔اٹھارہویں صدی کے چند ابتدائی نسخے جو کہ سنسکرت میں ہیں موسیقی کا آئینہ سمجھے جاتے ہیں۔ان میں اس وقت سنسکرت کے ساتھ ساتھ برج بھاشا بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔لیکن گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ یہ ساری کتابیں عہد اورنگ زیب میں تقریباً فارسی میں ترجمہ کی گئیں، کیوں کہ اس وقت فارسی ہی ہر جگہ خط و کتابت اور رابطے کی زبان سمجھی جاتی تھی اور عوام الناس کے لیے ان کتابوں کو سنسکرت میں سمجھنا دشوار تھا۔

کلیدی الفاظ:

سترہویں صدی، موسیقی، کلاسیکی موسیقی، عہد اورنگ زیب، کتاب ہائے موسیقی۔

ہندوستان میں موسیقی کی تاریخ کا احاطہ کرنا اتنا آسان کام نہیں ہے۔ البتہ قدیم کتابوں سے موسیقی کے حوالے سے جو معلومات فراہم ہوتی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں (ہندوستان) موسیقی ہزاروں سال پہلے ہی نشوونما پا چکی تھی۔ ہندوستان کی مختلف عمارتوں پر موسیقی کے آلات کی جو مصوری نظر آتی ہے یہ بھی اس بات کی شاہد ہے کہ ہندوستان میں فن موسیقی قدیم زمانے میں ہی مکمل ہو چکا تھا۔ موسیقی ہندوستان کے لوگوں میں باہمی ہم آہنگی اور اتفاق کی بڑی وجہ رہی ہے۔ چودہویں صدی میں موسیقی بادشاہی درباروں میں عام طور پر محافل میں دیکھنے میں ملتی تھی۔ حتیٰ کہ فیروز شاہ تغلق نے موسیقی کو ترویج دینے کا کام بھی کیا ہے۔ مورخین نے لکھا ہے کہ شمالی ہندوستان میں موسیقی بھگتی تحریک سے متاثر ہو کر پھیلی ہے۔ بھگتی تحریک کے دوران بہت سارے لکھنے والوں نے راگ اور سر کے بارے میں لکھا ہے۔ سوامی ہری داس عہد اکبری کے قدآور موسیقار تھے۔ اکبر خود ان کے گانے سنتا تھا۔ سوامی ہری داس کو اکبری دربار کے موسیقاروں کا استاد مانا جاتا تھا۔ موسیقی کا مرکزی ادارہ تب شاہی دربار ہی سمجھا جاتا تھا۔ ملک کے کونے کونے سے موسیقار یہاں رجوع کرتے تھے اور اپنے کمال کے مطابق حوصلہ افزائی پاتے تھے۔ آئین اکبری میں ابوالفضل نے لکھا ہے کہ اکبر کے دربار میں تقریباً ۶۳ خاص اور اعلیٰ پایہ کے گلوکار ہر وقت موجود رہتے تھے۔ انھوں نے مزید لکھا ہے کہ ان موسیقاروں سے اکبر خود بھی موسیقی سیکھتے تھے۔

سترہویں صدی کے دوران ہندوستان میں موسیقی میں نمایاں تبدیلیاں اور جدتیں آئیں۔ یہ وہ وقت تھا جب کلاسیکی موسیقی کی روایات پروان چڑھ رہی تھیں، اور موسیقی کی بہت سی نئی شکلیں ابھر کر سامنے آئیں۔ اس دور میں ہندستانی موسیقی میں سب سے اہم پیش رفت شمالی ہندستانی کلاسیکی موسیقی کی روایت کا عروج تھا جسے ہندستانی موسیقی کہا جاتا ہے۔ موسیقی کا یہ انداز فارسی اور اسلامی موسیقی کی روایات کے ساتھ ساتھ مقامی ہندستانی روایات سے بہت زیادہ متاثر تھا۔ اس دور میں ایک اور اہم پیش رفت بھکت موسیقی کے ایک نئے انداز کا ابھرنا تھا جسے بھکتی موسیقی کہا جاتا ہے۔ موسیقی کی یہ شکل کسی ایک دیوتا کی عبادت پر مرکوز تھی اور اس کی جذباتی اور گہری ذاتی دھنوں کی خصوصیت تھی۔ سترہویں صدی ایک ایسی صدی تھی جب بہت سارے ہندستانی موسیقی کے آلات بہتر طریقے سے تیار ہوئے تھے۔ مثال کے طور پر ستار، جو اب سب سے مشہور اور وسیع پیمانے پر تسلیم شدہ ہندستانی موسیقی کے آلات میں سے ایک ہے، اس دور میں ایجاد ہوا تھا۔ مجموعی طور پر ۱۷ویں صدی ہندستانی موسیقی میں زبردست تخلیقی اور جدت طرازی کا زمانہ تھا، جس

میں بہت سارے نئے انداز اور شکلیں ابھریں اور پرانے ساز کو بہتر اور مکمل کیا گیا۔

اورنگ زیب موسیقی کے لیے کافی بدنام رہا ہے مگر یاد رہے اسی عہد میں موسیقی کی کچھ اہم کتابیں بھی لکھی گئی ہیں۔ کچھ اہم کتابوں کا فارسی اور ہندی میں ترجمہ بھی کیا گیا ہے۔ خوش حال خان سکونت جو کہ تیرویں صدی کے عظیم موسیقاروں میں شمار ہوتے تھے، انھوں نے موسیقی کے بارے میں بہت سارے ثبوت فراہم کیے ہیں۔ شہزادہ داراشکوہ اور اورنگ زیب کے مابین جنگ کے حوالے سے جو دستاویزات برٹش لائبریری میں ملتے ہیں ان میں موسیقی کے آثار پر بھی نظر ثانی کی گئی ہے۔ اٹھارہویں صدی کے چند ابتدائی نسخے جو کہ سنسکرت میں ہیں موسیقی کا آئینہ سمجھے جاتے ہیں۔ ان میں اس وقت سنسکرت کے ساتھ ساتھ برج بھاشا بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ لیکن گزرے وقت کے ساتھ ساتھ یہ ساری کتابیں عہد اورنگ زیب میں تقریباً فارسی میں ترجمہ کی گئیں، کیوں کہ اس وقت فارسی ہی ہر جگہ خط وکتابت اور رابطے کی زبان سمجھی جاتی تھی اور عوام الناس کے لیے ان کتابوں کو سنسکرت میں سمجھنا دشوار تھا۔ عہد عالم گیری میں موسیقی کی چند معروف کتابوں کا مختصر جائزہ حسب ذیل ہے۔

پارجاتک: پارجاتک درحقیقت پنڈت آہو بھالا کی مشہور کتاب ہے 'سنگیتا پریجاتک' کا فارسی ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ عہد عالم گیر کے مشہور عالم وفاضل مرزا روشن ضمیر نے فارسی میں کیا۔ مرزا روشن ضمیر خوش حال کے شاگرد تھے اور برج بھاشا پر بھی دسترس رکھتے تھے وہ موسیقی میں بھی مہارت رکھتے تھے اور اس کے رموز اور نکات سے واقفیت اور دلچسپی کی وجہ سے انھوں نے کتاب مذکورہ بالا کتاب کو فارسی میں ترجمہ کیا۔ پارجاتک کا مذکورہ نسخہ ۱۶۸۸ عیسوی میں تحریر کردہ ابھی بھی موجود ہے۔ اصلاً انھوں نے اس کتاب کو ۱۶۶۶ عیسوی کو مکمل کیا۔ اورنگ زیب نے مرزا روشن ضمیر کو سورت کا منشی اور واقع نگار مقرر کیا تھا۔

چوں کہ مرزا روشن ضمیر عربی، فارسی اور سنسکرت پر مکمل دسترس رکھتے تھے اس لیے ان کے لیے پارجاتک کا ترجمہ کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ شیر خاں لودی نے لکھا ہے کہ ان کی موسیقی پر دوسری کتابیں بھی موجود تھیں مگر اب وہ دستیاب نہیں ہیں۔ فارسی پرجاتک سنسکرت کی کتاب کا ترجمہ اور شرح دونوں پر مبنی ہے۔ جہاں کہیں مرزا روشن ضمیر نے آہول سے اختلاف کیا ہے وہاں ساتھ ہی دلیل کے ساتھ بحث بھی کی ہے۔ اتنا ہی نہیں انھوں نے کتاب کے بعض حصے اور حکایات کو چھوڑ بھی دیا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ:

> ''صاحب پرجاتک در این مقام کتھا کہ عبارت از قصہ است نقل کردہ چون بیان او داخلی بہ فن رقص نداشت ترجمہ ننمودہ۔''

روشن ضمیر ایک جگہ لکھتے ہیں کہ اگر اس کتاب کی توضیح سامنے نہ ہوتی تو اس کا ترجمہ فارسی وشرح

آسان نہ ہوتی، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شاید ان کے سامنے کتاب مذکورہ کا ترجمہ وتشریح بھی موجود تھا۔ کہتے ہیں کہ:

''اگر از توضیح شارح ہم تعین استھان سرھای مذکور مشخص نشد، اما این قدر معلوم گشت کہ چون ماتن وشارح ہر دو باین عبارت گفتہ اند۔''

پارجاتک کے تین باب ہیں پہلے باب میں گیت کے قواعد موجود ہیں۔ دوسرے باب میں ساز پر بحث کی گئی ہے۔ تیسرے حصے میں رقص پر گفتگو کی گئی ہے۔ پہلے حصے کا نام 'گیت کانڈ'، دوسرے حصے کا نام 'دادیہ کانڈ' اور تیسرے حصے کا نام 'کانڈ نرتیہ' ہے۔

مفتاح السرود: مفتاح السرود کو کلید موسیقی بھی کہتے ہیں۔ اورنگ زیب کے دربار کے ایک آفیسر جن کا نام قاضی حسن بن خواجہ طاہر بن محمد تھا، انھوں نے ایک گمشدہ سنسکرت کتاب کا ترجمہ جسے بھرت سنگیت کہا جاتا ہے ۱۶۶۴ عیسوی میں دولت آباد کے قریب اورنگ زیب کے لیے لکھا تھا۔ اس کتاب کا جو ترجمہ اس سے پہلے ۱۵۴۷ عیسوی میں قزوینی نے کیا تھا، اس کے چند اوراق وکٹوریہ اور البرٹ میوزیم میں آج بھی موجود ہیں۔ فارسی ادب بہ عہد اورنگ زیب کے مصنف نے لکھا ہے کہ قاضی حسن نے یہ کتاب ۱۶۷۴ عیسوی میں لکھی لیکن ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں جو قلمی نسخہ موجود ہے اس پر ۱۶۶۳ عیسوی تحریر ہے:

''این رسالہ در محرم سن ششم جلوس اورنگ زیب بہادر مطابق ۱۰۷۴ھ موافق حوصلہ خود در سلک تحریر کشید و نام این رسالہ مفتاح السرود نہادہ، تمام تفصیل در باب چہار آوردہ۔''

اس کتاب میں وہ چار باب یعنی راگ، راگنی، موسم اور ساز وغیرہ کے اقسام کی نشاندہی کرتے ہیں۔ مصنف نے اس کتاب میں یہ بھی ذکر کیا ہے کہ موسیقی شرعاً جائز نہیں ہے۔ لیکن بہر حال دل اس کی طرف مائل ہوتا رہتا ہے۔ وہ دلیل میں رقم طراز ہیں کہ اللہ تعالی نے انسان کے خاکی جسم میں جب روح کو جانے کا حکم دیا تو روحیں آمادہ نہیں ہو رہی تھیں۔ خدا نے فرشتوں کو الحان کا حکم دیا، اس ملکوتی الحان سے متاثر ہو کر روح جسم میں داخل ہوئی۔ یہ عبارت مفتاح السرود کے اس مخطوطے میں جو سالار جنگ میں موجود ہے، درج ہے۔

مفتاح السرود کے ۲۴ اوراق ہیں۔ ممکن ہے کہ بعد میں مصنف نے اس کو بڑھا دیا ہو۔ قاضی حسن نے اس سے پہلے بھی ایک کتاب ۱۶۶۲ عیسوی میں سرود البحر کے نام سے موسیقی پر لکھی تھی۔ اس میں ان کی ایک اور تصنیف مفتاح الفرس کا نام بھی ملتا ہے۔ مصنف کی اس کتاب کے علاوہ چار اور کتابیں بھی ہیں جو کہ موسیقی پر لکھی ہیں۔ ۱ سنگیت رتناکر، ۲ روپ رتناکر، ۳ سنگیت کمرند ۴ بھرت سنگیت۔ ان میں سے پہلی تین

کتابیں جنوبی ہند اور آخری یعنی سنگیت بھرت شمالی ہندوستان میں کافی مقبول ہے۔

راگ درپن: راگ درپن عہد اورنگ زیب میں لکھی جانے والی موسیقی کی دوسری بڑی کتاب مانی جاتی ہے۔ درحقیقت راگ درپن 'مان کتوہل' کا فارسی ترجمہ وتشریح ہے۔ مان کتوہل گوالیار کے راجا مان سنگھ (۱۵۱۸۔۱۴۸۲ء) عیسوی نے اپنے دربار کے موسیقی کے ماہرین سے لکھوائی تھی۔ پھر مان سنگھ کے نام پر ہی اس کا نام 'مان کتوہل' رکھا گیا۔ راگ درپن کے مصنف 'امیر فقیر اللہ سیف خان' کو اورنگ زیب نے کشمیر، ملتان اور الہ آباد کی گورنری بھی عطا کی۔ راگ درپن میں وہ لکھتے ہیں کہ اورنگ زیب مجھ سے خفا ہو گیا اور گورنری واپس لے لی۔ جب عہدہ واپس لے لیا گیا تو ان کے ہاتھ 'مان کتوہل' کا نسخہ آیا اور اس کو ترجمہ وتشریح کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ انھوں نے جب اس کا ترجمہ شروع کیا تو مزید باقی کتابوں کا بھی مطالعہ کیا تاکہ سنگیت کی اہم کتابوں مثلاً سنگیت درپن، بھرت سنگیت اور سنگیت رتناکر کی ضرورت محسوس نہ ہو۔ فقیر اللہ نے لکھا ہے کہ عہد اکبری کی موسیقی کی کتاب 'راگ ساگر' سے میں نے استفادہ نہیں کیا کیوں کہ اس کے مصنف موسیقی میں مہارت نہیں رکھتے تھے۔ اس کے برعکس مان سنگھ کے درباری سبھی موسیقی کے ماہر تھے۔ خوش حال خاں نے بھی اس کتاب کی تعریف کی ہے۔ راگ درپن دس ابواب پر مشتمل ہے۔ آخری باب میں فقیر اللہ نے اپنے ہم عصر موسیقاروں کا ذکر کیا ہے، جن میں چند کے نام حسب ذیل ہیں۔ جگن ناتھ، حسن خان لوہار، رنگ خان کلونت، کشن سین، عہد سنگھ اور میر عماد وغیرہ۔

تشریح الموسیقی: تشریح الموسیقی کے مصنف کا نام محمد اکبر ارزانی ہے۔ اکبر ارزانی عہد عالم گیر کے معروف اطبا میں شمار ہوتے ہیں۔ البتہ انھوں نے موسیقی کی ایک مشہور کتاب 'بدھ پرکاش' کا جس کا مصنف تان سین تھا فارسی ترجمہ کیا۔ اور اس کا نام تشریح الموسیقی رکھا۔ یہ کتاب بھی مان کتوہل کی طرح ترجمہ کی شکل میں موجود ہے۔ مصنف کتاب ہٰذا نے طب کے موضوع پر بھی کتابیں لکھیں۔

شمس الاصوات: شمس الاصوات ہندی سنگیت کی کتاب بنام 'سنگیت' کا فارسی ترجمہ ہے۔ اس کتاب کے مصنف کا نام 'رس برس' ہے۔ کہتے ہیں یہ خوش حال کلونت کا بیٹا تھا۔ مصنف نے لکھا ہے کہ میرا باپ تان سین، سے کم نہیں تھا۔ شمس الاصوات ۱۱۰۹ھ مطابق ۱۶۹۷ عیسوی میں مکمل ہوئی۔ اس کی تاریخ کا مادہ 'جای نغمہ' ہے۔ اس کتاب کے ۱۶ ابواب ہیں۔ باب اول: سر، باب دوم: راگ، باب سوم: الاپ، باب چہارم: اوسام گیت، باب پنجم: قوانین دستک زدن اور باب ششم: ساز پر مشتمل ہے۔

رسالۂ موسیقی: رسالۂ موسیقی ملا فیاض احمد کی تصنیف ہے۔ انھوں نے یہ کتاب شہزادہ محمد اعظم کے لیے لکھی تھی۔ یہ موسیقی کے موضوع پر ایک مختصر رسالہ ہے۔ مصنف نے لکھا ہے کہ شہزادہ محمد اعظم کو موسیقی

سے دلچسپی تھی۔اس میں ایک دیباچہ اور تین باب ہیں۔

معرفتہ النغم: معرفتہ النغم کے مصنف کا نام ابوالحسن قیصر ہے ۔یہ کتاب ۱۶۷۶ عیسوی میں مکمل ہوئی۔معرفتہ النغم ہندستانی اور ایرانی موسیقی پر ایک مستند کتاب ہے۔مصنف نے اس میں دونوں ملکوں کے موسیقاروں اور موسیقی کے فن پر روشنی ڈالی ہے۔ابوالحسن قیصر نے اس کتاب کو تیار کرنے کے لیے متعدد کتابوں کا مطالعہ کیا اور ان کتابوں کی مدد سے معرفتہ النغم کو مکمل کیا۔اس میں دو باب اور ایک مقدمہ ہے۔

تحفتہ الہند: تحفتہ الہند مرزا خان کی تصنیف ہے۔انھوں نے یہ کتاب ۱۶۷۵ عیسوی میں شہزادہ اعظم شاہ کے لیے لکھی تھی۔کہتے ہیں کہ وہ اس وقت موسیقاروں میں سب سے اعلیٰ درجہ کے موسیقی کے دلدادہ تھے۔مرزا خان نے یہ کتاب راگ درپن اور موسیقی کی دوسری کتابوں سے استفادہ کر کے تحریر کی ہے۔اور یہ کتاب بعد کی صدیوں میں زیادہ مقبول ہوئی۔

نشاط الآرا: یہ میر صالح قوال دہلوی کی صوفیانہ موسیقی پر تحریر کردہ کتاب ہے۔یہ سترہویں صدی کے آخر میں لکھی جانے والی موسیقی کی کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔یہ کتاب اصل میں شاہجہاں کے عہد میں فارسی میں لکھی گئی تھی۔میر صالح قوالی کے حوالے سے لکھا گیا ہے کہ وہ شاہجہاں کے دربار کا داروغہ تھا۔

القصہ عہد اورنگ زیب کے موسیقاروں اور کتاب ہائے موسیقی کی بہت اہمیت ہے۔

☆☆☆

محمد عمران رضا
ریسرچ اسکالر جواہر لعل نہرو یونیورسٹی،نئی دہلی۔رابطہ:

احوال وآثار شاہ عالم ثانی

تلخیص:

مغلیہ عہد کو سیاسی طور پر دو ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔پہلا دور عروج جو بابر سے لے کر اورنگ زیب تک تسلیم کیا جاتا ہے۔دوسرا دور زوال ہے جو اورنگ زیب کے بعد سے ۱۸۵۷ء پر محیط ہے۔شاہ عالم ثانی اسی دور زوال کے نمائندہ بادشاہ ہیں جو اپنی موروثی سلطنت کو استحکام نہ بخش سکے۔لیکن ادبی معرکوں میں اپنے نقوش ثبت کیے ہیں اور بالخصوص اردو زبان وادب کے حوالے سے نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔فارسی کے ساتھ ساتھ اردو زبان پر بھی ان کو عبور حاصل تھا اور دونوں ہی زبانوں میں ان کے دیوان موجود ہیں۔اس مقالہ میں ان کی فارسی اور اردو کی ادبی خدمات کا سرسری جائزہ لیا گیا ہے۔

کلیدی الفاظ:

مغلیہ عہد،عہد وسطی،شاہ عالم ثانی،احوال وآثار،ہندوستانی تاریخ وثقافت

....

شاہ عالم ثانی،عزیز الدین عالم گیر ثانی کا بیٹا اور معز الدین جہاں دار شاہ کا پوتا تھا۔اس کی پیدائش ۱۷/ذی قعدہ ۱۱۴۰ھ بمطابق ۱۴/جون ۱۷۲۸ء کو ہوئی۔(۱) ماں کا نام لال کنور تھا۔(۲) پیدائش کے وقت محمد شاہ بادشاہ تھے۔شاہ عالم ثانی کا اسلامی نام میرزا عبداللہ اور خاندانی نام عالی گوہر ہے۔بچپن میں لال میاں اور میرزا بلاقی بھی کہلاتے تھے۔(۳) بادشاہ ہو کر ابوالمظفر جلال الدین محمد شاہ عالم ثانی لقب اختیار کیا۔(۴) ماں کے مرنے کے بعد شاہ عالم کو نواب زینت محل نے گود لے لیا تھا۔(۵) شاہ عالم ثانی کا قد لمبا،شاندار اور چہرہ خوش قطع اور بارعب تھا۔جوانی میں خدوخال شگفتہ تھے،لیکن بڑھاپے میں چہرے سے افسردگی وملال ٹپکنے لگا تھا۔(۶) مزاج میں رحم وکرم اور دل ودماغ میں حوصلہ وجرأت تھی۔مگر سلطنت

کا بار اٹھانے والی صفات کی کمی تھی۔ جلد رائے بدل دیتے اور ہر خوشامدی پر اعتماد کر لیتے تھے۔(۷) غالباً الہ آباد کی بے کاری نے کاہل اور عیش پرست بنایا، مسلسل ناکامیوں کے دکھ نے اس کی تکمیل کی۔ روہیلوں پر فتح پانے کے بعد ہمہ تن عیش وعشرت بن کر رہ گئے تھے۔(۸) یوں تو صبر وتحمل کا مادہ شروع سے ہی موجود تھا، لیکن آخر عمر میں اس کا اظہار جس عمدگی سے کیا وہ بے نظیر ہے۔ اس زمانے میں عبادت وریاضت زیادہ کرنے لگے تھے۔ ثواب کے خیال سے روزانہ کلام پاک کی تلاوت بھی کیا کرتے تھے۔ بزرگوں کا بڑا احترام کیا کرتے تھے۔(۹) خواجہ معین الدین چشتی اور شیخ عبدالقادر جیلانی سے بے حد عقیدت تھی۔ قلعۂ معلیٰ میں ان کا عرس بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا تھا۔ شب عرس کو رنگارنگ کی مہندی آتی، چراغاں ہوتا، آتش بازی چھوٹتی، محفل سماع منعقد ہوتی اور خیر وخیرات کی جاتی تھی۔ دوران سفر بھی بزرگان دین کے مزارات پر فاتحہ خوانی کے لیے جاتے تھے۔(۱۰) نادرات شاہی کی مختلف ہندی نظمیں پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عید الفطر، عید الاضحیٰ، آخری چہار شنبہ اور عرسوں سے ہولی، دیوالی اور بسنت وغیرہ کا اہتمام کسی طرح کم نہ ہوتا تھا۔

تعلیم وتربیت:

شاہ عالم مشرقی زبانوں میں سے فارسی، اردو، ہندی اور پنجابی کی نظم ونثر دونوں پر قادر تھے۔ فن انشا میں وہ درجہ پایا تھا کہ ان کے ہم رتبہ اشخاص میں نظیر نہیں ملتی۔(۱۱) عربی، سنسکرت اور ترکی بھی جانتے تھے۔ خطاطی بھی سیکھی اور نستعلیق ونسخ دونوں خط خوب لکھتے تھے۔ کتابوں کے علاوہ کتبے بھی لکھا کرتے تھے۔ تصوف کا مطالعہ بھی کیا اور سید مراد درویش سے بیعت بھی تھے۔ فنون سپاہ گری سے بھی واقفیت تھی۔ موسیقی میں دخل تھا اور غالباً اس فن میں استاد نذر علی کے شاگرد تھے۔(۱۲)

ولی عہدی:

شاہ عالم ثانی پیدائش سے لے کر جوانی تک نظر بند شہزادے کی حیثیت سے زندگی گزارتے رہے۔ یکایک قدرت نے سلطنت ہندوستان کا ولی عہد بنا دیا تھا۔ پر حوصلہ، دل ودماغ پایا تھا۔ ولی عہدی کے وقت سے کھوئی ہوئی عظمت کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے، مگر قضا وقدر کے آگے ایک بھی نہ چلی اور اس کے برعکس آنکھوں سے بھی محروم ہو گئے۔

اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ ۱۰؍شعبان سنہ ۱۱۶۷ھ بمطابق ۲؍جون ۱۷۵۴ء کو عماد الملک نے شاہ عالم ثانی کے والد کو عالم گیر ثانی کے لقب سے تخت پر بٹھایا اور خود وزارت کا عہدہ اختیار کر کے جز وکل کا

مالک بنا۔ یہ شاہ عالم ثانی کی عمر کا ۲۸؍واں سال تھا۔ ولی عہدی کا عہدہ پا کر شاہ عالم کی آرزوئیں بیدار ہونے لگیں۔ عماد الملک کٹھ پتلی کی طرح بے بس بادشاہ اور ولی عہد چاہتا تھا۔ اسے شہزادے کی حرکتوں سے اندیشہ ہوا، اور وہ ان کے آزار کے درپے ہوا۔ باپ نے بیٹے کی محبت اور عماد الملک کے منصوبوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے، بیٹے کو جھجر اور ہانسی کے پرگنے جاگیر میں دے کر دہلی سے چلے جانے کی اجازت دے دی۔ شاہزادہ ۱۱۷۰ھ/ ۱۷۵۷ء میں تال کٹورہ پہنچا۔ یہاں سے اس نے سلطنت کو عماد الملک کے پنجے چھڑانے کی تدبیر کرنی شروع کی۔ عماد الملک اس خبر سے اور بھی دہشت زدہ ہو گیا کہ کہیں شاہزادہ کی بڑھتی ہوئی طاقت اسے اقتدار چھوڑنے پر مجبور نہ کر دے۔ عماد الملک نے عالم گیر ثانی سے زبردستی شقہ لکھوایا، اور شاہزادہ ولی عہد کو دوبارہ دہلی بلایا۔ شاہزادہ وزیر کی طرف سے مطمئن نہ تھا۔ اس لیے اس نے احتیاطاً جمنا کے کنارے علی مردان خان کی حویلی میں قیام کیا۔ آخر کار وہی ہوا، جس کا شاہزادہ اور بادشاہ دونوں کو خوف واندیشہ تھا۔ یعنی وزیر عماد الملک نے ۱۱؍رمضان ۱۱۷۵ھ بمطابق ۳۰؍مئی ۱۷۵۷ء کو علی الصباح شاہزادے کی قیام گاہ کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن شاہزادہ کسی طرح فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا اور نجیب الدولہ کی دعوت پر میران پور چلا گیا۔ نجیب الدولہ شہزادے سے بڑی عزت واحترام سے پیش آیا اور پچاس ہزار روپیہ ماہانہ شہزادے کو نذر کرنا شروع کر دیا۔ اس قدر ومنزلت کے پس پردہ نجیب الدولہ کی عماد الملک سے دشمنی کارفرما تھی۔ انتقام شہزادے کا بھی مقصد تھا کہ وزیر کو زیر کر کے بادشاہ اور سلطنت دونوں کو آزاد کرا لے۔ نجیب الدولہ شاہزادے کو شریک بنا کر بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا، کیوں کہ روہیلوں کے لیے جاٹوں کی مدد کے بغیر یہ ممکن نہ تھا۔ شہزادہ ناامیدی کی حالت میں ۱۱۷۱ھ/ ۱۷۵۸ء کو لکھنؤ پہنچ گیا۔ یہاں اس کے استقبال میں شجاع الدولہ نے بڑی گرم جوشی دکھائی اور پچاس ہزار روپیہ شاہزادے کو نذر کیے۔ ادھر انگریزوں نے جنگ پلاسی ۱۷۵۷ء کے بعد میر جعفر کو بنگال کی نظامت سونپ دی۔ محمد قلی خاں جو الہ آباد کا صوبیدار تھا، عرصے سے بنگال پر اپنی حکومت کا خواب دیکھ رہا تھا۔ اس نے شہزادے کو الہ آباد آنے کی دعوت دی۔ چنانچہ شاہزادہ اور محمد قلی خان نے بنگال پر حملے کا ارادہ کیا تو شجاع الدولہ نے اس غرض سے اس کی تائید کی کہ وہ عماد الملک کی مخالفت سے بچ جائے گا اور قلی خان کے بعد الہ آباد پر قابض ہو جائے گا۔ شاہزادہ الہ آباد آئے اور محمد قلی خان کی معاونت سے لشکر کے ساتھ ۷؍رجب ۱۱۷۲ھ بمطابق ۷؍مارچ ۱۷۵۹ء کو کرم ناسا ندی پار کی۔ شاہزادے کی جیت متوقع تھی، لیکن انگریزی فوج نے انھیں دل برداشتہ کر دیا۔ اس لیے محمد قلی خان الہ آباد اور شاہزادہ دیوان مکند پور میں فروکش ہو گئے۔(۱۳) شاہ عالم ثانی اس شکست سے گھبرائے نہیں، بلکہ ۲۷؍محرم ۱۱۷۳ھ بمطابق اکتوبر ۱۷۵۹ء کو بہار کی جانب رخ

کیا۔ ابھی کھٹولی پہنچے ہی تھے کہ دہلی سے ان کے باپ عالم گیر ثانی کے قتل کی خبر آئی ۔ یہ قتل عماد الملک نے ۸ ربیع الآخر ۱۱۷۳ھ بمطابق ۲۹ نومبر ۱۷۵۹ء کو کرایا تھا۔ چنانچہ فوراً ہی ۴ جمادی الاول ۱۱۷۳ھ/ ۲۴ دسمبر ۱۷۵۹ء کو شہزادے نے موضع کھٹولی میں شاہ عالم ثانی لقب کے ساتھ اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ نجیب الدولہ اور شجاع الدولہ کے احسانات اسے یاد تھے، اسی لیے اول الذکر کو امیر الامرائی اور دوسرے کو وزارت کا خلعت روانہ کیا۔ نیز احمد شاہ ابدالی کے دربار میں منیر الدولہ کو اپنا سفیر بنا کر بھیجا۔ (۱۴)

بادشاہت:

شاہ عالم ثانی نے اپنی بادشاہت کا اعلان تو کر دیا تھا اور جشن بھی منا لیا تھا، مگر ابھی دہلی کی کرسی دور کی بات تھی۔ تخت نشینی کی رسموں سے فارغ ہو کر ۶ جمادی الاول کو شاہی لشکر نے راجا رام نارائن پر حملہ کر دیا۔ راجا کو انگریزی فوج نے مدد دی ۔ آخر کار بڑے کشت وخون کے بعد شاہ عالم ثانی نے خود کو انگریزوں کے حوالے کر دیا ۔ انگریزوں نے انھیں قلعہ میں ٹھہرایا۔ شاہ عالم ثانی ،انگریزوں کی قید جیسی مہمان داری سے تنگ آ چکے تھے، چنانچہ پٹنہ سے کوچ کر گئے ۔ شجاع الدولہ نے ان کا استقبال کیا اور الہ آباد لے آئے ۔ مگر آزادی یہاں بھی نصیب نہیں ہوئی ، یہاں وہ شجاع الدولہ کے دست نگر رہے۔ اسی درمیان میر قاسم کی انگریزوں سے بگڑی ۔ وہ آخر میں شکست کھا کر شجاع الدولہ کے پاس الہ آباد آ گیا۔ وزیر نے بظاہر اس کی مدد اور بباطن بنگال کو اپنے قبضے میں کرنے کے لیے بادشاہ کے جھنڈے تلے عظیم الشان لشکر اکٹھا کیا۔ اور بہار پر چڑھائی کر دی ۔ ۲۶ ربیع الثانی ۱۱۷۸ھ بمطابق ۲۳ اکتوبر ۱۷۶۴ء کو انگریزوں کی تھوڑی سی فوج نے شاہ و وزیر کے ٹڈی دل لشکر کو شکست دے دی۔ شجاع الدولہ جان بچا کر روہیل کھنڈ آ گئے اور بادشاہ اپنے آپ کو بے یار و مددگار پا کر انگریز سرداروں کے ساتھ واپس چلے گئے ۔ یہ لڑائی ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کر گئی ۔ اب تک انگریز ہندوستان میں تجارت کرتے تھے ۔ اسے فتح کرنے کے بعد انگریز تین بڑے بڑے صوبوں کے حاکم اور آئندہ پورے ملک کے بادشاہ بن گئے ۔ کسی شاعر نے اس فتح کی تاریخ کا کتنا حسب حال مصرعہ کہا ہے:

ع: ’در ہند امیر شد فرنگی‘

۲۴ صفر سنہ ۶ جلوس و سنہ ۱۱۷۹ھ بمطابق ۱۲ اگست ۱۷۶۵ء کو بادشاہ نے ہر سہ صوبہ بنگال کی دیوانی انگریزوں کو عطا کر دی۔ اس کے عوض میں انگریزوں نے ۲۶ لاکھ روپیہ سالانہ بنگال کے محصول میں

سے دلانے کی ضمانت دی اور ۴۸ لاکھ روپے سالانہ آمدنی کے دو صوبے الہ آباد اور کوڑہ جہان آباد بادشاہ کی جاگیر قرار دی۔ بادشاہ کا قیام الہ آباد میں قرار پایا اور انگریزی فوج حفاظت کو متعین ہوئی۔ اب گویا بادشاہ انگریزوں کی قید میں تھے۔ (۱۵) لگاتار ناکامیابی اور ناسازگاریٔ حالات نے شاہ عالم ثانی کو افسردہ خاطر کر دیا اور مزاج میں عیش پرستی داخل ہو گئی۔ عالم گیر ثانی کی وفات کے بعد مرہٹوں نے زور پکڑا لیکن دتا سندھیا اور سداشو بھاؤ کے قتل سے ان کی طاقت میں کچھ کمی آئی لیکن اس کے فوراً ہی بعد جاٹوں اور سکھوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا۔ بھرت پور کا راجا سورج مل جب دہلی کے سپاہیوں کے ہاتھوں مارا گیا تو اس کے بیٹے جواہر سنگھ نے دہلی کو گھیر لیا۔ نجیب الدولہ نے پھر شاہ ابدالی سے مدد لی ۔ جواہر سنگھ کی موت کے بعد مادھو راؤ پیشوا نے آگرہ پر چڑھائی کی ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سکھوں نے دوآبے میں لوٹ مچا رکھی تھی ۔ نجیب الدولہ نے دوآبے کے کچھ اضلاع مرہٹوں کو دے کر ان سے صلح کرنے میں ہی عافیت سمجھی ۔ نجیب الدولہ کی موت کے بعد مرہٹوں نے پورے ملک پر حکومت کرنے کا خواب دیکھنا شروع کر دیا۔ انھوں نے شاہ عالم ثانی کو جو الہ آباد میں تھے ۔ عرضیاں بھیجیں کہ دہلی آ کر اپنے موروثی تخت پر جلوس فرمائیں اور ہندوستان پر حکومت کریں۔ بادشاہ الہ آباد میں رہتے رہتے جمود کا شکار ہو گئے تھے ۔ ان کی بھی خواہش تھی کہ دہلی جائیں ، چنانچہ مرہٹوں نے انھیں دعوت دی تو انگریزوں اور شجاعت الدولہ کی مرضی کے خلاف ۲۹ رمضان ۱۱۸۵ھ/ ۲۵ دسمبر ۱۷۷۱ء کو دہلی چلے آئے ۔ مرہٹوں کی ہندوستان پر حکومت کرنے کی راہ میں سب سے بڑا کانٹا روہیلے تھے ۔ چنانچہ انھوں نے بادشاہ کو آمادہ کیا کہ ضابطہ خان پر حملہ کر دیا جائے ۔ بادشاہ ان کی سازش میں شریک ہو گئے ۔ انھوں نے نجیب الدولہ کی وفاداری اور خدمات پر نگاہ نہ رکھی اور روہیلوں پر حملہ کر دیا۔ ضابطہ خان کو سکرتال کے مقام پر شکست ہوئی ۔ مرہٹوں نے ان کے مال و اسباب لوٹ لیے ۔ لیکن بادشاہ کو مال غنیمت میں سے کچھ بھی نہ دیا اور شاہی آداب و رسوم کا بھی کوئی خاص خیال نہ کیا۔ بادشاہ کو اب ان سے نجات پانے کی فکر ہوئی ۔ بادشاہ نے ان سے چھٹکارا پانے کی یہ تدبیر نکالی کہ مرہٹوں کو تونول سنگھ جاٹ پر چڑھائی کرنے بھیجا اور نجف خان کو جنھوں نے روہیلوں کی جنگ میں بڑی بہادری دکھائی تھی ، بخشی مقرر کر کے مغلیہ فوج میں بھرتی کرائی ۔ مرہٹوں کو بادشاہ کی ان حرکتوں سے شک ہو گیا۔ انھوں نے ضابطہ خان سے معقول تاوان کے بدلے میں امیر الامرائی دلا دینے کا وعدہ کر لیا۔ تکوجی جاٹوں کو چھوڑ کر دہلی آیا اور بادشاہ سے مطالبہ کیا کہ ضابطہ خان کو امیر الامرا بنا دیا جائے ۔ بادشاہ نے اس درخواست کو مسترد کر دیا۔ مرہٹوں نے بزور شمشیر ضابطہ خان کا قصور معاف کرا کے جاگیر اور امیر الامرا کا منصب دلایا۔ اب مرہٹے بادشاہ پر اس قدر حاوی ہو گئے تھے کہ شوال ۱۱۸۶ھ بمطابق دسمبر ۱۷۷۲ء میں بادشاہ سے الہ آباد اور کوڑہ جہان آباد کی سند جاگیر داری بھی لکھوا لی ۔ یہ زور

۱۷۷۲ء میں نارائن پیشوا کے مارے جانے کے بعد ہی کم ہوا۔ نرائن پیشوا کے مارے جانے کے بعد مرہٹے روہیلوں سے صلح کر کے دکن کی طرف چلے گئے۔ مرہٹوں کے جانے کے بعد مرزا نجف خان نے زور پکڑا۔ یہ محمد قلی خان کا ملازم، میر قاسم کا متوسل تھا اور شاہی ملازمت میں رہ چکا تھا۔ اس نے اپنی جاں نثاری دکھلا کر ذوالفقار الدولہ نواب نجف خان بہادر غالب جنگ کا خطاب حاصل کیا۔ شاہ عالم ثانی نے بھی اس سے بڑی مدد لی اور اس کے صلے میں بادشاہ نے دہلی آ کر نجف خان کو امیر الامرا اور نائب وزیر بنا دیا۔ اس کے زمانے میں بادشاہت کا وقار قائم ہو گیا تھا اور یہ امید کی جا سکتی تھی کہ کچھ دنوں کے لیے مغلیہ سلطنت مضبوط ہو جائے گی، لیکن اچانک نجف خان کا انتقال ہو گیا اور امیر الامرا میں پھوٹ پڑ گئی۔

تاریخ کے اوراق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جیسا بدقسمت بادشاہ شاید ہی مغلوں میں گزرا ہو۔ اس کے متوسلوں میں محمد شفیع خان اور افراسیاب خان پہلے تو امیر الامرائی کے منصب کے لیے جھگڑتے رہے۔ لیکن پھر متحد ہو کر بادشاہ کو مصیبت میں ڈال دیا۔ افراسیاب خان نے اقتدار ملنے کے بعد بادشاہ کو پریشان کرنا شروع کر دیا، اور بادشاہ کو آگرہ لے آیا تاکہ درباری اس کے کان نہ بھر سکیں۔ یہاں مادھو جی سندھیا راجا گوہر سے جنگ کر رہا تھا۔ بادشاہ نے خفیہ طور پر اس سے مدد مانگی۔ لڑائی سے فارغ ہو کر مادھو جی سندھیا نے افراسیاب کو قتل کرا دیا۔ لیکن بادشاہ اب بھی آزاد نہ ہوا۔ اب بادشاہ پر مادھو کا قبضہ تھا۔ مادھو نے آگرہ اور دہلی کے علاقوں پر قبضہ کر کے ۶۵ ہزار روپیہ ماہوار بادشاہ کی تنخواہ مقرر کر دی اور امرا کی تمام جاگیریں ضبط کر لیں۔ اس حرکت سے مادھو کے خلاف غم وغصہ پیدا ہو گیا۔ چنانچہ جب وہ راجا پرتاپ سنگھ والی جے نگر سے لڑنے گیا، تو اس لڑائی میں عین وقت پر سرداروں نے دھوکا دے دیا۔ اور مادھو رجی سندھیا کو شکست کھا کر گوالیار چلا جانا پڑا۔

بادشاہ کا نابینا کیا جانا:

سندھیا کے چلے جانے کے بعد غلام قادر خان نے چڑھائی کر دی۔ یہ ضابطہ خان کا بیٹا اور نجیب الدولہ کا پوتا تھا۔ جب باشاہ مرہٹوں کے ساتھ مل کر غوث گڑھ تباہ کر کے ضابطہ خان کے بیوی بچوں کو پکڑ کر لایا تھا، غلام قادر خان کی عمر ۸ یا ۱۰ سال کی تھی۔ قیدیوں میں سے اس کو بادشاہ نے قتل کرا دینا چاہا۔ منظور علی خان ناظر نے منت کر کے جان بخشی کرائی۔ یہ بہت خوب صورت لڑکا تھا۔ بادشاہ نے اسے منظور نظر بنا کر خصی کرا دیا اور قدسیہ باغ میں لا کر رکھا۔ بچپن میں اس نے بہت ذلت برداشت کی تھی۔ اب ضابطہ خان کے مرنے کے بعد غلام قادر خان جاگیر دار قرار پایا۔ اسے مرہٹوں سے سخت عناد تھا جو غوث گڑھ کی

تباہی کا باعث ہوئے تھے۔ منظور علی خان ناظر بھی اس جماعت سے تنگ آ گیا تھا۔ ان دونوں نے مل کر مرہٹوں کو دہلی سے نکال کر باہر کرنے کا منصوبہ باندھا۔ جب سندھیا گوالیار چلا گیا، تو غلام قادر خان نے ناظر کی مدد سے دہلی کے قلعے پر قبضہ کر کے اپنا آبائی منصب امیر الامرائی حاصل کر لیا۔ دربار کے مسلمان امیر اس کے ساتھ ہو گئے اور بظاہر یہ نظر آنے لگا کہ شمالی ہندوستان سے مرہٹوں کا اقتدار اٹھ جائے گا۔ غلام قادر خان نے علی گڑھ کا قلعہ مرہٹوں سے چھین لیا۔ اس کے بعد اسماعیل بیگ کی مدد سے آگرہ کا بھی محاصرہ کر لیا۔ ۱۶/ رجب سنہ ۱۲۰۱ھ/ ۲۴/ اپریل ۱۷۸۷ء کو زبردست جنگ ہوئی، جس میں روہیلوں نے خوب خوب بہادری کے جوہر دکھائے، مگر اسی اثنا میں سہارن پور کے علاقے میں سکھ گھس آئے اور غلام قادر کو واپس جانا پڑا۔ آغاز سنہ ۱۲۰۲ھ/ اکتوبر ۱۷۸۷ء میں غلام قادر خان پھر دلی آیا۔ شاہ عالم نے سندھیا کو کمک کے لیے طلب کیا۔ غلام قادر خان نے اپنے رفیقوں کو بلایا۔ ساری مغل سپاہ بادشاہ کے اس عمل سے ٹوٹ کر غلام قادر خان سے مل گئی۔ بادشاہ نے منظور علی خان کی معرفت غلام قادر خان کو بلا کر امیر الامرا بنا دیا۔ غلام قادر نے عرض کیا کہ سپاہ کا ارادہ یہ ہے کہ متھرا جا کر مرہٹوں سے لڑیں اور ہندوستان سے ان کا نام ونشان مٹا دیں، لیکن اس کے لیے روپے کی ضرورت ہے۔ تمام اہل کاروں نے اس کی تائید کی، مگر سیتل داس خزانچی نے روپیہ دینے سے انکار کر دیا۔ (۱۶) غلام قادر کو اس میں بادشاہ کا اشارہ معلوم ہوا۔ اس نے وہ خط نکال کر سامنے ڈال دیا، جو بادشاہ نے سندھیا کو غلام قادر خان کے مقابلے میں مدد کے لیے لکھا تھا۔ اس نے بادشاہ کو معزول کر کے ۲۲/ شوال ۱۲۰۲ھ کو احمد شاہ کے بیٹے بیدار بخت کو تخت پر بٹھا دیا۔ چوں کہ اس کو شاہ عالم ثانی کی مرہٹہ پرستی اور ان کے کہنے پر روہیلوں سے لڑنے اور انھیں تباہ کرنے کا بہت ملال تھا، اس لیے اس نے قلعۂ معلیٰ کو لوٹنا کھسوٹنا شروع کر دیا۔ غوث گڑھ کی لوٹ کے وقت اس کے خاندان پر جو کچھ گزری تھی، اس سے زیادہ شاہی خاندان پر گزر گئی۔ شاہزادوں اور شاہزادیوں کو مار پیٹ اور بھوک پیاس کی تکلیفیں دی گئیں، اور تن کے کپڑوں کے علاوہ ہر چیز ان سے چھین لی گئی۔ اپنی بے عزتی کا غلام قادر نے اس طرح انتقام لیا کہ سب شہزادوں اور شہزادیوں کو برسر عام بے پردہ نچایا اور گانے کو کہا، گھمایا اور شاہ عالم کو یہ منظر دکھایا تاکہ انھیں اپنی پچھلی حرکتوں کی یاد آئے اور اس سے عبرت ہو۔ اگر یہ ڈراما اسی حد تک پہنچ کر ختم ہو جاتا تب بھی بہت دردناک تھا، لیکن غلام قادر خان کا جذبہ انتقام جوش پر تھا۔ اس نے ۷/ ذی قعدہ ۱۲۰۲ھ/ ۱۰/ اگست ۱۷۸۸ء کو دیوان عام میں بلا کر بادشاہ سے روپیہ طلب کیا اور بادشاہ کے انکار پر نیچے گرا کر پیش قبض سے آنکھیں نکال لیں۔ (۱۷) سندھیا نے اس درد بھری کہانی کی خبر سن کر مرہٹوں کی فوج بھیجی۔ غلام

قادر خان کے ساتھی اس سے الگ ہو گئے اور یہ چند شاہزادوں کو زبردستی اپنے ساتھ لے کر میرٹھ چلا گیا۔مرہٹوں نے پیچھا کیا اور بڑی بھاگ دوڑ کے بعد پکڑ کر ربیع الاول سنہ ۱۲۰۳ھ/دسمبر ۱۷۸۸ء کو بڑے دکھ سے مار ڈالا۔لاش کو کاٹ کر بادشاہ کے معائنے کے لیے دہلی بھیجا۔(۱۸)اس کے بعد سندھیا نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ بادشاہ کو دوبارہ تخت پر بٹھا دیا جائے۔میر نے ان حالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بادشاہ صرف نام کا تھا عملی طور پر مرہٹوں کی عمل داری تھی۔(۱۹) شاہ عالم ثانی نے ان واقعات کو ایک خود نوشت مرثیہ میں بڑے پر درد انداز میں بیان کیا ہے ۔

چہ حادثہ کہ برخاست پی خواری ما	داد برباد سر و برگ جہان داری ما
آفتاب فلک رفعت شاہی بودیم	برد در شام زوال آہ سیہ کاری ما
چشم ما کندہ شدہ از دست فلک بہتر شد	کہ نہ بینم کہ کند غیر جہان داری ما
داد افغان بہ چہ شوکت شاہی برباد	کیست جز ذات مرہتہ کہ کند یاری ما
کردہ سی سال نظارت کہ مرا داد برباد	زود تر یافتہ پاداش ستم کاری ما
قوم مغلیہ و افغان ہمہ بازی دادند	بسکہ گشتند مجوز بہ گرفتاری ما
شیر دادیم و افعی بچہ را پروردہ ایم	عاقبت گشت مجوز بہ گرفتاری ما(۲۰)

دہلی کا پایۂ تخت،انگریزوں کے نزدیک شروع سے توجہ کا مرکز تھا۔اب حالات بھی سازگار ہو گئے تھے۔چنانچہ لارڈ لیک کی کمان میں انگریزی افواج نے دہلی کا رخ کیا اور ۱۸۰۳ء میں ان کا ایک جنرل مرہٹوں سے شہر دہلی کی حکومت چھین لینے میں کامیاب ہو گیا۔بنگال،بہار،اڑیسہ کی دیوانی کی سند سونپ دینے والے بادشاہ کو انگریزوں نے اب اپنے قبضہ میں لے لیا اور ان کی جائداد کے علاوہ صرف ایک لاکھ روپے سال کا وظیفہ مقرر کر کے انھیں قلعہ معلیٰ میں زندگی کے بقیہ دن گزارنے پر مجبور کر دیا۔(۲۱) انگریزوں کی قید ایسی نہ تھی کہ اس سے جیتے جی چھوٹنا نصیب ہوتا۔چنانچہ زندگی کے یہ آخری چند سال بڑی بے بسی اور دکھ کی حالت میں گزار کر ۷/رمضان سنہ ۱۲۲۱ھ/۱۹/نومبر ۱۸۰۶ء کو بادشاہ شاہ عالم اس دنیا سے رخصت ہوئے اور احاطہ قطب الدین بختیار کاکی میں بہادر شاہ اول کی قبر کے برابر مغربی سمت میں دفن کیے گئے۔''فردوس مکان شاہ عالم بادشاہ'' سے تاریخ وفات نکلتی ہے۔ان کی حکومت کی کل مدت ۴۸ سال ہے،جس میں سے ۱۲ برس بہار و الہ آباد میں اور ۱۷ برس بینائی کے ساتھ اور ۱۹ برس آنکھیں کھو کر دلی میں گزارے تھے۔(۲۲)

تصنیفات و آثار:

مغل بادشاہوں کو تصنیف و تالیف سے دلچسپی ہمیشہ رہی ہے۔بابر کی تزک بابری،میرزا کامران کا فارسی دیوان،جہاں گیر کی تزک جہاں گیری،دارا شکوہ کی سرّ اکبر،عالم گیر ثانی کی مجموعہ روزگار وغیرہ ان کی علمی و ادبی دلچسپیوں کے تاریخی شواہد ہیں۔شاہ عالم ثانی بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔ظاہر ہے کہ شاہ عالم پر ماحول کا اثر ہونا ضروری تھا۔وہ اپنے بزرگوں کے اقتدار میں تو شریک ہیں ہی،لیکن فنون لطیفہ سے دلچسپی میں بھی ان کی وارثت کے نمائندے ہیں۔ایک دیوان فارسی،ایک دیوان اردو،فارسی اور ہندی شعروں پر مشتمل ایک اردو مثنوی (منظوم اقدس)،نثر میں قصہ شاہ شجاع الشمس اور عجائب القصص ان کی ادبی دلچسپیوں اور قلمی سرگرمیوں کی یادگار ہیں۔پہلے ہم ان کی ان کتابوں کا مختصر تعارف کراتے ہیں۔پھر ان کی شاعری اور نثری شہ پارے کی خصوصیت پر خامہ فرسائی کریں گے۔

۱۔دیوان فارسی:

اس دیوان کا ایک قلمی نسخہ بہار ریسرچ سوسائٹی پٹنہ کے کتاب خانے میں محفوظ ہے۔(۲۳)اس نسخے میں ۹۱ ورق ہیں اور ہر ورق میں ۱۵ سطریں ہیں۔غزلوں اور قطعوں کی تعداد ۲۲۱ ہے۔کتاب کے خاتمے سے معلوم ہوتا ہے کہ قیام الدین محمد بردوانی نے غرہ صفر سنہ ۱۲۰۶ھ/ ۲۸ ستمبر ۱۷۹۰ء کو بدھ کے دن اسے لکھ کر پورا کیا تھا۔پہلا شعر یہ ہے:

الٰہی از کرم چوں پادشاہی دادہ تو ما را
مطیع حکم ما از لطف کن اقلیم دلہا را

دوسرا نسخہ برٹش میوزیم لندن میں ہے۔اس میں ۱۴۷ ورق اور ہر ورق میں گیارہ سطریں ہیں۔تیسرے ورق پر شاہ عالم کی بہت عمدہ تصویر ہے۔یہ پہلے لکھنؤ کے شاہی کتاب خانے میں تھا وہاں سے جارج ولیم ہملٹن کے قبضے میں آیا اور ان سے برٹش میوزیم تک پہنچا۔اس کی تاریخ کتابت شوال سنہ ۱۲۰۹ھ/اپریل ۱۷۹۵ء ہے۔ڈاکٹر اشپرنگر نے شاہان اودھ کے کتاب خانوں کی فہرست میں اس دیوان کے دونوں نسخوں کا ذکر کیا ہے۔اس کے علاوہ ایک دوسرے نسخے کا بھی ذکر کیا ہے۔میونخ لائبریری اور اسلو کے ذخیرے میں بھی اس دیوان کا ایک نسخہ محفوظ ہے۔(۲۴)

۲۔دیوان اردو:

آزاد دہلوی نے شاہ عالم کے چار اردو دواوین بتائے ہیں۔(۲۵) ڈاکٹر اسپرنگر نے اپنی فہرست میں صرف ایک نسخے کا ذکر کیا ہے۔(۲۶)اس کے نسخے میں ۲۴۴ صفحے اور ہر صفحے میں ۸ سطریں تھیں۔ ظاہری خوب صورتی میں یہ نسخہ قابل قدر تھا۔اشپرنگر نے اس کا حسن مطلع یہ لکھا ہے:

کیجیے ہمدم بھلا کیوں کر نہ شکوہ یار کا
ہم تو بندے اس کے ہوں، وہ یار ہو اغیار کا

اب یہ دیوان نایاب ہے،لیکن جو اردو اشعار مختلف تذکروں میں دہرائے گئے ہیں ان سے بادشاہ کے رنگ تغزل کے بارے میں رائے قائم کی جاسکتی ہے۔(۲۷)

۳۔منظوم اقدس:

یہ اردو کی ایک مثنوی ہے،جس میں شاہ عالم نے بادشاہ چین کا قصہ نظم کیا ہے۔اس کا نام تاریخی ہے،جس سے سنہ ۱۲۰۱ھ/ ۸۷۔۱۷۸۶ء نکلتا ہے۔حجم کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ صفحوں کی تعداد ۱۵۰۰ اور ہر صفحے کی سطروں کی تعداد ۹ تھی۔ پہلا شعر یہ ہے:

حمد خدائے عزّوجل کیجیے بیاں
مخلوق جس کی ہیں، چہ زمین اور چہ آسماں

اب اس مثنوی کا بھی پتا نہیں چلتا۔(۲۸)

۴۔قصہ شاہ شجاع الشّمس:

میر قدرت اللہ قاسم نے لکھا ہے کہ یہ نثر ریختہ میں تھا۔(۲۹) آزاد دہلوی نے اس کا ذکر خم خانہ جاوید کے حوالے سے کیا ہے۔(۳۰)منشی ذکاء اللہ نے اس کا نام شاہ عالم کا قصہ بتایا ہے اور چار جلدوں میں ہونے کی بات کہی ہے۔(۳۱)لیکن اب یہ بھی کہیں موجود نہیں ہے۔(۳۲)

۵۔عجائب القصص:

اس کا قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لاہور میں محفوظ ہے۔(۳۳) یہ ایک نامکمل داستان ہے، جو نثری شہ پارے میں بیان کی گئی ہے۔بعض محققین کو اس کی اصلیت پر شک ہے۔(۳۴) یہ اٹھارہویں صدی عیسوی کی اہم نثری تصنیف ہے۔شک کی وجہ مصنف کا اپنے ہی لیے تعظیمی الفاظ کا استعمال کرنا ہے،مثلاً لکھتے ہیں:''ایام طفولیت سے ،خاطر مبارک ہماری، مائل و راغب۔جب چند دیوان بزبان فارسی اور بزبان

ریختہ،ارشاد حضور والا ،مرتب ہوئے۔یکا یک یہ مزاج اقدس و ارفع و اعلیٰ میں آیا۔''(۳۵) یہاں خاطر مبارک ہماری ،ارشاد حضور والا ،مزاج اقدس وارفع و اعلیٰ ،غور طلب الفاظ ہیں۔کیا ایک مصنف خود اپنے سلسلے میں اس نوع کے الفاظ استعمال کرسکتا ہے۔مگر یہ شک کرنے کی مضبوط دلیلیں نہیں ہیں۔ عجائب القصص بادشاہ کے نابینا کیے جانے کے بعد کی کتاب ہے۔ظاہر ہے بادشاہ نے املا کرایا ہوگا اور کاتبوں اور منشیوں نے شعوری یا لاشعوری طور پر احترام بادشاہت کے پیش نظر اس طرح کے الفاظ کا استعمال کرلیا ہوگا،گرچہ اس کتاب میں ہمیں کہیں کہیں دو طرح کا اسلوب نظر آتا ہے،مگر بہت کم ۔اس لیے یہ مان لینے میں کوئی تامل نہ ہونا چاہیے کہ یہ شاہ عالم ثانی کی تصنیف ہے۔مگر اس میں دوسروں کی کوشش اور مدد کہاں تک شامل ہے، یہ کہنا مشکل ہے۔(۳۶)اس داستان میں بول چال کی زبان استعمال کی گئی ہے۔منشی ذکاء اللہ کا کہنا ہے کہ اس کی عبارت چار درویش سے کم نہیں۔(۳۷) ڈاکٹر ارتضیٰ کریم کی تحقیق کے مطابق قصہ شاہ شجاع الشّمس اور عجائب القصص ایک ہی کتاب ہے۔مولانا امتیاز علی عرشی کو اس کے دو نام ہونے کی وجہ سے تسامح ہوا ہے۔ارتضیٰ کریم کا کہنا ہے کہ چوں کہ اس میں شجاع الشّمس کا کردار مرکزی اہمیت رکھتا ہے، اس لیے تذکرہ نویس نے اس کا نام قصہ شجاع الشّمس رکھا اور نظر ثانی کرتے وقت مصنف نے اس کا نام عجائب القصص رکھ دیا ہو۔صرف اس بنا پر کہ قدرت اللہ قاسم اور مولوی ذکاء اللہ نے اسے قصہ شاہ شجاع الشّمس لکھا اور موجودہ کتاب کا نام عجائب القصص ہے اسے مشکوک نظروں سے دیکھنا اور یہ خیال کرنا کہ یہ دونوں الگ الگ تصانیف ہیں۔میرے نزدیک زیادہ صحیح اور مناسب نہیں۔(۳۸)

عجائب القصص ایک نامکمل داستان ہے۔مگر جتنی بھی دستیاب ہے اس سے شاہ عالم ثانی کے فکری ابعاد اور علمی اسلوب کا اندازہ ہوجاتا ہے۔

۶۔نادرات شاہی:

یہ شاہ عالم کے اردو، فارسی ، ہندی اور پنجابی شعروں کا مجموعہ ہے۔کتاب میں پنجابی کے دوہے گنتی کے ہیں۔فارسی اور اردو کلام، پنجابی سے زیادہ ہے،مگر سب سے زیادہ ہندی ہے۔اتنا زیادہ کہ اس لحاظ سے اس کتاب کو ہندی کی کتاب کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔تاہم اس میں ہندی کی بھی کل نظمیں نہیں ہیں۔چنانچہ وقائع عالم شاہی سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ عالم نے مادھوراؤ پٹیل کی تعریف میں کئی دوہے کہے تھے۔چوں کہ اس کی تاریخ تصنیف محرم سنہ ۱۱۹۹ھ ہے اور نادرات شاہی سنہ ۱۲۱۲ھ میں مرتب کی گئی تھی، اس لیے یہ ماننا پڑے گا کہ جان کر یا بھولے سے بہر حال کچھ ہندی کلام اس میں شامل ہونے سے رہ بھی گیا

ہے۔(۳۹) بہر حال اس کتاب کو مولانا امتیاز علی عرشی نے ایک شاندار علمی مقدمہ کے ساتھ شائع کر دیا ہے اور اب یہ طالب علموں کے لیے ہر جگہ دستیاب ہے۔اس کتاب سے شاہ عالم ثانی کی شاعری کا کچھ اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔یہ معلوم ہے کہ شاہ عالم ثانی اردو، فارسی، پنجابی اور ہندی چاروں بھاشا میں شعر کہتے تھے۔ اردو اور فارسی میں آفتاب اور ہندی میں شاہ عالم تخلص فرماتے تھے۔ بحر اجازت نہ دیتی تو آفتاب کا مترادف خورشید لکھ دیا کرتے تھے۔نعتیہ اشعار دیکھیے۔

تم نے بخشا ہے جو اس کو تاج، یا تاج النبی   شاہ عالم کی رکھو تم لاج، یا تاج النبی
بادشاہی اس کے تئیں تم بخشو ہفت اقلیم کی   سارے ملکوں کا دلاؤ باج، یا تاج النبی
سربلندی آفتاب اپنے کو بخشو دہر میں   کیوں کہ ہو تم صاحب معراج، یا تاج النبی (۴۰)

منقبت کے یہ اشعار دیکھیے۔

مہندی یہ حضرت غوث الصمدانی کی ہے   روشنی اس شرف انسی و جانی کی ہے
آئینہ راز حقیقت کا ہے جس کی صورت   روشنی اس گہر بحر معانی کی ہے
ظاہر آفاق میں ہیں، جس کے فیوض باطن   مہندی اس عالم اسرار نہانی کی ہے
آفتاب اس کا ثنا خواں ہے، جہاں میں جس کی   جا بجا خوبی بیاں، شیریں زبانی کی ہے (۴۱)

مختلف غزلوں کے مختلف اشعار نظر قارئین ہیں۔

پاتا نہیں ہوں اور کسی کام سے لذت   جو کچھ کہ میں پاتا ہوں تیرے نام سے لذت (۴۲)
جب وہ نظریں دو چار ہوتی ہیں   تیر سی دل کے پار ہوتی ہیں
آفتاب اس کے وصل کی باتیں   باعث اضطرار ہوتی ہیں (۴۳)

مولیٰ علی کی شان میں التماس کرتے ہوئے یہ اشعار دیکھیے۔

کرتا ہے ہر مہم کو تو عالی جناب فتح   یا مرتضیٰ علی، تو مجھے دے شتاب فتح
میں بندہ خاک تجھ سے کرتا ہوں التماس   کر میری مشکلات کو یا بوتراب فتح
مشکل کشائے خلق تیرا نام پاک ہے   تو نے کیا ہے قلعۂ خیبر کا باب فتح
پکڑا ہے تیرا ہاتھ شہ ذوالفقار نے   چاہ اس سے ہر مہم میں تو، اے آفتاب فتح (۴۴)

کچھ منتخب اشعار حمد کے بھی ملاحظہ ہوں۔

واحد ہے لا شریک تو، ثانی ترا کہاں   عالم ہے سب کے حال کا تو، ظاہر و نہاں
ظاہر میں تو اگرچہ نظر آتا ہے نہیں   دیکھا جو میں نے غور سے تو ہے جہاں تہاں

احساں ترے شمار میں کیوں کوئی لا سکے   رازق ہے ساری خلق کا تو ہی، تو بے گماں
قاصر ہے یہ زبان مری شکر سے ترے   کیا کر سکوں ہوں حمد و ثنا کا تری بیاں (۴۵)

یہ چند اشعار معروف مشرقی زبانوں میں کہے گئے ہیں، جن سے ان کے فکر و خیال کا پتا چلتا ہے اور ان زبانوں پر قدرت پر روشنی پڑتی ہے۔اب چند اشعار ان کی آبائی و خاندانی زبان فارسی سے اخذ کیے جاتے ہیں، جن سے شاہ عالم ثانی کی زبان دانی کا پتا چلتا ہے۔

داریم آرزوی جمال تو، ای صنم   گاہی نشد نصیب وصال تو، ای صنم
بسیار فحش از تو شنیدم، ای صنم   غیر از جفا و جور ندیدم، ای صنم (۴۶)
خواہم کہ کنم درد دل خود بہ تو ظاہر   گفتن نتوانم، چون شوم پیش تو حاضر
چشم تو رسانید بہ من نشۂ مستی   زلف تو بما داد پریشانیٔ خاطر
بردی دلم از دست بہ انداز خرامی   قربان سر پای تو منم، ای بت کافر (۴۷)
ای دوست دار من، تو گذر ہم نمی کنی   افسوس یار من تو گزر ہم نمی کنی
در باغ سیہ ام، ز فراق تو گل شگفت   بر لالہ زار من، تو گزر ہم نمی کنی
من انتظار وصل تو ہر روز می کشم   ای گل عذار من، تو گزر ہم نمی کنی
سوزم ز عشق تو صنما مثل آفتاب   ای دل فگار من، تو گذر ہم نمی کنی (۴۸)

☆☆☆

حوالہ جات:

۱۔جام جہاں نما، قدرت اللہ شاہ، رضا لائبریری رام پور، ص ۱۲
۲۔مفتاح التواریخ، تھامس ولیم بیل، مطبع نول کشور، ص ۳۴۳
۳۔واقعات اظفری، مرزا علی محمد ظہیر الدین، نوری پریس لمیٹڈ، مدراس، ص ۲
۴۔نادرات شاہی، امتیاز علی خان عرشی، رضا لائبریری، رام پور، ص ۷
۵۔شاہ عالم نامہ، غلام علی خان، رائل کلکتہ ایشیاٹک سوسائٹی، ۱۹۱۲ء، ص ۵۱
۶۔فرینکلن، ولیم فرینکلن، ہسٹری آف رین آف شاہ عالم ثانی، لندن، ۱۸۹۸ء، ص ۱۹۵
۷۔ایضاً، ص ۱۹۶
۸۔جام جہاں نما، قدرت اللہ شاہ، رضا لائبریری رام پور، ص ۴

۹۔آب حیات،محمد حسین آزاد،کتابی دنیا،۱۹۵۵ء،ص ۱۸۶
۱۰۔شاہ عالم نامہ،غلام علی خان،رائل ایشیاٹک سوسائٹی،کلکتہ،۱۹۱۲ء،ص ۶۹۔۱۰۳۔۱۱۷
۱۱۔فرینکلن،ولیم فرینکلن،ہسٹری آف رین آف شاہ عالم ثانی،لندن،۱۸۹۸ء،ص ۱۹۵
۱۲۔مقدمہ نادرات شاہی،امتیاز علی خاں عرشی،رضا لائبریری،رام پور،ص ۱۱
۱۳۔شاہ عالم نامہ،غلام علی خان،رائل کلکتہ ایشیاٹک سوسائٹی،۱۹۱۲ء،ص ۸۸
۱۴۔ایضاً،ص ۱۰۳
۱۵۔تاریخ ہندوستان،جلد نہم،مولوی ذکاءاللہ،شمس المطابع،دہلی،ص ۳۱۴
۱۶۔ایضاً،ص ۳۳۹
۱۷۔واقعات اظفری،مرزا علی محمد ظہیرالدین،نوری پریس لمیٹڈ،مدراس،ص ۸۔۷
۱۸۔تاریخ ہندوستان،جلد نہم،مولوی ذکاءاللہ،شمس المطابع،دہلی،ص ۳۴۲
۱۹۔ذکر میر،میر تقی میر،قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،نئی دہلی،۲۰۱۱ء،ص ۱۹۱
۲۰۔تاریخ ہندوستان،جلد نہم،مولوی ذکاءاللہ،شمس المطابع،دہلی،ص ۳۴۴۔۳۴۳
۲۱۔ایضاً،جلد نہم،ص ۳۴۴
۲۲۔مفتاح التواریخ،تھامس ولیم بیل،مطبع نول کشور،ص ۳۷۵
۲۳۔عجائب القصص کا تنقیدی مطالعہ،ارتضیٰ کریم،زلال پبلی کیشن،دہلی،ص ۳۲
۲۴۔نادرات شاہی،امتیاز علی خاں عرشی،رضا لائبریری،رام پور،ص ۶۰
۲۵۔آب حیات،محمد حسین آزاد،کتابی دنیا،۱۹۵۵ء،ص ۸۰
۲۶۔فہرست کتاب خانہ ہای شاہان اودھ،اشپرنگر،اکرم چغتائی،انجمن ترقی اردو پاکستان،ص ۵۹۷
۲۷۔نادرات شاہی،امتیاز علی خاں عرشی،رضا لائبریری رام پور،ص ۴۱
۲۸۔ایضاً،ص ۴۱
۲۹۔مجموعہ نغز،جلد یکم،میر قدرت اللہ،۱۹۳۳ء،ص ۱۷
۳۰۔نادرات شاہی،امتیاز علی خاں عرشی،رضا لائبریری رام پور،ص ۴۲
۳۱۔تاریخ ہندوستان،جلد نہم،مولوی ذکاءاللہ،شمس المطابع،دہلی،ص ۳۱۱
۳۲۔نادرات شاہی،امتیاز علی خاں عرشی،رضا لائبریری رام پور،ص ۴۲
۳۳۔عجائب القصص کا تنقیدی مطالعہ،ارتضیٰ کریم،زلال پبلی کیشنز،دہلی،ص ۳۵

۳۴۔ایضاً،ص ۳۵
۳۵۔ایضاً،ص ۲۶
۳۶۔ایضاً،ص ۴۶
۳۷۔تاریخ ہندوستان،جلد نہم،مولوی ذکاءاللہ،شمس المطابع،دہلی،ص ۳۴۵
۳۸۔عجائب القصص کا تنقیدی مطالعہ،ارتضیٰ کریم،زلال پبلی کیشنز،دہلی،ص ۵۵
۳۹۔نادرات شاہی،امتیاز علی خان عرشی،رضا لائبریری،رام پور،ص ۴۲
۴۰۔ایضاً،ص ۱۰۰
۴۱۔ایضاً،ص ۹۰
۴۲۔ایضاً،ص ۶۲
۴۳۔ایضاً،ص ۴۷
۴۴۔ایضاً،ص ۸۸
۴۵۔ایضاً،ص ۸۷
۴۶۔ایضاً،ص ۲۰۴
۴۷۔ایضاً،ص ۲۰۲
۴۸۔ایضاً،ص ۲۰۴

☆☆☆

محمد ولی اللہ قادری
گورنمنٹ انٹر کالج، چھپرہ۔ رابطہ نمبر: 9852234311

’ظفر کمالی: شخصیت اور فنی جہتیں‘: ایک مثالی کتاب

تلخیص:

’ظفر کمالی: شخصیت اور فنی جہتیں‘ دراصل بزم صدف انٹرنیشنل کی جانب سے ظفر کمالی کی خدمت میں نایاب تحفہ ہے۔ ظفر کمالی کی شخصیت اور خدمات کے اعتراف میں بزم صدف نے ۲۰ر نومبر ۲۰۲۲ء کو شان دار سمینار کیا۔ پھر سال بھر کے اندر ہی سمینار کے مقالات کو ادبی دنیا میں پیش کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ بزم صدف انٹرنیشنل ایوارڈ سے بھی انھیں نواز کر بزمِ صدف نے ہماری خوشی دوبالا کر دی۔ کتاب میں چند مقالات پہلے کے بھی ہیں لیکن اُن کی اہمیت و افادیت مسلم ہے۔ کتاب کی ترتیب درج ذیل لحاظ سے کی گئی ہے۔ ابتدائیہ، کلیدی خطبہ، شخصیت، تحقیق، رباعی گوئی، ظرافت، نظموں کے تجزیے، ادب اطفال اور شعری تاثرات۔ ابتدائیہ میں جناب عامر سبحانی کا خطبہ بھی شامل ہے جسے سمینار کے افتتاح کے موقع پر دیا گیا تھا۔

ناقدین کا مجموعی تاثر یہ ہے کہ ظفر کمالی کی خدمات میں سب سے اہم ظرافت نگاری ہے۔ اسی سبب ظرافت نگاری کے باب میں گیارہ مضامین ہیں۔ اس باب کی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں عالم دین، صحافی، شاعر، محقق اور ناقد سبھی شعبہ جات سے تعلق رکھنے والی شخصیات کے مضامین شامل ہیں۔ نیز مرحومین، بزرگ اور نئی نسل کے قلم کاروں کی شمولیت اس باب کی اہمیت و افادیت کو دوبالا کر رہی ہے۔

کلیدی الفاظ:

ظفر کمالی: شخصیت اور فنی جہتیں، بزم صدف انٹرنیشنل، شخصیت، خدمات، سمینار، سمینار کے مقالات، شاعری، رباعی گوئی، ظرافت نگاری۔

....

معاصرین کے مابین ادبی رقابت کی مثال اردو زبان و ادب میں آسانی سے مل جاتی ہے۔ البتہ

معاصرانہ رفاقت کا نمونہ خال خال ہی نظر آتا ہے۔ عہد حاضر میں تو معاصرانہ رفاقت کی مثال تلاشنا عقل مندی نہیں۔ اس کے باوجود عہد حاضر میں ظفر کمالی اور صفدر امام قادری کی ادبی رفاقت کو مثالی اور قاضی عبد الودود اور کلیم الدین احمد کی رفاقت کا عکس ثانی قرار دیا جائے تو ذرہ برابر مبالغہ نہیں ہوگا۔ جس طرح کلیم الدین احمد نے معاصر کا قاضی عبدالودود نمبر شائع کیا تھا اسی طرح ’ظفر کمالی: شخصیت اور فنی جہتیں‘ جیسی معتبر اور ضخیم کتاب مرتب فرما کر اور کلیم الدین احمد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے صفدر امام قادری نے اردو زبان کے قارئین کی خدمت میں ایک عظیم تحفہ پیش کیا ہے۔ یہ کتاب ’’من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو‘‘ کا مصداق ہرگز نہیں ہے، بلکہ ایک ادبی فریضہ ادا کیا گیا ہے جیسا کہ صفدر امام قادری نے عرض مرتب میں لکھا ہے:

> ’’ظفر کمالی پر یہ مجموعۂ مضامین حقیقت میں اُن سے ہماری جو دیرینہ محبت ہے، اس کے اظہار کا بھی ایک موقع ہے۔ شہرت اور ناموری سے کوسوں دور رہنے والے اور ادبی بھیڑ تماشے سے پناہ مانگنے والے آدمی کے قدموں میں آ کر عزّت اور نام وری لوٹ رہی ہے۔ یہ اب سب دیکھ رہے ہیں۔ اب سے تیس پینتیس برس پہلے ادبی کاوشوں کے ابتدائی دور میں ہمارے ذہن میں ظفر کمالی کی ابھرنے والی ادبی اور علمی شخصیت کے مستقبل کا جو نقشہ بنتا تیار ہوا تھا، اسے پیشین گوئی تو نہیں کہا جا سکتا مگر دل میں کہیں نہ کہیں یہ بات تھی کہ وہ کئی پہلوؤں سے بساطِ اردو ادب پر ایک نہ ایک دن نمایاں ہوں گے۔ ان کے مطالعے، ریاضت، انہماک اور ذہانت نے ہمارے زمانے میں ایک ایسا بُت قائم کر دیا ہے جس کی کوئی دوسری مثال آسانی سے نہیں مل سکتی۔‘‘ [ص ۵۱]

ظفر کمالی کی فنی جہات کے سلسلے میں صفدر امام قادری نے جو نظریات بالخصوص نثر کے حوالے سے پیش کیے ہیں وہ اس قدر مستحکم ہیں کہ عصبیت پسند ناقد ہی ان سے انکار کر سکتا ہے۔ مشہور فکشن نگار اور ناقد پروفیسر غضنفر علی نے دل لگی بات لکھی ہے۔ موصوف لکھتے ہیں:

> ’’اچانک صفدر امام قادری کا ایک جملہ میرے ذہن میں گونج اٹھا جو انھوں نے میرے اس سوال کہ اردو تنقید و تحقیق میں اس وقت سب سے اچھی نثر کون لکھ رہا ہے کے جواب میں برسوں پہلے دیا تھا کہ سب سے اچھی اور معیاری نثر ظفر کمالی لکھ رہے ہیں۔
>
> میری طرح صفدر کی رائے سے آپ کو بھی اتفاق کرنا پڑے گا کہ صفدر امام قادری ادب میں کسی کے ساتھ بھی دوستی یا دشمنی نہیں نبھاتے۔ نارنگ ہوں یا فاروقی یا ان کے محسن و مربی وہاب اشرفی وہ کسی کو نہیں بخشتے تو ایسا بے باک اور نڈر آدمی اس شخص کو بھلا کیسے بخش دیتا جو

اتفاق سے اس کا کمپیٹیٹر بھی رہا ہو۔ جب ایسا بے لاگ نقاد اپنے کمپیٹیٹر کی تعریف کرے تو اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ شخص کتنا زوردار اور کمال کا آدمی ہوگا۔'' [ص ۹۹۔۹۸]

'ظفر کمالی: شخصیت اور فنی جہتیں' دراصل بزم صدف انٹرنیشنل کی جانب سے ظفر کمالی کی خدمت میں نایاب تحفہ ہے۔ ظفر کمالی کی شخصیت اور خدمات کے اعتراف میں بزم صدف نے ۲۰ رنومبر ۲۰۲۲ء کو شان دار روپے سمینار کیا۔ پھر سال بھر کے اندر ہی سمینار کے مقالات کو ادبی دنیا میں پیش کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ بزم صدف انٹرنیشنل ایوارڈ سے بھی انھیں نواز کر بزمِ صدف نے ہماری خوشی دوبالا کر دی۔ کتاب میں چند مقالات پہلے کے بھی ہیں لیکن اُن کی اہمیت وافادیت مسلم ہے۔ کتاب کی ترتیب درج ذیل لحاظ سے کی گئی ہے۔ ابتدائیہ، کلیدی خطبہ، شخصیت، تحقیق، رباعی گوئی، ظرافت، نظموں کے تجزیے، ادب اطفال اور شعری تاثرات۔ ابتدائیہ میں جناب عامر سجانی کا خطبہ بھی شامل ہے جسے سمینار کے افتتاح کے موقع پر دیا گیا تھا۔ اس خطبے سے جہاں ظفر کمالی کی شخصیت پر روشنی پڑتی ہے، وہیں عامر سجانی کے ذوق مطالعہ کا ثبوت فراہم ہوجاتا ہے۔ وقت کی کمی کی شکایت اور مصروفیات کا عذر کرنے والے افراد کے لیے عامر سجانی کا خطبہ عبرت کا درس دے رہا ہے۔ علاوہ ازیں ظفر کمالی نے جو خطبہ سمینار میں دیا تھا اس کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ ابتدائیہ میں صفدر امام قادری کا ایک مضمون بھی شامل ہے۔ یہ مضمون ظفر کمالی کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ کے اعلان کے فوراً بعد لکھا گیا ہے۔ اس میں ظفر کمالی کی چالیس سالہ خدمات کا اجمالی خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ اس مضمون میں ایک جگہ ہماری نظر رک گئی ''جو مشہور لوگ ہیں، ان کے پاس خدا کے فضل سے خانہ علم خالی ہے۔'' کسی شخص کے عیوب کے لیے فضل خدا کو سبب قرار دینا درست نہیں اس طرح کا جملہ لکھنے سے احتراز ضروری ہے۔ کلیدی خطبہ 'ظفر کمالی کا تخلیقی جہاں' امتیاز وحید نے لکھا ہے جس میں انھوں نے ظفر کمالی کی شخصیت اور فن پر اچھی خاصی محنت کی اور ان کی جملہ خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ پتا نہیں کیوں ان کی مذہبی شاعری اور غزل گوئی کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا ہے۔ بہرکیف کلیدی خطبہ کے بعد شخصیت کے متعلق گیارہ مضامین شامل ہیں۔ ان میں ظفر کمالی کی خودنوشت 'آمد نامہ' کے عنوان سے ہے جس میں ظفر کمالی نے اپنے اور خاندان کے متعلق تفصیل سے اطلاعات دی ہیں۔ تعلیم و تربیت کے علاوہ اپنے مزاج کی رواداری کو پیش کیا ہے۔ اپنی خودنوشت میں بتایا ہے کہ اُن کے دادا خواجہ سرائے چھپرا سے ہجرت کر کے رانی پور سیوان بسے۔ یہ جملہ پڑھنے کے بعد مرتب صفدر امام قادری اور ظفر کمالی کی رفاقت کا ایک راز اور کھل گیا کہ صفدر امام قادری کے اجداد بھی کریم چک چھپرا سے ہجرت کر کے بتیا تشریف لے گئے۔ گویا کہ دونوں بزرگوں کی دوستی کا ایک سبب ہم وطنی بھی ہوسکتی ہے۔ ظفر کمالی نے خودنوشت میں مذہبی لحاظ سے روادار ہونے کا دعویٰ کیا اور ان کے اس

دعوے پر دو چار شخصیات نے آمنا وصدقنا بھی کہا ہے۔ معمولات عمل کے لحاظ سے درست ہے لیکن فکری اعتبار سے اس میں پوری صداقت نہیں ہے۔ پہلے ظفر کمالی کا دعویٰ ملاحظہ کریں:

''ہمارے یہاں بیشتر علما کا المیہ یہ ہے کہ ایک طرف وہ اتحادِ بین المسلمین کا نعرہ لگاتے ہیں دوسری جانب مسلکی اختلاف کو ہوا بھی دیتے ہیں اور وہ مسائل جو خواص کے درمیان رہنے چاہییے انھیں عوام کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ میرے خیال میں علمائے کرام کو اپنے اپنے مسلک پر عمل پیرا ہوتے ہوئے دوسرے فرقوں کے ساتھ ایک نقطۂ اتّصال تلاش کرنا ہی ہوگا۔ میں خود کو نہ دیو بندی سمجھتا ہوں اور نہ بریلوی بلکہ اپنے کو صرف حنفی کہتا ہوں اور اختلافی اور فروعی موضوعات پر خموشی کو ترجیح دیتا ہوں۔ مذہبی مباحثے کے معاملے میں اکبرالہ آبادی کے اس شعر پر عمل کرتا ہوں:

مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں
فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں۔''

[ص ۹۴۔۹۳]

پیش نظر اقتباس میں مسلکی اختلاف کا پورا پورا ذمہ دار علما کو قرار دینا میرے خیال میں درست نہیں لگتا اس لیے کہ میرا محتاط نظریہ ہی نہیں بلکہ تجربہ ہے کہ مسلکی شدت جس قدر ادبا و شعرا کے اندر ہے وہ علما کے اندر نہیں۔ یہ دیگر بات ہے معاشی لحاظ سے کمزور طبقہ کا عیب سب کو ہی نظر آتا ہے۔ جہاں تک ظفر کمالی کے مسلکی نظریہ کی بات ہے تو میرے خیال سے ان کے اندر شدت پسندی تو نہیں لیکن دیو بندی مسلک سے متاثر ہی نہیں مرعوب پایا کیوں کہ ان کی پوری شاعری میں پیر و مرید کی اصلاح کی کوشش تو بہ طور طنز نظر آتی ہے البتہ تبلیغی جماعت سے وابستہ افراد کی نہیں۔ اسی طرح پروفیسر ناز قادری مرحوم کا نعتیہ مجموعہ 'سلسبیل نور' پر اظہار خیال کرتے ہوئے ظفر کمالی نے واضح کر دیا ہے کہ ان کا مسلکی نظریہ کیا ہے؟ کیوں کہ نعت کے جن اشعار میں پروفیسر ناز قادری مرحوم نے توحید کا نظریہ پیش کیا ہے، ان اشعار میں ظفر کمالی کو شرک کی بو نظر آتی ہے۔ یہاں مثال دینے کی قطعی گنجائش نہیں ہے۔ مجموعی طور پر ظفر کمالی صاحب کی خودنوشت قابل مطالعہ اور محققین کے لیے بنیادی ماخذ ہے۔ خودنوشت کے بعد غضنفر کا لکھا خاکہ جس کا عنوان 'مرکزی افق پر حاشیائی شفق کی شعاعیں' ہے۔ اس خاکے میں غضنفر صاحب نے ظفر کمالی کی شخصیت کے بارے میں ایک ایک بات صحیح لکھی ہے۔ ظفر کمالی کی مہمان نوازی کی جن خوبیوں کا ذکر فرمایا ہے، اس کا گواہ راقم الحروف بھی ہے۔ قطب الدین اشرف کا مضمون 'میں تم کو کیسے بھول جاؤں؟' بہت مزے دار ہے۔ اس مضمون میں ظفر کمالی

کے شب و روز کا خاکہ سامنے آ جا رہا ہے۔عہد حاضر میں ظفر کمالی جیسا دوستی نبھانے والا کم نظر آتا ہے۔ دوستوں کے احسانات کا اعتراف کرنے والا قطب الدین اشرف جیسا اردو دنیا میں خال خال نظر آتا ہے۔ ظفر کمالی کی گم نامی اور گوشہ گیری مشہور ہے لیکن ظفر کمالی گدری کے لعل کیسے ہیں اور ان کی پہچان کہاں تک ہے اس کا حال خورشید احمد خاں نے اپنے مضمون میں پیش کر دیا ہے۔موصوف لکھتے ہیں:

”کمالی صاحب یوں تو گمنامی کی زندگی گزارتے ہیں مگر اس گمنامی کے گوشے سے گوہر تلاش کرنے والے تلاش کر ہی لیتے ہیں۔ایک وقت کی بات ہے جب کاظمی صاحب سارن کمشنری کے D.I.G تھے جن کے ماتحت تینوں ضلعوں چھپرہ،سیوان اور گوپال گنج کے S.P ہوا کرتے تھے اور وہ (کاظمی صاحب) اردو ادب کے شیدائی اور اہلِ علم کے قدرداں تھے لہٰذا وہ کمالی صاحب سے گوپال گنج اور سیوان میں ہمیشہ محبت سے ملتے رہے۔ایک مرتبہ کمالی صاحب نے بڑی ہی دھیمی آواز میں کہا کہ دیکھیے اردو ادب کہاں کہاں کس کس سے ملاقات کراتا ہے۔“[ص ۱۳۰]

معصوم عزیز کاظمی اور ظفر کمالی کے تعلقات کا پتا مذکورہ بالا اقتباس سے ہو رہا ہے۔دونوں کی ایک ملاقات کی روداد نادر رضوی نے ڈرامائی انداز میں پیش کیا ہے۔راقم مولانا سراج نادر رضوی کی شاعری کا قائل تھا لیکن کتاب میں شامل مضمون ’ڈاکٹر ظفر کمالی:ایک مخلص انسان‘ پڑھ کر نادر رضوی کی نثر نگاری کا بھی قائل ہو گیا۔زیادہ تر شخصیات کا حال یہ ہوتا ہے کہ احباب اور معتقدین و تلامذہ کے مابین عظیم ہوتے ہیں لیکن گھر اور گاؤں میں کچھ وقعت نہیں ہوتی۔اس سلسلے سے ظفر کمالی مستثنیٰ ہیں۔اس بات کی گواہی جاوید اقبال کے مضمون سے مل جا رہی ہے کہ ظفر کمالی کی شخصیت ہر جگہ مسلم ہے۔جاوید اقبال نے اپنے بھائی کے سلسلے میں جس حقیقت کا مظاہرہ کیا ہے وہ بہت خوب ہے۔علم الانساب کے حوالے سے معلومات ہوں یا بھائیوں کی تعلیم و تربیت کا خیال یہ سب باتیں اب کہاں دیکھنے کو ملتی ہیں؟ جاوید اقبال نے ظفر کمالی کے سلسلے میں ایک ایسی اطلاع دی ہے جو عموماً احباب کے ذریعے ملتی ہے جیسا کہ جاوید اقبال رقم طراز ہیں:

”انھیں مشہور فلموں کو دیکھنے کا بھی شوق تھا۔مجھے یاد ہے کہ بھائی جان نوعمر اداکاروں میں عامر خان کو بہت پسند کیا کرتے تھے اور ۱۹۹۲ء میں رانی پور میں ہم لوگ اپنے نئے گھر میں منتقل ہوئے تو اس وقت ان کے بڑے بیٹے اور میرے بھتیجے احمد نوید کی ولادت ہونے والی تھی۔اس وقت انھوں نے اپنے کمرے میں عامر خان کی ایک تصویر بھی لگائی تھی۔پتا نہیں یہ ان کی ذاتی پسند کا معاملہ تھا یا بھابھی جان کی فرمائش تھی۔بڑوں سے سنا ہے کہ ایّام حمل

کے دوران کسی خوب صورت تصویر کو غور سے دیکھا جائے تو ہونے والا بچّہ بھی خوب صورت ہوتا ہے۔مجھ سے بڑے بھائی جناب اختر جمال عرف بادل نے ۱۹۸۶ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا اور گھومنے (دنیا دیکھنے) کی غرض سے پٹنہ گئے تو بھائی جان نے انھیں پٹنہ کی خوب سیر کرائی۔بادل بھائی بچپن سے فلموں کے بڑے شوقین رہے۔وہ بتاتے ہیں کہ چھوٹے بھائی جان پٹنہ کی سیر کراتے ہوئے انھیں گاندھی میدان لے گئے اور وہاں کے تین مشہور سنیما ہال کو دکھایا۔بادل بھائی فلم ’محبت‘ دیکھنا چاہتے تھے مگر ہمت نہیں کر سکے اور چھوٹے بھائی جان کے ساتھ پوسٹر دیکھ کر ہی انھیں مایوس واپس ہونا پڑا۔“[ص ۱۴۱]

پیش نظر اقتباس کو مذہب کے ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے دیکھا جائے تو یہ بات ضرور کھٹکی کہ ”بڑوں سے سنا ہے کہ ایام حمل کے دوران کسی خوب صورت تصویر کو غور سے دیکھا جائے تو ہونے والا بچہ بھی خوب صورت ہوتا ہے۔“ یہ بات قطعی درست نہیں ہے کیوں کہ تصویر کو بار بار دیکھنا بھی درست نہیں ہے اور حدیث کی روشنی میں برکت کے ختم ہونے کا سبب ہے۔ہاں اگر صاحب جمال بزرگ کی زیارت کی جائے تو اس بزرگ کی زیارت کی برکت سے ہونے والا بچہ صاحب جمال ہو سکتا ہے۔رہی فلمی ذوق کی باتیں تو اس پر تبصرہ عہد حاضر کا تقاضا نہیں لیکن ظفر کمالی جیسی مذہبی شخصیت کے لیے قابلِ غور تو ضرور ہے۔

امتیاز سرمد اور انوار الحسن کے مضمون میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ ظفر کمالی اپنے طلبہ پر بے پناہ شفقت فرماتے ہیں اور والد معنوی کا حق ادا کرنے میں بھی بے مثال ہیں۔ظفر کمالی کے سلسلے میں ان کے احباب یہاں تک کہ ان کے برادر عزیز جاوید اقبال کا بھی ماننا ہے کہ ظفر کمالی کو سیر و سیاحت سے خاص دلچسپی نہیں ہے لیکن تسلیم عارف نے اپنے مضمون ظفر کمالی کے ساتھ اپنے سفر کی روداد کو اس طرح سے پیش کیا ہے کہ ظفر کمالی کی ایک دوسری شخصیت سامنے آ جاتی ہے۔تسلیم عارف نے یہ بھی بتایا کہ ظفر کمالی نے سفر میں بھی اپنی ظرافت نگاری کا جلوہ اس طرح بکھیرا کہ سفر کی صعوبتوں کا اندازہ بھی نہیں ہوا۔تسلیم عارف کا مضمون پڑھ کر داد و تحسین کے الفاظ زبان سے نکلتے ہیں۔شخصیت کے باب میں شگفتہ ناز نے ظفر کمالی کی خودنوشت کا بہترین تجزیہ کیا ہے جب کہ اظہار خضر کا تاثراتی مضمون بھی قابل مطالعہ ہے۔

تحقیق کے باب میں آٹھ مضامین شامل ہیں جن میں صفدر امام قادری کا دو مضمون شامل ہے۔ اُنھوں نے ظفر کمالی کی دونوں تحقیقی کتابیں ’متعلقات احمد جمال پاشا‘ اور ’تحقیقی تبصرے‘ کا بھرپور تجزیہ اور تنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے۔پہلا مضمون پچیس صفحات پر مشتمل ہے جب کہ دوسرا تیس صفحات کا احاطہ کرتا ہے۔طوالت کے باوجود دونوں مضامین علمی و فکری فیضان سے مالا مال ہیں۔’متعلقات احمد جمال پاشا‘ کا

اسلوبیاتی منظرنامہ علی رفاد فتیحی نے پیش کیا ہے۔ یہ مضمون بہت عمدہ ہے۔ یوسف ناظم کا مضمون بھی موضوع سے انصاف کررہا ہے۔مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی، محمد ذاکر حسین اور افشاں بانو کے مضامین ظفر کمالی کی کتاب تحقیقی تبصرے کے جائزہ پر مشتمل ہیں۔ ہر ایک مضمون قابل مطالعہ ہے۔تحقیق کے باب میں راقم الحروف کا مضمون تحقیقی تبصرے کے حوالے سے شامل ہے۔ راقم اس کے لیے مرتب کا خصوصی شکریہ ادا کرتا ہے کہ بزرگوں اور ناقدین میں شامل کرلیا ہے۔

ظفر کمالی کی رباعی گوئی کے حوالے سے بھی آٹھ مضامین ہیں۔ قاسم فریدی، نوشاد احمد کریمی اور صفدر امام قادری نے 'رباعیاتِ ظفر' کے حوالے سے اپنے اپنے نظریات پیش کیے ہیں۔ 'خاکِ جستجو' کا تجزیہ ظفر امام قادری نے پیش کیا ہے۔ظفر کمالی کی رباعی گوئی کا اجمالی مطالعہ جہاں گیر انس نے پیش کیا ہے۔ سوغات اور شخصی رباعی کے سلسلے میں شگفتہ ناز، ظفر امام اور محمد ذاکر حسین کے مقالے ہیں۔ جملہ مقالوں سے ظفر کمالی کی رباعیات کے اختصاصات و امتیازات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوجارہے ہیں۔

ناقدین کا مجموعی تاثر یہ ہے کہ ظفر کمالی کی خدمات میں سب سے اہم ظرافت نگاری ہے اسی سبب ظرافت نگاری کے باب میں گیارہ مضامین ہیں۔ اس باب کی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں عالمِ دین، صحافی، شاعر، محقق اور ناقد سبھی شعبہ جات سے تعلق رکھنے والی شخصیات کے مضامین شامل ہیں۔ نیز مرحومین، بزرگ اور نئی نسل کے قلم کاروں کی شمولیت اس باب کی اہمیت و افادیت کو دوبالا کررہی ہے۔مزے کی بات یہ ہے کہ یہاں بھی مرتب کا مضمون سب سے زیادہ طویل ہے۔طوالت کے باوجود یہ مضمون دلچسپ ہے۔ظفر کمالی کی ظرافت نگاری کی انفرادیت کو متعدد حوالوں سے مزین کرتے ہوئے مرتب نے ایک سے ایک نکتہ واضح کیا ہے، مرتب نے حسبِ معمول دوٹوک نظریہ پیش کیا ہے۔ایک مقام پر صفدر امام قادری رقم طراز ہیں:

''ظفر کمالی کثیر الجہات مصنف ہیں اور تنقید و تحقیق اور رباعی گوئی کے ساتھ ظرافت کے میدان میں بھی مستقلاً تصنیفات پیش کرتے آرہے ہیں۔بعض نقّادوں نے ظفر کمالی کی مجموعی خدمات کا احاطہ کرتے ہوئے اُن کی بنیادی حیثیت کے فیصلے کے مرحلے میں ظرافت ہی کو اوّلیت دی ہے۔ظرافت سے اُن کا واسطہ مختلف فیہ ہے۔ اُنھوں نے خاکے بھی لکھے، ظرافت کے حوالے سے اچھی خاصی مقدار میں اُن کی تنقیدی و تحقیقی تحریریں بھی منظرِ عام پر آئیں مگر جس چیز نے اُنھیں طنز و ظرافت کے مرکزی منبر پر پُروقار انداز سے متمکن کیا، وہ اُن کی ظریفانہ شاعری کے سوا کوئی دوسری شے نہیں۔'' (ص ۳۹۸)

صفدر امام قادری کے علاوہ سید شاہ ہلال احمد قادری (ظفر کمالی کی ظرافت: چند اشارے)، منظر

اعجاز (ظفر کمالی کا کمال 'ظرافت نامہ')، مشتاق احمد نوری (ظفر کمالی کا ظرافتی کمال)، ریحان غنی (ظفر کمالی اور ان کی ظرافتی شاعری)، عطا عابدی (ظفر کمالی کی ظرافت نگاری: چند پہلو)، ہمایوں اشرف (ظرافت نامہ ایک مختصر جائزہ)، عبدالوہاب قاسمی (ظفر کمالی کی ظرافت: اختصاصی پہلو)، محمد عارف اقبال (طنز و مزاح کا باکمال شاعر)، محمد شوکت علی (ظفر کمالی کی چند اہم نظمیں) اور شاذیہ حسن (ظفر کمالی کی ظرافت کے چند پہلو) جیسے باوقار حضرات کے مضامین کی شمولیت اس بات کی غمازی ہے کہ ظفر کمالی کی ظرافت کا کمال ہر ایک شعبہ سے وابستہ حضرات کے نزدیک مسلم ہے۔عناوین میں الفاظ کی یکسانیت یہاں ضرور نظر آرہی ہے البتہ مکررات کے عیوب سے یہ باب ہی نہیں پوری کتاب پاک وصاف ہے۔

نظموں کے تجزیہ کے تحت چار نظموں کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ ناہید پروین نے ظفر کمالی کی نظم 'آدھار کارڈ' کا بہترین جائزہ لیا ہے۔فرحت صغیر نے 'خوشامد' کا تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے۔محمد شہزاد نے ظفر کمالی کی نظم 'تانیثیت کی حمایت میں' اور محمد ابورافع نے نظم 'عرب کی کمائی' کا بہترین تجزیہ پیش کیا ہے۔اس باب کے جملہ قلم کار کا تعلق نو وارد قلم کاروں سے ہے۔اس باب کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اگر نئی نسل کی تربیت مناسب ہوجائے تو اردو کا رونا رونے والے افراد کی زبان بند ہوجائے گی۔'ادبِ اطفال' کے تحت تین مقالے موجود ہیں، ان میں پہلا منی بھوشن کمار کا ہے۔ انھوں نے ادبِ اطفال کے حوالے سے ظفر کمالی کی تینوں کتابیں 'بچوں کا باغ'، 'چہکاریں' اور 'حوصلوں کی اڑان' کا تجزیہ عالمانہ و فاضلانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ نازیہ تبسم نے ظفر کمالی کی کتاب 'بچوں کا باغ' کو ادبِ اطفال کی ایک اہم اور معیاری کتاب تسلیم کیا ہے۔'حوصلوں کی اڑان' ظفر کمالی کی وہ کتاب ہے جس پر اُنھیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ برائے ادبِ اطفال تفویض ہوا ہے۔اس کتاب پر غالباً پہلا تبصرہ محمد مرجان علی نے کیا تھا۔محمد مرجان علی کا تبصرہ مکمل ہونے کے بعد ہی متذکرہ ایوارڈ کا اعلان ہوا تھا۔اسی تبصرے کو حذف و اضافہ کے ساتھ یہاں پیش کیا گیا ہے۔ یہ تبصرہ جامع اور بھرپور ہے۔اس تبصرہ کا ایک اقتباس حاضر کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے تاکہ مبصر کی تبصرہ نگاری کے فن کی مشاقی کا اندازہ ہوسکے۔موصوف لکھتے ہیں:

''حوصلوں کی اُڑان' کے اندر ذہن و فکر کے سلسلے سے ایک مکمّل دنیا آباد ہے۔بڑوں کی شاعری کے لیے جو عام طور سے لفظی اور ذہنی تیاری کی جاتی ہے، وہی خیال اُنھوں نے بچوں کی نظم کے لیے بھی استعمال کیا ہے تاکہ بچوں کے ذہن و فکر میں ترقی ہو۔جہاں یہ مجموعہ بچوں کے لیے تفریحی نظمیہ مواد فراہم کرتا ہے، وہیں اس میں ایک جہانِ معنی بھی پوشیدہ ہے جو بچوں کی ذہنی فکر اور توانائی کا موثر ذریعہ ثابت ہوتا ہے۔کتاب کے سرنامے میں ہی ایک معنی

پوشیدہ ہے جوایک فلسفہ اورمُثبت سوچ کوظاہر کرتا ہے اور ہمارے حوصلے اورفکری بلندی کی باتیں کرتا ہے، جو یہ بھی بتاتا ہے کہ اڑان پنکھوں سے نہیں بلکہ حوصلوں سے ہوتی ہے۔اسی لیے یہ سرنامہ ہی بچوں کے دل میں جوش پیدا کرنے کے لیے کافی ہے۔‘‘[ص۵۰۹]

شعری تاثرات میں افضل ٹھمبوی مرحوم، زاہد سیوانی، التفات امجدی،شکیل سہسرامی، گلفام صدیقی اور امان ذخیروی نے متعدد اصناف شاعری کے توسط سے ظفر کمالی کی شخصیت اور خدمات کا اعتراف کیا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ’ظفر کمالی: شخصیت اورفنی جہتیں‘ایک مثالی کتاب ہے۔اس کے باوجود ایک لحاظ سے تشنگی کا احساس ہوتا ہے کہ ظفر کمالی کی غزل گوئی پر تفصیلی مطالعہ تو دور ایک مختصر مضمون بھی شامل نہیں ہے۔اسی طرح ظفر کمالی کی مذہبی شاعری پر ایک دو مضمون کی کمی کا احساس ہو رہا ہے۔ان کی پہلی کتاب ’مکاتیب ریاضیہ‘ کا صحیح تعارف بھی سامنے نہیں آسکا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ مرتب کتاب نے کمی کے لیے معذرت کر لی ہے اور یہ بھروسہ دلایا ہے کہ ظفر کمالی پر دوسری کتاب آنے والی ہے۔امید ہے کہ اس کتاب میں یہ خامیاں دور ہو سکیں۔ اس طرح کی مثالی کتاب کی اشاعت کے لیے راقم الحروف ڈاکٹر ظفر کمالی اور پروفیسر صفدر امام قادری کو صمیم قلب سے مبارک باد پیش کرتا ہے اور نیک خواہشات بھی۔(کتاب کا نام: ’ظفر کمالی: شخصیت اور فنّی جہتیں، مرتب: صفدر امام قادری، صفحات:۵۲۸،سالِ اشاعت: ۲۰۲۳ء، قیمت:۶۵۰، ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی)

☆☆☆

ساجدؔ جلال پوری
محلہ جعفر آباد، جلال پور، امبیڈکر نگر، یوپی۔رابطہ نمبر:7571867185

نقش ھائے رنگ رنگ

حمدِ باری تعالیٰ در صنعت منشاری

خدا ہی رہے گا ہمیشہ ہمیشہ   چلا کس کا سکّہ ہمیشہ ہمیشہ
شہنشاہ آئے گئے کیسے کیسے   نہ شہرت نہ نشّہ ہمیشہ ہمیشہ
یہ سب عیش و عشرت، یہ ہستی یہ مستی   چلے گا نہ پیسہ ہمیشہ ہمیشہ
شکستہ شکستہ یہ بستی کی خشتیں   یہ پستی کا نقش ہمیشہ ہمیشہ
یہ سب سرد و شیریں یہ چشمے سمندر   اسی کا کرشمہ ہمیشہ ہمیشہ
شمار اپنی انگشت سے ساری بارش   ہے کرتا فرشتہ ہمیشہ ہمیشہ
بسیط و کشادہ ہے سنسار اس کا   وہ باسط بساتا ہمیشہ ہمیشہ
وہ ہے اسمع السامعین ابتدا سے   وہ سب کی ہے سنتا ہمیشہ ہمیشہ
یہ سچے رسولوں کے سب سلسلے ہیں   یہ نبیوں کا شجرہ ہمیشہ ہمیشہ
یہ شیشم یہ زیتون، شہتوت، پیپل   شجر سب اگاتا ہمیشہ ہمیشہ
یہ نیزے، سناں، تیر، شمشیر کب تک   نہ شیشہ نہ تیشہ ہمیشہ ہمیشہ
خدا کی خشیت سے سینے بسے ہوں   تو جنّت کا رستہ ہمیشہ ہمیشہ
یہ منشاری صنعت کا دندانہ گوشہ   سمیٹے گا شوشہ ہمیشہ ہمیشہ
یہ ساجدؔ کے اشعار حمد و ثنا ہیں   یہ محشر کا بستہ ہمیشہ ہمیشہ

☆☆☆

نوٹ:

اس حمد کے زیادہ تر الفاظ وحروف دندانے یا آری کی شکل میں لکھے گئے ہیں۔

نسیم بانو تمنا

بلاعنوان (افسانہ)

زبیر ہوٹل کے کمرے میں بیٹھا سگریٹ نوشی کر رہا تھا۔ کتاب ماضی کے اوراق اس کی نظروں کے سامنے پھڑ پھڑا رہے تھے اور وہ مستقبل کے اوراق میں جھانکنے کی بھی کوشش کر رہا تھا۔ مگر اس کے لیے شاید یہ بہت مشکل کام تھا۔ وقت تو اپنے اصولوں کا پابند ہوتا ہے خوشیوں کے سنگیت بجیں یا ماتمی ساز، اس کا کام صرف تیز گامی سے آگے قدم بڑھ کر گزر جانا ہے۔

زبیر کو ہوٹل میں قیام کیے ایک مہینہ گزر چکا تھا۔ جیب میں ایک ہزار روپے کے نوٹ باہر نکلنے کو کھڑ کھڑا رہے تھے۔ ان روپیوں سے آخر کب تک گزر بسر ہو سکتی ہے۔ وہ ملازمت کے لیے بھی جان توڑ کوشش کر چکا تھا مگر ہر شخص اس کے کرتوتوں سے واقف ہو چکا تھا۔ اس لیے ملازمت نہ مل سکی۔ اب کوئی دوست اور یار بھی اسے منھ نہ لگاتا تھا۔ اگر کبھی کسی دوست یا کسی رشتہ دار کا سامنا ہو جاتا تو وہ اس سے کترا کر نکل جاتا۔ کس قدر سنگ دل ہیں یہ انسان، سہارا دینا تو درکنار پیا و محبت کے دو بول بھی نہیں دے سکتے۔ اس کا دل سسک اٹھتا۔ اس کی روح تڑپ جاتی، مگر وہ بے بسی سے صرف آہ بھر کر رہ جاتا۔

زبیر کو زبردست ٹھوکر لگی اور وہ گر گیا اور پھر اٹھ کر وہ اپنے راستے پر چلنا چاہتا تھا مگر راہ گیر اسے اپنے ساتھ چلنے نہیں دیتے تھے۔ کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ انسان گر کر اٹھا نہیں کرتا۔ بس گہرائیوں میں کھو جاتا ہے۔ پستیوں میں ڈوب جاتا ہے اور وہ ابھر کر زمانہ میں عزت سے جی نہیں سکتا۔ زبیر کے دل کو زمانے نے کچوکے لگانے شروع کیے۔ اس کا دل زخمی ہو گیا۔

اس کے زخمی دل پر کوئی بھی مرہم رکھنے والا نہ تھا۔ کاش! یہ بے رحم و سنگ دل راہ گیر اسے اٹھا کر ہمت دلاتے اور زندگی کی اس کٹھن راہ پر دوبارہ چلنے کے لیے سہارا دیتے۔ زبیر کے تمام دنیوی سہارے ٹوٹ چکے تھے۔ صرف خدا کا سہارا تھا۔ مگر جن عظیم ہستیوں کی خاطر وہ جینا چاہتا تھا وہ بہت دور جا چکی تھیں۔ شاید اس کی زندگی اس سے ناراض ہو رہی تھی۔

نہ جانے اس بدکردار نزہت نے اس کی آنکھوں پر کیسی پٹی باندھ دی تھی۔ اُف! وہ کتنے بڑے فریب میں پھنس گیا تھا۔ زبیر نے جب اس بے وفا نزہت کا ہاتھ تھاما تو خود ہی اپنی نمود کھو بیٹھا۔ نزہت کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے وہ تمام مقدس رشتوں کو ٹھکرا چکا تھا۔ نزہت نے جب اس سے اپنا دامن چھڑا لیا تو زبیر کو اپنے تہی دست و تہی دامن ہونے کا خیال آیا۔ اس کی تمام دولت کو ہڑپ کر کے نزہت نے اسے کہیں کا نہ رکھا۔ وہ اپنے عزیزوں سے ملنے کے لیے بے چین تھا۔ مگر اپنوں کے سایہ عاطفت سے خود دور نکل چکا تھا۔ شرمندگی کے احساس نے ایک قدم بھی آگے بڑھنے نہ دیا۔ وہ اپنے والدین، بھائی، بہن، کے سامنے کیا صورت لے کر جائے۔

وہ سگریٹ پر سگریٹ پھونکے جا رہا تھا۔ چہرے پر غم کی چھاپ خاصی گہری نظر آ رہی تھی۔ وہ سگریٹ پھینک کر اچانک کھڑا ہو گیا اور تیزی سے قدم بڑھاتا ہوا ہوٹل سے باہر نکل گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کدھر جا رہا ہے۔ بس چلا جا رہا تھا۔ کئی گلیاں کئی بلڈنگیں گزر جانے کے بعد بھی وہ چلتا رہا۔ پھر ایک بلڈنگ میں وہ گھس گیا۔ ڈائنگ روم سے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ دیوانہ وار اندر چلا گیا۔

زبیر!!!

میرا بیٹا! میرا چاند!!

بھیا!!!

ماں، باپ، بہن، بھائی سب ایک ساتھ چلا اٹھے۔ وہ اپنی ماں سے لپٹ گیا اور چھوٹے بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔ بہن قریب آ کر اپنے دوپٹہ سے اس کی آنکھیں پوچھنے لگی۔

''مت روؤ بھیا!''

باپ، ماں، بھائی، بہن کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تیر رہے تھے۔ اس نے آنسو بہاتے ہوئے اپنے بے مثال و لازوال والدین کی جانب دیکھا پھر بھائی بہن کی جانب نظریں دوڑائیں جن کے ہونٹ مسکرا رہے تھے اور آنکھیں جھلمل کر رہی تھیں۔ ان مقدس رشتوں کی عظمت کو دیکھ کر اس نے تعظیماً اپنا سر جھکا لیا۔

☆☆☆

ڈاکٹرغضنفراقبال
سائبان، زبیر کالونی، رِنگ روڈ، گلبرگہ۔رابطہ نمبر:9945015964

ڈاکٹر رؤف خیر سے عالم شر میں مصاحبہ

متکلم: ڈاکٹرغضنفراقبال (گلبرگہ)

ڈاکٹر رؤف خیر (۱۹۴۸ء) جدت پسند شاعر اور ہنر مند نثر نگار ہیں۔اصنافِ شاعری میں انھوں نے نئے تجربے کیے جس سے اُن کی انفرادیت قائم ہوئی۔زبان وبیان سے بے جا کھلواڑ سے بچتے ہوئے روزمرہ کی زبان میں دل میں اُتر جانے والے شعر کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں۔ان کی نثر لطیف قسم کی کاٹ سے عبارت ہے۔طنز کے سبب قاری کو فوراً اپیل کرتی ہے۔رؤف خیر کے ہاں غزل میں فطری اور سچا اظہار ہوتا ہے۔یہی بات اُن کی تخلیقی جہت کی کامیابی ہے۔

غضنفراقبال: غزل کی تعریف کیا ہوگی؟

رؤف خیر: زندگی سے وابستہ ہر پہلو کو غزل کے اُصول وضوابط کا لحاظ رکھتے ہوئے فنی رچاؤ کے ساتھ بیان کرنے کا نام غزل ہے۔اب غزل محض محبوب سے یا محبوب کی باتیں کرنے سے عبارت نہیں رہ گئی۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ بھی غزل کا ایک ناگزیر پہلو ہے۔میں فنی رچاؤ پر زور دیتا ہوں۔انگریزی Funny نہیں۔ورنہ تجرباتی قسم کی 'شب خونی' شاعری تو ادبی خونی بواسیر کی طرح ٹپکنے لگتی ہے، جو ادب کے نام پر دھبّا ہے۔قطرۂ منی ٹپکانے کے فطری تقاضے کو حسین پیرائے میں فانی بدایونی نے انتہائی سلیقے سے فنی رچاؤ کے ساتھ بیان کیا ہے۔

گرا کے قطرۂ شبنم گلوں کے دامن پر
تجلیات کے دریا بہا دیئے ہم نے

غضنفراقبال: آپ کن شعرا سے متاثر ہیں؟

رؤف خیر: میر، غالب اور اقبال نے اپنے فکروفن پر خاص طور پر توجہ دی تو شاہ کار تخلیقات ادب کو دیں۔میر کا اژدرنامہ، غالب کی چکنی ڈلی یا اقبال کی نظم ''۔۔۔کی گود میں بلی دیکھ کر'' تفنن طبع کے طور پر کہی ہوئی تخلیقات ہیں۔میں میر وغالب واقبال کا قدرداں ہوں۔متاثر ہونے والا ان کا رنگ اختیار کرنے کی کوشش میں 'وہ جو شاعری کا سبب ہوا' جیسا شاعر ہو کر رہ جاتا ہے جس کی شاعری میں خواہ مخواہ میر سے مماثلت تلاش کرنے والے سعی ناکام کرتے ہیں۔کہاں خدائے سخن اور کہاں بندۂ عاجز۔غالب سے متاثر ہونے والے یاس یگانہ پر اتنے منفی اثرات مرتب ہوئے کہ وہ غالب شکن ہی ہو گئے۔علامہ اقبال کی پیروی میں کچھ پُرجوش سیمابی ہستیاں اپنے طور پر ادب کے سدرۃ المنتہٰی تک پہنچ گئیں کچھ ہستیاں شاعر آخرالزماں کہلانے لگیں۔حاصل سوائے لاحاصلی کے کچھ نہ ہوا۔اس لیے عربی کہاوت ہے: ''خُذما صَفا وَ دَع مَا کَدر (اچھی چیز لے لے اور بری چھوڑ دے) اس میں اپنی بھی عزت ہے۔بل میں بل اپنا بل۔اس لیے میں میر وغالب واقبال کے علاوہ یگانہ چنگیزی، خورشید احمد جامی، پروین شاکر کو پسند کرتا ہوں مگر متاثر نہیں ہوں۔

غضنفراقبال: کیا شاعری زندگی کی ترجمان ہے؟

رؤف خیر: یقیناً ترجمان ہے ورنہ شاعری کا جواز ہی کیا رہ جاتا ہے، اور یہ شاعری خود اپنی زندگی، اپنے عزیز واقارب، اپنے سماج کی زندگی کی ترجمان ہونی چاہیے۔جن سماجی وسیاسی حالات سے شاعر گزرتا ہے ان کا اظہار ہی تو ادب ہے۔اپنے طور پر جو کچھ وہ محسوس کرتا ہے اسے ایسی ادبی زبان دینا کہ گویا وہ ہر شخص کے جذبات کی ترجمانی لگے۔یہی تو کمال ہے۔بہ قول غالب ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

غضنفراقبال: جدید غزل کی پہچان کیا ہے؟

رؤف خیر: ہر دور کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں اور ہر دور کا اپنا محاورہ ہوتا ہے۔اپنے دور کے حالات ومشاہدات کو اپنے دور کے محاورے میں پیش کرنا ہی جدید غزل کی پہچان ہے۔مثلاً میرے شعر ہیں ؎

میں اپنا فون کبھی بند ہی نہیں رکھتا
نہ جانے کب اُسے توفیقِ گفتگو ہو جائے
سنا ہے آپ وہاں بھی قیام کرتے ہیں
جہاں کبھی کوئی نٹ ورک ہی نہیں لگتا

ہر دور کی اپنی لفظیات ہوتی ہیں جو اس دور کے قارئین وسامعین کی سمجھ میں بھی آتی ہیں۔اگر آپ

آج انیس و دبیر، غالب و اقبال کے لہجے میں بات کریں گے تو سننے والوں کے سروں پر سے گزر جائے گی۔ کلام کی شرح کرنی پڑے گی۔ اس لیے میں نے صاف صاف کہا ہے ۔

میں کسی مملکتِ شعر کا والی تو نہیں
میں نہ غالب سہی منت کشِ حالی تو نہیں

غالب کے شعر خود اس کے دور میں سمجھے نہ جاسکے تو ان کے شاگرد خواجہ الطاف حسین حالی کو بعض اشعار کی شرح کر کے سمجھانا پڑا کہ غالب کا مطلب کیا ہے۔ غالب کو غالب بنانے میں حالی کا ہاتھ ہے۔

غضنفر اقبال: نئی اصنافِ شعر کا مستقبل؟

رؤف خیر: ہر دور کے اپنے تقاضوں کے مطابق ادب مروجہ اصناف میں لکھا جاتا رہا ہے۔ کسی زمانے میں مثنویوں کا دور تھا تو 'قطب مشتری'، 'پھول بن'، 'سحر البیان'، 'گلزارِ نسیم'، 'زہرِ عشق'، 'اژدر نامہ' وغیرہ جیسی مثنویاں لکھی گئیں۔ مسدس کے فارم میں بے شمار مرثیے لکھے گئے۔ یہاں تک کہ خواجہ الطاف حسین حالی نے 'مدوجزرِ اسلام' اور اقبال نے 'شکوہ، جوابِ شکوہ' جیسے شاہ کار ادب کو دیئے۔ مسدس، مخمس، رباعیات وقطعات کے زمانے لد گئے، اب اگر کوئی ان اصناف میں سرگرداں ہے تو دراصل وہ یہ دکھانا چاہتا ہے کہ وہ روایت کی پاس داری کا بوتا بھی رکھتا ہے۔

اب شاعری چودہ مصرعوں کے سانیٹ، آٹھ مصرعوں کے ترائیلے، سے ہوتی ہوئی تین تین مصرعوں کی 'ثلاثی'، ماہیے، ہائیکو تک آ گئی ہے۔ ادب میں تجربات ہونے چاہئیں بشرطیکہ ان میں کچھ نئی بات بھی کہی جائے۔ دو دو مصرعوں کے دوہے کا بھی احیا کیا گیا مگر معاف کرنا دوہے کے تعلق سے میری دوٹوک رائے ہے کہ اُردو کو ہندیانے کی سازش ہے۔ اچھا بھلا مسلمان بھی دوہے کے حوالے سے رام رحیم، بھگوان رحمٰن کو شعوری یا غیر شعوری طور پر ایک سمجھنے لگتا ہے۔

اس مرحلے پر یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے ایک نئی صنفِ سخن 'یک مصرعی نظم' کی بنیاد ڈالی ہے۔ یعنی صرف ایک ہی مصرعے میں ایک نظم۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بیشتر شاعروں کے صرف ایک ایک ہی مصرعے ضرب المثل کی طرح عوام وخواص کی زبانوں پر ہوتے ہیں۔ میں نے ایک تجربہ کیا کہ صرف ایک ہی مصرعے میں ایک خیال کو نظم کا روپ دے دیا۔ جیسے:

سفارش: ہر سند سے بڑی سفارش ہے
ATM کا چوکیدار: بیٹھا ہوا ہے پیاسا کنویں کی منڈیر پر
سرکاری مسلمان: دفتر کی کنجیوں میں قلم رکھ کے آ گئے

بہتات: خوش بو کے اضافے سے بھی دم گھٹتا ہے
ہم سفر: مزہ سفر کا تو بس ہم سفر سے آتا ہے
مسلمان بیوی: نصف بہترین پتھر کے مثلث پر ٹکی ہے

ایسی بے شمار یک مصرعی نظمیں میرے شعری مجموعوں میں بھری پڑی ہیں۔ رسائل و جرائد میں یہ شائع ہوتی رہی ہیں۔ اس صنف کا میں ہی موجد اور میں ہی خاتم ہوں۔ افسوس اس بات کا ہوتا ہے کہ ادبی حلقوں میں اس کی ویسی پذیرائی نہیں ہوئی جیسی کہ ہونی چاہیے۔ اصل میں ہمارے ادب میں تنگ نظری اور علاقائی عصبیت بہت ہے۔

دیگر نئی اصناف کے ساتھ میری ایجاد کردہ صنف یک مصرعی نظم کا مستقبل بھی تابناک ہے۔ کیوں کہ قاری کے پاس موٹی موٹی ناولیں، لمبے چوڑے افسانے یا طویل ترین مثنویاں اور مسدس پڑھنے کی فرصت وفراغت نہیں ہے۔ کم سے کم وقت میں کم سے کم الفاظ میں مافی الضمیر اگر پہنچ رہا ہو تو اس کی پذیرائی تو ہونی چاہیے۔ جہاں تک میری یک مصرعی نظم کا تعلق ہے ۔

مضمونِ او بہ مصرع برجستۂ تمام
منت پذیر مصرع دیگر نمی شود

خود اس شعر میں بات پہلے مصرعے میں پوری ہوگئی ہے۔ اورنگ آباد کے قمر اقبال کی ثلاثیاں جن کو انھوں نے تثلیثات کا نام دیا تھا خوب ہیں مگر ان کو بھی بھلا دیا گیا۔ حمایت علی شاعر میڈیا کے شاعر تھے پبلسٹی کے ہنر سے واقف تھے ثلاثی کے حوالے سے مشہور ہوگئے۔ ماہیے کی ترویج واشاعت میں جرمنی کے حیدر قریشی نے سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ ہائیکو کو اُردو میں روشناس کروانے میں محسن بھوپالی نے اہم رول ادا کیا۔ بہر حال یہ نئی اصناف اُردو میں خوب برتی گئیں مگر سہل انگاری اور تساہل کی وجہ سے ان کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ ایک نئی صنف نثری نظم کے نام سے بھی اُردو میں در آئی۔ معاف کرنا میرا خیال ہے صنف یا تو نثر ہو یا نظم۔ مگر نثری نظم سجاد حیدر یلدرم، سلطان حیدر جوش، سجاد ظہیر، نیاز فتح پوری، عظمت اللہ وغیرہ نے ادبِ لطیف کے طور پر لکھی ضرور مگر اُردو ادب میں یہ بار نہیں پاسکی۔ اس کا مستقبل بھی تاریک ہے۔ میرے خیال میں مصرعے میں غنائیت ہوتی ہے جو نثری آہنگ پر بہ ہر حال حاوی ہوتی ہے۔

غضنفر اقبال: آپ کی شعری کتاب 'اقرأ' پر صاحبِ اسلوب ادیب، ڈاکٹر ظ۔ انصاری مرحوم نے لکھا تھا۔ اس وقت آپ کا کیا احساس تھا؟

رؤف خیر: آپ نے بڑا اچھا سوال کیا۔ میرا پہلا شعری مجموعہ 'اقرأ' ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا تھا اور

• ۳۰ستمبر ۱۹۷۸ء کے ہفتہ وار بلٹز بمبئی میں خدالگتی کے عنوان کے تحت ڈاکٹر ظ۔انصاری نے بڑا تعریفی تبصرہ کیا تھا۔ان کا پہلا ہی جملہ میرے لیے سند کا درجہ رکھتا ہے:

''حیدرآباد کے رؤف خیر کا شعری مجموعہ کھولا تو ایسا معلوم ہوا کہ گیلی لکڑیوں کی ٹال پر جو ایندھن تُلوایا تھا اس میں صندل کی ٹہنی بھی چلی آئی ہے، مہکتی ہوئی۔''

جس دن بلٹز حیدرآباد پہنچا اس تبصرے کی دھوم مچ گئی بلکہ پورے ہندو پاک میں جہاں جہاں بلٹز پہنچا وہاں وہاں اربابِ نظر نے داد دی ہوگی۔میں بھی بہت خوش ہوا۔یقین جانیے مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ ڈاکٹر ظ۔انصاری کس قدآور شخصیت کا نام ہے۔میں زندگی میں کبھی ان سے نہ مل سکا۔بعد میں جان سکا کہ ان کا اسلوب کس قدر دل نشیں ہوتا ہے اور بعضوں کے لیے جان لیوا بھی ہوتا ہے (جو ان کی زد میں آجاتے ہیں۔)

اس تبصرے کے تعلق سے ایک تلخ بات بھی وابستہ ہے۔حیدرآباد میں ایک صاحب ہوا کرتے تھے حامد مجاز۔انھوں نے جب یہ تبصرہ پڑھا تو پیپر منٹ قریش کی گولیاں (میٹھی گولیاں) جو ایک آدھ آنے میں چار چھے مل جاتی تھیں، منگوائیں اور مجھے کھلائیں، اور دیگر موجود احباب کو بھی کھلائیں۔بعد میں مجھے رحمت یوسف زئی نے بتایا کہ حامد مجاز کا طنز دراصل مجھ پر یوں تھا کہ میاں تمھاری عمر پیپرمنٹ (گولیاں) کھانے کی ہے۔ایسے بڑے قدآور نقاد کے ایسے قابلِ تعریف تبصرے کے ابھی تم مستحق نہیں۔لو گولیاں کھاؤ۔اس طرح حامد مجاز نے اپنی ذہنیت کا اظہار کیا۔ایسی ذہنیت آج بھی کارفرما ہے۔پاکستان کا مشہور ماہ نامہ الحمرا لاہور تقریباً ساٹھ سال سے نکل رہا ہے۔اس کے سال نامے ۲۰۱۹ء میں گوشۂ ڈاکٹر رؤف خیر نکلا۔اس کے مدیر شاہد علی خاں صاحب نے مجھ سے میری تصاویر منگوائی ضرور تھیں مگر رسالہ آنے تک مجھے خبر ہی نہیں تھی کہ وہ میرا گوشہ نکال رہے ہیں۔میرے تین مضامین اور تین غزلیں اور مجھ پر ایک مضمون شائع کیا گیا تھا۔یہ سالنامہ الحمرا حیدرآباد میں بعض احباب کو میں نے دکھایا مگر کوئی اچھا تاثر ردعمل میں نہیں آیا۔ایسی بے حسی کا مظاہرہ ہوتا رہتا ہے۔

غضنفر اقبال: اُردو کے نامور شعرا شاہ نصیر، امیر مینائی، داغ دہلوی اور فانی بدایونی آپ کے وطنِ مالوف حیدرآباد دکن میں آسودۂ خاک ہیں۔مذکورہ شعرا کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

رؤف خیر: شاہ نصیر کو زبان و بیان پر خاصی دسترس تھی۔وہ مشکل اور سنگلاخ زمینوں میں شعر کہا کرتے تھے۔ابراہیم ذوق کے استاد تھے۔کسی معاملے میں دونوں میں ناچاقی ہوگئی تھی تو دونوں ایک دوسرے کی ہجو لکھتے رہے۔دونوں کے معرکے 'نقوش' میں پڑھے جاسکتے ہیں۔شاگرد ناخلف سہی مگر یہ کیسے

استاد ہیں جو شاگرد کی ہجو کر رہے ہیں!عاق کر دیتے۔۔۔!اور یہ کیسا شاگرد ہے جو استاد کے منھ آ رہا ہے۔امیر مینائی اور داغ دونوں شاعروں کی بیشتر شاعری نچلے دھڑ کی شاعری ہے۔داغ کی مجبوری تھی کہ وہ کوٹھوں کے حوالے سے جانا جاتا ہے۔امیر مینائی نے البتہ نثر میں کارنامے انجام دیئے ہیں۔مگر ان کارناموں پر ایسے شعر پانی پھیرتے ہیں۔

رخسار نازک ہوں تو ہوں آج ایک مانوں گا نہ میں
دو بوسے لوں گا جانِ من اک اِس طرف اک اُس طرف

موصوف کو بوسہ لینے کا سلیقہ بھی نہیں ہے۔کسی خوش ذوق شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

عارض ولب کے لیے، ابرو کے شانے کے لیے
چار ہی بوسے لیے لیکن ٹھکانے کے لیے

اپنے اپنے ذوق کے مطابق ٹھکانے بدلے بھی جاسکتے ہیں مگر چار برحق ہیں۔فانی بدایونی کی ساری تگ و دو موت کے اطراف ہے۔انھوں نے زندگی کا منفی پہلو اختیار کیا ہے۔ان کو دکھ ہے کہ ان کا گلاس آدھا خالی کیوں ہے۔بلکہ ان کا گلاس تو پورا خالی دکھائی دیتا ہے۔یہی کہتے کہتے چپ ہوگئے۔

سنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے
کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

معاف کرنا یہ چاروں شاعر یک طرفہ زندگی گزار کر مر گئے۔ان کے شعر عبرت حاصل کرنے کے کام آتے ہیں۔

غضنفر اقبال: ڈاکٹر شیخ محمد اقبال پر آپ نے کتاب 'اقبال بہ چشم خیر' تحریر کی ہے۔میرا احساس ہے کہ اقبال ہر صدی کا شاعر ہے۔آپ کا کیا خیال ہے؟

رؤف خیر: میں آپ سے بڑی حد تک متفق ہوں۔علامہ اقبال کے موضوعات میں تنوع ہے۔اُردو ادب کے سب سے زیادہ پڑھے لکھے شاعر ہونے کی وجہ سے مشرق و مغرب کے اہم فلسفے ان کی نظر میں ہیں۔وہ اسلامی شاعر بھی شمار ہوتے ہیں۔خودی کا فلسفہ اُردو ادب کو دیا۔اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی کے حوالے سے انفرادی حیثیت اور قومی و ملی تشخص کی اہمیت دکھائی۔اُردو اور فارسی ادب میں جو سرمایہ اقبال نے چھوڑا ہے اتنا اور ایسا سرمایہ کسی اور سے نہیں ملتا ہے۔اقبال کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ مصلحت اور مصالحت سے کام لیتے تھے کسی کو ناراض نہیں کرتے تھے۔اقبال کے تعلق سے میرا ایک شعر ہے۔

بدعتی اور خبیث بھی خوش تھے

اُن سے اہلِ حدیث بھی خوش تھے

ایسا شاعر جو سب کو خوش کرنے کی پالیسی پر عمل کرتا ہو وہ زیادہ دن زندہ رہتا ہے۔ چنانچہ آج ہم دیکھتے ہیں ساری دنیا میں اقبال کے چرچے ہیں۔ البتہ یہ کہنا مشکل ہے کہ اگلی صدی میں بھی اقبال کی یہ مقبولیت برقرار رہے گی۔ قوم وملت سے متعلق جو خیالات اقبال کے ہیں وہ تو ہر دور میں قابلِ داد رہیں گے لیکن، بیشتر موضوعات از کاررفتہ بھی ہو چکے ہیں۔ اقبال کی زبان سمجھنے والے ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔ اقبال کی دو تہائی شاعری فارسی میں ہے اور فارسی زبان ہندوستان میں مرچکی ہے۔ ایرانی اقبال کو لاہوری کہتے ہیں۔ سبک ہندی کا شاعر کہہ کر چشم کم سے دیکھتے ہیں۔ اُردو میں بھی اقبال جو کچھ کہتے ہیں وہ بھی فارسی جانے بغیر سمجھنا مشکل ہے۔ ایسی اُردو اب بولی جاتی ہے نہ سمجھی جاتی ہے۔ اس لیے جب زبان ہی کے لالے پڑے ہوئے ہیں تو اقبال کو ہر صدی کا شاعر سمجھ لینا خوش گمانی ہے۔

غضنفر اقبال: حیدرآباد دکن کے کون سے سخنور قومی منظر نامے میں دکھائی دیتے ہیں؟

رؤف خیر: آپ نے ادبی منظر نامے کی جگہ قومی منظر نامے کا سوال اُٹھایا ہے تو گویا اس میں مذہب شامل ہو گیا ہے۔ کیوں کہ قوم کا تشخص مذہب سے ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے امجد حیدرآبادی کا نام لیا جا سکتا ہے۔ قوم کے لیے ان کی ایک رباعی تو سدا بہار پیغام کا درجہ رکھتی ہے۔

ہر چیز مسببِ سبب سے مانگو
منت سے خوشامد سے ادب سے مانگو
کیوں غیر کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہو
بندے ہو اگر رب کے تو رب سے مانگو

سوال یہ ہے کہ کیا قوم امجد حیدرآبادی کے اس پیغام پر عمل پیرا ہے؟ ویسے دوسری ہی سانس میں امجد وحدت الوجود کا راگ بھی الاپتے دکھائی دیتے ہیں، ممکن نہیں دو وجود تو بھی میں بھی۔ قومی منظر نامے پر فی الحال امجد حیدرآبادی کے علاوہ اور کوئی سجھائی نہیں دے رہا ہے۔

غضنفر اقبال: عزیز احمد کے فن کے امتیازات کیا ہیں؟

رؤف خیر: اُردو ادب میں دو شخصیتیں بے مثال گزری ہیں جو بے انتہا پڑھی لکھی تھیں۔ شاعری میں علامہ اقبال اور نثر میں عزیز احمد۔ سب سے پہلی فضلیت یہ کہ عزیز احمد کئی زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ اُردو، فارسی، انگریزی، فرانسیسی، اطالوی وغیرہ۔ دانتے کی مشہور زمانہ کتاب ''THE DIVINE COMEDY'' کا ترجمہ ''طربیۂ خداوندی'' کے نام سے راست اطالوی زبان سے اُردو میں کیا۔ مقالاتِ گارساں دتاسی کا

ترجمہ فرانسیسی زبان سے راست اُردو میں کیا (اس میں شک نہیں ڈاکٹر یوسف حسین خاں اور اختر حسین رائے پوری کا اشتراک بھی تھا) البتہ بغیر کسی اشتراک کے راست فرانسیسی زبان سے بعض افسانے اُردو میں ترجمہ کیے۔ کئی معرکہ آرا ناول لکھے جیسے 'ایسی بلندی ایسی پستی'، 'آگ'، 'گریز'، 'شبنم' وغیرہ۔ کئی لاجواب افسانے لکھے جن کے مجموعے ہیں 'رقص ناتمام'، 'بے کار دن بے کار راتیں'، 'مدن سینا صدیاں' وغیرہ۔ طویل شاہکار نظمیں لکھیں جیسے ماہ لقا، عمر خیام، فردوس برروئے زمیں، ولیم شیکسپیئر کی نظموں اور ڈراموں کے تراجم کیے۔ ورڈزورتھ، براؤننگ، شیلے کی چند نظموں کے تراجم کیے۔ ٹی ایس ایلیٹ کی The Waste Land کا ترجمہ 'خراب آباد' کے نام سے کیا۔ ہیرالڈ لیمب کا چنگیز خان اور تاتاریوں کی یلغار کے نام سے ترجمہ کیا۔ اِبسن کے ڈرامے کا معمارِ اعظم کے عنوان سے ترجمہ کیا۔ اسلامی تاریخ، ہندو پاک کے تمدن کے حوالے سے کئی کتابیں انگریزی میں لکھیں جن کا ترجمہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے کیا۔ کہاں تک ان کے امتیازات گناؤں۔ میں نے ان کے فکر وفن پر پی ایچ۔ ڈی مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی سے کر رکھی ہے۔

غضنفر اقبال: اُردو شاعری کیا اُردو زبان کو زندہ رکھنے میں معاون ثابت ہوگی؟

رؤف خیر: جس طرح کی شاعری ان دنوں مشاعروں میں سنائی دے رہی ہے اور رسائل وجرائد میں پڑھنے کو ملتی ہے اس سے یہ توقع تو نہیں کی جا سکتی کہ اُردو زبان کو زندہ رکھنے میں معاون ثابت ہوگی۔ اُردو زبان کی چاشنی چیزے دیگر ہے۔ اس کی پاس داری اور آب یاری بہت کم ادیب وشاعر کر رہے ہیں۔ کسی زمانے میں فلموں میں نغمے لکھنے والے بھی شعروادب کا پاس ولحاظ رکھنے والے تھے جیسے ساحر لدھیانوی، شکیل بدایونی، مجروح سلطان پوری۔ ان کے نغموں میں اُردو شاعری کی روح سانس لیتی محسوس ہوتی تھی۔ آج وہاں بھی وہ صورتِ حال نہیں رہ گئی۔ اُردو زبان کو زندہ رکھنے کے جتن اُردو شاعری میں کم کم دکھائی دیتے ہیں۔

غضنفر اقبال: عہدِ موجود میں آپ ادبی لحاظ سے کس مقام پر کھڑا پاتے ہیں؟

رؤف خیر: الحمدللہ ادبی لحاظ سے میں نے جو مقام بنایا ہے وہ نظم ونثر میں اپنی انفرادیت کی وجہ سے بنایا ہے۔ اربابِ نظر سے میں نے اپنے آپ کو منوا کے چھوڑا ہے۔ اسے آپ تعلّی نہ سمجھیں تو عرض کروں کہ ہر صنفِ سخن میں جو کچھ میں نے لکھا ہے ایسا اور اتنا جنوبی ہند سے شاید ہی کسی نے لکھا ہو۔ نظم، غزل، غزل نما، سانیٹ، ترائیلے، ہائیکو، ماہیئے، تکونی، خاص طور پر ایجاد بندہ یک مصرعی نظم وغیرہ اور نثر میں تنقید، انشائیہ، ڈراما، افسانچے (پوپ کہانی)، تبصرے اور اقبالیات کے حوالے سے چونکانے والے مضامین گواہ ہیں۔ الحمدللہ کئی ہندو پاک کل ہند مشاعرے پڑھے یہاں تک کہ انڈین ایمبسی کی دعوت پر

سعودی عرب میں بھی مشاعرے پڑھے اور عمروں کی سعادت سے بھی مشرف ہوا۔ میری کئی کتابیں ریختہ ڈاک کام پر پڑھی جاسکتی ہیں اور اقبالیات سے متعلق میرے تقریباً پچیس لکچرس یوٹیوب پر دستیاب ہیں۔ جیسا کہ میں نے بتایا تھا کہ پاکستان کے مشہور و معروف ماہنامے الحمرا لاہور نے جنوری ۲۰۱۹ء کے اپنے سالنامے میں میرا گوشہ نکالا۔ یہ سب ادبی مقام جو اللہ نے مجھے سرفراز فرمایا ہے اُسی کا کرم ہے کہ ادبی حلقوں میں مجھے منوا کے چھوڑا۔ ورنہ لکھنے والے تو بہت ہیں۔ الحمد للہ الحمد للہ صلاحیتوں سے نوازنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے وہی سربلند کرتا ہے تو بندہ Shoulder Above Head ٹھہرتا ہے اور دنیا کی کوئی طاقت اسے نظرانداز نہیں کر پاتی۔

غضنفر اقبال: شعبۂ غزل کے دیوانوں کے لیے آپ کا پیغام؟

رؤف خیر: بہ ظاہر آسان نظر آنے والی صنفِ سخن غزل ریاضت اور مطالعہ مانگتی ہے۔ کسی پیر کامل کے ہاتھ پر بیعت کرنا نہیں چاہتے ہیں تو ایسے دیوانوں کو زیادہ سے زیادہ اسلاف کے کارناموں سے آگہی حاصل کرنے پر توجہ دینی چاہیے۔ زبان و بیان برتنے کا سلیقہ یوں ہی نہیں آجاتا۔ بزرگوں کی صحبت ہی تربیت کا بہترین ذریعہ ہے۔ جو لوگ ان امور سے بے نیازی دکھاتے ہیں، سرخ رو نہیں ٹھہر سکتے۔ نئی نسل کو چاہیے کہ عجلت پسندی سے کام لے کر کاتا اور لے دوڑی پر عمل نہ کریں۔ آج کل تخلیق کی آنول بھی ابھی پوری طرح نہیں کٹتی ہے اُسے فیس بک، وہاٹس ایپ یعنی سوشل میڈیا کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ یہ روش لے ڈوبتی ہے۔ میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ شعر کہنا تو آسان ہے، مصرع کہنا مشکل ہے۔

شعر کہنا اگر آجائے تو مصرع کہنا
آتے آتے تمھیں آجائے گا مطلع کہنا
بے ریاضت کوئی پہچان کہاں بنتی ہے
شعر کہنا ہی اگر ہے تو مرصع کہنا

☆☆☆

قندمکرر

علامہ سر محمد اقبال

ولادت: ۱۸۷۷ء۔ وفات: ۱۹۳۸ء

جبریل و ابلیس (نظم)

جبرئیل
ہمدم دیرینہ کیسا ہے جہان رنگ و بو
ابلیس
سوز و ساز و درد و داغ و جستجو و آرزو
جبرئیل
ہر گھڑی افلاک پر رہتی ہے تیری گفتگو
کیا نہیں ممکن کہ تیرا چاک دامن ہو رفو
ابلیس
آہ اے جبریل تو واقف نہیں اس راز سے
کر گیا سرمست مجھ کو ٹوٹ کر میرا سبو
اب یہاں میری گزر ممکن نہیں ممکن نہیں
کس قدر خاموش ہے یہ عالم بے کاخ و کو
جس کی نومیدی سے ہو سوز درون کائنات
اس کے حق میں تقنطوا اچھا ہے یا لاتقنطوا
جبرئیل
کھو دیئے انکار سے تو نے مقامات بلند
چشم یزداں میں فرشتوں کی رہی کیا آبرو
ابلیس

ہے مری جرأت سے مشت خاک میں ذوق نمو
میرے فتنے جامۂ عقل و خرد کا تار و پو
دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رزم خیر و شر
کون طوفاں کے طمانچے کھا رہا ہے میں کہ تو
خضر بھی بے دست و پا الیاس بھی بے دست و پا
میرے طوفاں یم بہ یم دریا بہ دریا جو بہ جو
گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے
قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو
میں کھٹکتا ہوں دل یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو

☆☆☆

سید نقی عباس (کیفی)
صدر شعبۂ فارسی، ایل۔ایس کالج، مظفر پور۔ رابطہ نمبر:8860793679

طاق نسیاں سے

کتابخانۂ ملّی تاجیکستان میں برصغیر کے فارسی مخطوطات

تلخیص:

اس مختصر تحریر میں نیشنل لائبریری تاجیکستان، واقع دوشنبہ، کی فہرست مخطوطات فارسی کی دوسری جلد اور اس میں مندرج برصغیر کے فارسی مخطوطات کا تعارف مقصود ہے۔ فہرست نسخہ ہای خطّی کتابخانہ ملّی تاجیکستان، جلد دوم، مرتبہ: علی بہرامیان اور عبداللہ یونس اُف، کتابخانۂ بزرگ آیت اللہ العظمٰی مرعشی نجفی، قم و مرکز اسناد و تاریخ دیپلماسی وزارت امور خارجہ، تہران سے فارسی میں ۱۳۸۹ھ۔ش/ ۲۰۱۰ء میں شائع ہوئی۔ مذکورہ فہرست کی پہلی جلد دیکھنے کا اتفاق نہیں ہو سکا، تاہم علی بہرامیان کے پیش لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ پیش نظر جلد دوم سے آٹھ سال قبل (۲۰۰۲ء میں) پہلی جلد منظر عام پر آ چکی تھی۔ پیش نظر فہرست، ۱۴۸ مجموعۂ مخطوطات کی فہرست ہے۔ ہر مجموعہ چھوٹے بڑے کئی رسالوں پر مشتمل ہے اور بصورت مجموعی ۲۱۸ مصنّفین کی ۵۴۶ تصانیف کا تعارف کرایا گیا ہے۔

فاضل فہرست نگاروں نے طریقۂ کار یہ اختیار کیا ہے کہ اول مجموعے میں شامل مخطوطات کے عناوین کو رومن (Roman) اعداد کے ساتھ مع نشاندہی اوراق متعلقہ درج کیا ہے، پھر ایک سطر یا نیم سطر میں مخطوطہ کا مختصر تعارف مع نام و تاریخ وفات مصنف اور آغاز مخطوطہ لکھا ہے۔ کسی مخطوطہ کا انجام یا اس کے مندرجات کی فہرست (بہ استثنائے ایک یا دو مخطوطہ) درج نہیں ہے۔ ہر مجموعہ میں شامل مخطوطات کا تعارف پیش کرنے کے بعد آخر میں، بہ لحاظ ترتیب، ان کے ترقیمے، خط، کاتب، تاریخ کتابت، سائز وغیرہ درج کیے گئے ہیں۔ لیکن یہ التزام ہر مجموعہ کے تعارف میں یکساں نہیں ہے۔

کلیدی الفاظ:

نیشنل لائبریری تاجیکستان، فہرست مخطوطات فارسی، برصغیر کے فارسی مخطوطات، تعارف۔

....

۱۹۹۱ء میں سویت یونین (Soviet Union) سے آزادی کے بعد وسط ایشیائی ممالک، سویت کے ہاتھوں اپنے مسخ شدہ تاریخی آثار اور میراث مکتوب کی بازیافت میں برابر کوشاں ہیں۔ ان ممالک میں تاجیکستان اور ازبکستان خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ تاجیکستان نے جہاں روسی رسم الخط کے بجائے فارسی یا تاجیک (عربی) رسم الخط کو ازسرنو عام کرنے اور اپنی جدید نسلوں کو اسلامی تعلیمات سے آراستہ کرنے کی مہم شروع کی، وہیں ازبکستان نے دنیا بھر کے کتابخانوں میں محفوظ اپنے علمی سرمایہ کی فہرست نگاری کا کام شروع کیا۔ یہاں، برسبیل تذکرہ، یہ بتاتے چلیں کہ ازبکستان کی اسی مہم کے تحت راقم السطور نے پروفیسر سید حسن عباس (صدر شعبۂ فارسی، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی؛ سابق ڈائرکٹر، رام پور رضا لائبریری، رام پور) وڈاکٹر خواجہ غلام السیدین (سابق ڈائرکٹر، شعبۂ کتبہ شناسی (عربی و فارسی)، آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا، ناگ پور) کے ساتھ رام پور رضا لائبریری میں موجود ازبکی مصنفوں اور ازبکستان سے متعلق فارسی اور عربی مخطوطات کی فہرست مرتب کی جو تاشقند سے انگریزی، روسی اور ازبکی زبانوں میں بالترتیب دو جلدوں میں ۲۰۲۰ء و ۲۰۲۱ء میں شائع ہوئی۔ خدابخش لائبریری نے بھی اپنے ذخیرے میں محفوظ ازبکی مصنفوں اور ازبکستان سے متعلق مخطوطات کی علیحدہ فہرست شائع کی۔ نیشنل میوزیم، نئی دہلی کی فہرست مرتب ہو رہی ہے۔ اس سلسلے میں متعدد سمیناروں اور نمائشوں کا انعقاد بھی ہوا۔ بہرحال، آج دونوں ملکوں نے نہ صرف یہ کہ اپنی باقی ماندہ تاریخی عمارتوں کی مرمت اور بازسازی کرالی ہے بلکہ بڑی تعداد میں کتابیں اور فہرستیں بھی شائع کی ہیں۔ البتہ اس موضوع پر تفصیلی گفتگو پھر کسی فرصت کے لیے اٹھا رکھتے ہیں، سردست اس مختصر تحریر میں نیشنل لائبریری تاجیکستان، واقع دوشنبہ، کی فہرست مخطوطات فارسی کی دوسری جلد اور اس میں مندرج برصغیر کے فارسی مخطوطات کا تعارف مقصود ہے۔

فہرست نسخہ ہای خطّی کتابخانہ ملّی تاجیکستان، جلد دوم، مرتبہ: علی بہرامیان اور عبداللہ یونس اُف، کتابخانۂ بزرگ آیت اللہ العظمٰی مرعشی نجفی، قم و مرکز اسناد و تاریخ دیپلماسی وزارت امور خارجہ، تہران سے فارسی میں ۱۳۸۹ھ۔ش/ ۲۰۱۰ء میں شائع ہوئی۔ مذکورہ فہرست کی پہلی جلد دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوسکا، تاہم علی بہرامیان کے پیش لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ پیش نظر جلد دوم سے آٹھ سال قبل (۲۰۰۲ء میں) پہلی جلد منظر عام پر آچکی تھی۔ پیش نظر فہرست، ۱۴۸ مجموعۂ مخطوطات کی فہرست ہے۔ ہر مجموعہ چھوٹے بڑے کئی رسالوں پر مشتمل ہے اور بصورت مجموعی ۲۱۸ مصنّفین کی ۵۴۶ تصانیف کا تعارف کرایا گیا ہے۔

فاضل فہرست نگاروں نے طریقۂ کار یہ اختیار کیا ہے کہ اول مجموعے میں شامل مخطوطات کے عناوین کو رومن (Roman) اعداد کے ساتھ مع نشاندہی اوراق متعلقہ درج کیا ہے، پھر ایک سطر یا نیم سطر

میں مخطوطہ کا مختصر تعارف مع نام و تاریخ وفات مصنف اور آغاز مخطوطہ لکھا ہے۔ کسی مخطوطہ کا انجام یا اس کے مندرجات کی فہرست (بہ استثنائے ایک یا دو مخطوطہ) درج نہیں ہے۔ ہر مجموعہ میں شامل مخطوطات کا تعارف پیش کرنے کے بعد آخر میں، بہ لحاظ ترتیب، ان کے ترقیمے، خط، کاتب، تاریخ کتابت، سائز وغیرہ درج کیے گئے ہیں۔ لیکن یہ التزام ہر مجموعہ کے تعارف میں یکساں نہیں ہے۔

پیش نظر فہرست اس لحاظ سے کہ ایک مخصوص کتب خانہ میں محفوظ فارسی مخطوطات کے مجموعوں کی فہرست ہے، اہمیت کی حامل ہے۔ ان مجموعوں میں برصغیر ہندو پاک کے بعض مخطوطات بھی شامل ہیں۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ یہ مخطوطات، جیسا کہ ان کے ترقیموں سے معلوم ہوتا ہے، برصغیر سے ماوراء النہر منتقل ہونے کے بجائے وہیں نقل یا آمادہ کیے گئے ہیں جس سے ان مخطوطات کی مقبولیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ یہاں یہ بات خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے کہ مجموعہ نمبر ۶۸۹ میں شامل سراج الدین علی خان آرزو کی تصنیف 'خیابان گلستان' کا مخطوطہ جو کہ 'گلستان' کی شرح ہے، غالباً ماوراء النہر سے طباعت کے مقصد سے 'گلستان' کے متن کے ساتھ کتابت کرایا گیا تھا۔ نسخہ کے آخر میں عبارت ''بہ ہمت و سرمایۂ داروغہ شیخ نثار علی'' اور مولانا محمد ہادی علی و محمد اصغر علی نسیم کے قطعات تاریخ طباعت مندرج ہیں۔ کاش فہرست نگار حضرات نے یہ قطعات بھی نقل کیے ہوتے۔ اگرچہ اس بات کا علم نہیں ہوسکا کہ بالآخر یہ مخطوطہ زیور طباعت سے آراستہ ہوا یا نہیں، تاہم 'خیابان' کی مقبولیت کا اندازہ ضرور ہوتا ہے۔ بہرحال، سطور ذیل میں پیش نظر فہرست میں شامل برصغیر کے فارسی مخطوطات کا تعارف پیش کیا جاتا ہے:

۱۔ دیوان بیدل

مرزا عبدالقادر بیدل (م: ۱۱۳۰ق/ ۱۷۲۱ء)

مجموعہ نمبر ۲، مخطوطہ نمبر ۱، اوراق: ۱ (ب) تا ۲۲۹ (الف)؛ شامل 'چہار عنصر'، 'طور معرفت'، غزلیات و قطعات؛ تاریخ کتابت: جمادی الاولیٰ ۱۲۸۳ق (۱۸۶۶ء)؛ خط: نستعلیق

آغاز: بہ اوج کبریا کز پہلوی عجز است راہ آنجا

۲۔ تکملۃ الایمان وتقویۃ الایقان

عبدالحق محدث دہلوی بخاری (م: ۱۰۵۲ق/ ۱۶۴۲ء)

مجموعہ نمبر ۵، مخطوطہ نمبر ۱، اوراق: ۱ (ب) تا ۱۲۴ (الف)؛ تاریخ کتابت: ۱۳۲۶ق (۱۹۰۸ء)؛ خط: نستعلیق؛ کاتب: سید عزیز خواجہ محمد مفتی ابن خواجہ مختوم

آغاز: ...... اما بعد می گوید فقیر حقیر اضعف عباد اللہ القوی الباری عبدالحق بن سیف الدین ترک

البخاری کہ این رسالہ ای است......

۳۔البرہان فی علامات مہدی آخرالزمان

علی بن حسام الدین متقی ہندی (م:۹۸۵ق/ ۱۵۷۷ء)

مجموعہ نمبر ۲۲۰،مخطوطہ نمبر ۲،اوراق:۲۰(ب) تا۲۶(ب)

آغاز: ذکر ماورد فی ظہور المہدی رضی اللہ عنہ [کذا] فی جامع الاصول فی اشراط الساعۃ......

۴۔انوارالرّحمان

محمد نورالدین ابن محمد مقیم الدین مرادآبادی ہندی (م:۱۲۵۰ق/ ۳۵-۱۸۳۴ء)

مجموعہ نمبر ۲۲۰،مخطوطہ نمبر ۳،اوراق:۲۸(ب) تا۴۸(ب)

آغاز: خدا را انتظار حمد ما نیست/محمد را چشم بر ثنا ے ما نیست (’محمد چشم در راہ ثنا نیست‘ درست مصراع ہے۔) (کذا)/مناجاتی اگر باید بنا کرد/بہ بیتی ہم قناعت می تواں کرد......

۵۔چہار عنصر

مرزا عبدالقادر بیدل (م:۱۱۳۰ق/۱۷۲۱ء)

مجموعہ نمبر ۲۴۰، مخطوطہ نمبر ۱، اوراق: ۱(ب) تا ۳۲۳(ب)؛ تاریخ کتابت: ۱۲۴۴ق (۱۸۲۸ء)؛خط: نستعلیق؛ کاتب: محمدی ابن ملا عاشور محمد خوقندی؛ جائے کتابت: خوقند

آغاز: خداوندا زبان معذور بے حرتی سرایی است،عذر مرا در ایام بپذیر......

۶۔سلّم العلوم

محب اللہ بن عبدالشکور ہندی بہاری (م:۱۱۱۹ق/ ۱۷۰۷ء)

مجموعہ نمبر ۲۶۸،مخطوطہ نمبر ا،اوراق:۱(ب) تا۸(ب)؛ ناقص الآخر

آغاز: سبحانہ ما اعظم شانہ لایحد ولا یتصوّر......اما بعد فہذہ رسالۃ......

(اس مجموعہ میں شامل دوسرے رسالے کے ترقیمہ میں تاریخ کتابت ۱۲۹۹ق/ ۱۸۸۲ء مندرج ہے)۔

۷۔فرس نامہ یا ترجمۂ سالہوتر

سید ابوالحسن ہاشمی (۹۲۶ق/ ۱۵۲۰ء میں سنسکرت سے ترجمہ)

مجموعہ نمبر ۳۵۳،مخطوطہ نمبر ۲،اوراق:۱۴۵(ب) تا۲۲۱(الف)؛ نستعلیق؛ تاریخ کتابت: ۱۴ ذی القعدہ ۱۲۳۶ق (۱۸۲۱ء) بہ امر امیر قلندر خان

آغاز: (۱) اسب فکرت چو زین کند دانا/بہ کہ گوید نخست حمد خدا

(۲) درفضیلت اسب بر حیوانات وسبب نظم کتاب برارباب الالباب......

۸۔مثنوی مئے رنگ

منسوب بہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اوشی (م: ۶۳۴ق/ ۱۲۳۵ء)

مجموعہ نمبر ۳۹۵، مخطوطہ نمبر ۴، اوراق: ۱۸۸(الف) تا ۲۷۳(ب)؛ تاریخ کتابت: صفر ۱۲۲۹ق (۱۸۱۴ء)؛ جائے کتابت: بخارا

آغاز: اے بہ نام تو ابتدائے سخن/اوّل صنعت، انتہائے سخن

۹۔مکتوبات مرزا جان جاناں

مرزا مظہر جان جاناں (م:۱۱۹۵ق/۱۷۸۱ء)

مجموعہ نمبر ۳۹۵،مخطوطہ نمبر ۷،اوراق: ۳۷۳(ب) تا ۴۰۴(ب)؛ تاریخ کتابت: ۱۲۵۲ق (۱۸۳۶ء)؛ کاتب: فیض اللہ

آغاز: برخوردار مکرر التماس تحریر حسب ونسب از فقیر کردن......

۱۰۔تحفۂ قادریہ

ابوالمعالی محمد لاہوری قادری کرمانی، متخلص بہ ’غربتی‘ (م: ۱۰۲۴ق/ ۱۶۱۵ء)

مجموعہ نمبر ۴۰۶، مخطوطہ نمبر ۲، اوراق: ۳۵(ب) تا ۱۱۵(ب)؛ تاریخ کتابت: ربیع الثانی ۱۲۲۵ق (۱۸۱۰ء)

آغاز: ہاتفم گفتا، بگو وصف کریم/قلت بسم اللہ الرحمن الرحیم (وزن کے لحاظ سے ’قلت بسم اللہ رحمن الرحیم‘ ہونا چاہیے۔ کتابت/ٹائپنگ کی غلطی ہے۔)/حمد دلگشا مر حضرت قادری را کہ در سلسلۂ قادریہ......

۱۱۔انوار حکمت

سید معصوم علی شاہ دکنی

مجموعہ نمبر ۴۱۲،مخطوطہ نمبر ا،اوراق:۱(ب) تا ۱۴(ب)؛ نستعلیق؛ تاریخ کتابت: صفر ۱۲۱۸ق (۱۸۰۳ء)

آغاز: الحمد للہ الذی نوّر مصابیح القلوب بانوار حکمۃ......الٰہی بہ حرمت و بہ عزت آنہا......

۱۲۔شرح مثنوی معنوی

شاہ میر محمد نوراللہ احراری دہلوی (م: ۱۰۷۳ق/ ۱۶۶۲ء)

مجموعہ نمبر ۴۵۴، مخطوطہ نمبر ۲، اوراق: ۲۹۳(ب) تا ۳۸۴(ب)؛ نستعلیق؛ تاریخ کتابت: ۱۲۷۷ق (۱۸۶۰ء)؛ کاتب: ملا محمد عظیم بن محمد رجب؛ جائے کتابت: خوقند

آغاز: ابتدا کرد مولوی علیہ رحمت [کذا] مثنوی را در بیان معیت حق با خلق......

۱۳۔غزلیات بیدل

مرزا عبدالقادر بیدل (م: ۱۱۳۰ق/۱۷۲۱ء)

مجموعہ نمبر ۶۳۳، مخطوطہ نمبر ۶، اوراق: ۱۰۱(ب) تا ۱۱۷(ب)

(فہرست میں آغاز درج نہیں ہے)

۱۴۔تکملۃ الایمان وتقویۃ الایقان

عبدالحق محدث دہلوی بخاری (م: ۱۰۵۲ق/ ۱۶۴۲ء)

مجموعہ نمبر ۶۵۸، مخطوطہ نمبر ۱، اوراق: ۱(ب) تا ۶۷(ب)

(فہرست میں آغاز درج نہیں ہے)

۱۵۔خیابان گلستان

سراج الدین علی خان آرزو شاہجہان آبادی (م: ۱۱۶۹ق/ ۱۷۵۶ء)

مجموعہ نمبر ۶۸۹، مخطوطہ نمبر ۱، اوراق: ۱(ب) تا ۵۵(ب)؛ نستعلیق؛ کاتب: خدای بردی بن ملا محمد عثمان ہراتی

آغاز: قولہ منت بالکسر برکسی احسان نمودن وتحمید حق سبحانہ وتعالی بہ لفظ منت......

دراصل یہ مخطوطہ ’گلستاں‘ کا ایک نسخہ ہے جس کے حاشیوں پر خان آرزو کی یہ شرح کتابت کی گئی ہے اور ظاہراً یہ مخطوطہ طباعت کے لیے آمادہ کیا گیا تھا یا کیا جا رہا تھا۔ ورق ۵۵(ب) پر ’از ہمت وسرمایہ داروغہ شیخ نثار علی‘ مندرج ہے اور ساتھ ہی مولانا ہادی علی ومحمد اصغر علی خان نسیم کے دو قطعات تاریخ طباعت بھی مکتوب ہیں۔ اس مخطوطہ میں یہ شرح گلستان کے باب دوم کی حکایت ۱۱ ’در جامع بعلبک وقتی کلمہ ای چند ہمی گفتم......‘ تک ہی ہے۔

۱۶۔فوائد الاسرار فی رفع الاستار عن عیون الاغیار

شاہ بہلول کول برکی جالندھری (م: ۱۱۷۰ق/ ۱۷۵۶ء)

مجموعہ نمبر ۶۸۹، مخطوطہ نمبر ۳، اوراق: ۵۸(الف) تا ۱۱۶(ب)

آغاز: الحمد للہ الذی اعطی لمثلی قدرۃ علی تدوین ہذا الشرح......می گوید مرید حضرت سید بھیکہ فسح اللہ تعالیٰ فی اجلہ بہلول کول ابن مرزا خان برکی ثم الجالندھری......

۱۷۔پرتو عشق

احتمالاً خواجہ خورد محمد عبداللہ دہلوی (۱۱ق/ ۱۷ء)

مجموعہ نمبر ۶۸۹، مخطوطہ نمبر ۵، اوراق: ۱۲۲(ب) تا ۱۲۵(ب)

آغاز: الحمد للہ کہ محبوب جانی وصاحب دو جہانی من با من نسبت یگانگی واقع شد......

۱۸۔بشارۃ الفقرا

ابوالفتح بن عارف بن مولانا احمد کشمیری

مجموعہ نمبر ۶۸۹، مخطوطہ نمبر ۶، اوراق: ۱۲۵(ب) تا ۱۴۶(الف)

آغاز: الحمد للملک العزیز العلام......امابعد فیعرض علیکم یا خلان الصدق......

۱۹۔اعتکافیہ

خواجہ بی قدر ولد نعمت اللہ صدر

مجموعہ نمبر ۷۴۰، مخطوطہ نمبر ۱، اوراق: ۱(ب) تا ۶(ب)

آغاز: حمد وسپاس متکاثر وشکر وثنای متواتر مرآن خداوندی را کہ معتکفان زاویہ وحدت وصومعہ نشینان کنج عزلت......

یہ مخطوطہ دو ’قسم‘ پر مشتمل ہے جن میں سے ایک مسائل اعتکاف اور کیفیت شب قدر کے بیان میں ہے اور بقول مصنف اس نے اس رسالہ کی تصنیف آخر ماہ رمضان ۹۴۷ ہجری (۱۵۴۱ء) میں شروع کی تھی۔

۲۰۔سلک السلوک

ضیاء الدین نخشبی دہلوی (۷۵۰ق/ ۱۳۵۰ء)

مجموعہ نمبر ۷۵۶، مخطوطہ نمبر ۱، اوراق: ۳(ب) تا ۱۰۲(الف)؛ نستعلیق؛ تاریخ کتابت: ربیع الاول ۱۲۵۲ق (۱۸۳۶ء)؛ کاتب: میر علاء الدین ابن میر ضیاء الدین خواجہ

آغاز: حمدی کہ از عطر روائح اوارواح اولیا معطر گردد......

۲۱۔الحاشیۃ علی حاشیۃ الفوائد الضیائیۃ

ملا عبدالحکیم سیالکوتی حنفی (م: ۱۰۶۷ق/ ۱۶۵۷ء)

حاشیہ بر حاشیہ ملا عبدالغفور لاری بر الفوائد الضیائیہ عبدالرحمن جامی

مجموعہ نمبر ۷۶۸، مخطوطہ نمبر ۲، اوراق: ۱۹ (الف) تا ۵۵ (الف)

آغاز: المرکب الذی یشبہ مبنی الاصل......

۲۲۔ غزلیات آصف

نظام الملک قمر الدین آصف جاہ (م: ۱۱۶۱ق/ ۱۷۴۸ء)

مجموعہ نمبر ۸۰۶، مخطوطہ نمبر ۱، اوراق: ۱ (ب) تا ۲۴ (ب)

آغاز: تا سر نکرد وصف دہانت زبان ما// چون غنچہ گل نکرد زبان در دہان ما......

۲۳۔ رقعات بیدل

مرزا عبد القادر بیدل (م: ۱۱۳۰ق/ ۱۷۲۱ء)

مجموعہ نمبر ۸۲۲، مخطوطہ نمبر ۱، اوراق: ۱ (ب) تا ۱۰۶ (ب)

آغاز: عجز مراتب حمد و ثنا تسلیم بارگاہ صمدی کہ......اما بعد بیدل مہجور کہ محیط دل ہای گوہر......

۲۴۔ محیط اعظم

مرزا عبد القادر بیدل (م: ۱۱۳۰ق/ ۱۷۲۱ء)

مجموعہ نمبر ۸۲۲، مخطوطہ نمبر ۲، اوراق: ۱ (ب) تا ۱۷۸ (الف) [اوراق کی شمارہ گزاری از سر نو کی گئی ہے]؛ شکستہ آمیز نستعلیق؛ تاریخ کتابت: شعبان ۱۲۹۵ق (۱۸۷۸ء)؛ کاتب: بابا خواجہ سمرقندی؛ محل کتابت: قاضی خانہ سمرقند (در گزر مخدوم خوارزمی)

آغاز: حمد نشئہ آخرین را کہ میخانہ حقیقت انسانی را......

۲۵۔ سلّم العلوم

محب اللہ بن عبد الشکور ہندی بہاری (م: ۱۱۱۹ق/ ۱۷۰۷ء)

مجموعہ نمبر ۸۸۱، مخطوطہ نمبر ۲، اوراق: ۲۱۶ (ب) تا ۲۴۲ (الف)

آغاز: ندارد

۲۶۔ ہدایۃ الاعمی

محمد حسین خباز کشمیری (م: ۱۰۵۲ق/ ۱۶۴۲ء)

مجموعہ نمبر ۸۸۴، مخطوطہ نمبر ۲، اوراق: ۶۱ (ب) تا ۱۸۷ (ب)

آغاز: الحمد للہ الذی خلق السموات والارض......اما بعد بدان ای طالب حق و سالک راہ مطلق......

۲۷۔ طوطی نامہ

ضیاء الدین نخشبی دہلوی (۷۵۰ق/ ۱۳۵۰ء)

مجموعہ نمبر ۹۰۰، مخطوطہ نمبر ۱، اوراق: ندارد

آغاز: الٰہی اہل دل را ذوق دہ// ضیای نخشبی را شوق دہ......نعت سید المرسلین و خاتم النبیین......

(اس مجموعہ میں ’حکایت چہار درویش‘ کا بھی ایک مخطوطہ ہے لیکن اس کی تفصیلات مندرج نہیں ہیں)

۲۸۔ ضابط قواعد الحساب

مولوی عصمت اللہ بن اعظم سہارنپوری

مجموعہ ۹۳۱، مخطوطہ نمبر ۳، اوراق: ۴۵ (ب) تا ۱۴۴ (ب)؛ تاریخ کتابت: جمادی الاولی ۱۲۲۹ق (۱۸۱۴ء)؛ کاتب: محمد شریف ابن محمد ابو الاعطی بوستانی

آغاز: سبحان من عندہ علم الحساب......اما بعد یقول اعصی عباد اللہ الکریم الغفور عصمۃ اللہ بن اعظم بن عبد الرسول......

۲۹۔ لباب الاخبار (چہل باب)

محمد بن محمود مستوفی (عہد بابر)

مجموعہ ۹۸۵، مخطوطہ نمبر ۲، اوراق: ۱۰۲ (الف) تا ۱۷۱ (ب)؛ نستعلیق؛ کاتب: ملا جمعہ بای قیرغیز قبچاقی

آغاز: ......روی نمودہ بود بہ سعادت و فیروزی بہ دار السلطنہ آگرہ منزل فرمودہ اند......

(یہ رسالہ چارسو احادیث کا فارسی ترجمہ ہے اور بابر کو پیش کیا گیا ہے۔)

۳۰۔ الفتاوی الصوفیہ

فضل اللہ بن محمد بن ایوب حنفی مولتانی (م: ۷۵۳ق/ ۵۳-۱۳۵۲ء)

مجموعہ نمبر ۱۰۱۱، مخطوطہ نمبر ۳، اوراق: ۶۲ (ب) تا ۱۳۰ (ب)

آغاز: فصل سادس فی کتاب فتاوی صوفیہ فی بیان علماء اہل السنۃ والجماعۃ ذکر فی التمہید......

۳۱۔ الکفایۃ شرح الشافیۃ

محمد طاہر الفتنی گجراتی (م: ۹۸۶ق/ ۱۵۷۹ء)

مجموعہ نمبر ۱۰۳۶، مخطوطہ نمبر ۱، اوراق: ۱ (ب) تا ۱۲۴ (الف)؛ نسخ و نستعلیق؛ تاریخ کتابت: شوال ۱۲۷۶ق (۱۸۶۰ء)؛ محل کتابت: قریہ پایتونج

آغاز: الحمدللہ الذی بیدہ الجود والکرم ولہ التصریف فی الوجود......اعلم ان علم الصرف کما اشتہر امّ العلوم العربیہ......

(کاتب نے اپنے نام کی جگہ یہ مخفف استعمال کیا ہے: 'ک ص ک ط ک ا')۔

۳۲۔ رسالہ توبہ وذکر

خواجہ محمد بن عبداللہ خورد دہلوی

مجموعہ نمبر ۱۰۴۹، مخطوطہ نمبر ۶، اوراق: ۸۷(الف) تا ۹۳(الف)

آغاز: شکر وسپاس مرخالقی را کہ ہژدہ ہزار عالم رابیافرید وازاین میان آدم رابرگزید......

۳۳۔ دہ قاعدہ (رسالہ سلوک)

میر سید علی ہمدانی (م: ۷۸۶ق/۱۳۸۴ء)

مجموعہ نمبر ۱۰۴۹، مخطوطہ نمبر ۱۲، اوراق: ۱۲۴(ب) تا ۱۳۰(ب)

آغاز: حمد وثنای نامتناہی پروردگاری را کہ استحکام قواعد اسلام......

۳۴۔ واردات امیریہ

میر سید علی ہمدانی (م: ۷۸۶ق/۱۳۸۴ء)

مجموعہ نمبر ۱۰۴۹، مخطوطہ نمبر ۱۳، اوراق: ۱۳۰(ب) تا ۱۳۹(ب)

آغاز: رب اشرح لی صدری ویسّر لی امری......ای مرہم جراحت ہر دل ریشی......

۳۵۔ رسالہ تلقینیہ (آداب مبتدی)

میر سید علی ہمدانی (م: ۷۸۶ق/۱۳۸۴ء)

مجموعہ نمبر ۱۰۴۹، مخطوطہ نمبر ۱۴، اوراق: ۱۴۰(الف) تا ۱۵۳(الف)

آغاز: الحمدللہ الذی لقنی ذایق العرفان بترجمان اللسان......امابعد این رسالہ ایست موجز وعجالہ ایست مختصر در بیان آداب مبتدی وطالبان......

۳۶۔ منہاج العارفین

میر سید علی ہمدانی (م: ۷۸۶ق/۱۳۸۴ء)

مجموعہ نمبر ۱۰۴۹، مخطوطہ نمبر ۱۵، اوراق: ۱۵۳(ب) تا ۱۵۷(الف)

آغاز: حمد بی حد وثنای بی عد مرآفریدگاری را کہ سینہ عارفان رامخزن اسرار خود ساختہ......

۳۷۔ رسالہ شریفہ صوفیہ

میر سید علی ہمدانی (م: ۷۸۶ق/۱۳۸۴ء)

مجموعہ نمبر ۱۰۴۹، مخطوطہ نمبر ۱۶، اوراق: ۱۵۷(ب) تا ۱۶۸(ب)

آغاز: امابعد بدان کہ پیر رای شریعت وطریقت وحقیقت رادہ چیز باید......

۳۸۔ دیوان مظہر جان جانان

مرزا مظہر جان جاناں (م: ۱۱۹۵ق/۱۷۸۱ء)

مجموعہ نمبر ۱۰۵۲، مخطوطہ نمبر ۶، اوراق: ۴۹۵(ب) تا ۵۳۸(الف)

آغاز: آبی نزدروی گل گران خواب سخت ('آبی نزد بہ روی گران خواب سخت ما' درست مصراع ہے۔)

۳۹۔ سلک السلوک

ضیاءالدین نخشبی دہلوی (۷۵۰ق/۱۳۵۰ء)

مجموعہ نمبر ۱۱۸۴، مخطوطہ نمبر ۲، اوراق: ۴۹(ب) تا ۵۹(الف)؛ نستعلیق؛ تاریخ کتابت: محرم ۱۲۹۱ق (۱۸۷۴ء)؛ کاتب: ملانظر بن خالق خلیفہ (درعہد سید محمد خدایار خان)؛ محل کتابت: بلدہ دوشن

آغاز: حمدی کہ از عطر روائح وارواح اولیاء معطر گرداند مرخدای را کہ اولیاء او......

۴۰۔ محیط اعظم

مرزا عبدالقادر بیدل (م: ۱۱۳۰ق/۱۷۲۱ء)

مجموعہ نمبر ۱۱۸۴، مخطوطہ نمبر ۲، اوراق: ۸۰(ب) تا ۱۵۸(الف)

آغاز: حمد وثنا آفرینی را کہ میخانہ حقیقت انسانی راز انشاءلقد کرّمنا......

۴۱۔ نکات

مرزا عبدالقادر بیدل (م: ۱۱۳۰ق/۱۷۲۱ء)

مجموعہ نمبر ۱۲۰۵، مخطوطہ نمبر ۵، اوراق: ۱۲۶(ب) تا ۲۲۰(الف)

آغاز: حمد مبدعی کہ تردد انفاس اعیان کیف وکم موقوف بہ تحریک......

۴۲۔ طریقت نقشبندیہ

عبداللہ عرف غلام علی

مجموعہ نمبر ۱۲۸۴، مخطوطہ نمبر ۳، اوراق: ۳۳(ب) تا ۷۰(ب)

آغاز: بعد حمد وصلوٰۃ فقیر عبداللہ عرف غلام علی عفی عنہ گزارش می نماید کہ بیست و دو سالہ بودم کہ ہدایت وعنایت...... بہ جناب فیض مآب...... محیی سنن نبویہ......طریقہ احمد شمس الدین حبیب اللہ مرزا جان

جانان......

(ورق ۲۳ب، یعنی مخطوطہ نمبر ۲ کے آخر میں کاتب کا نام محمد یونس بن بابا خواجہ کشی مندرج ہے، لیکن یہی کاتب پیش نظر رسالہ کا بھی کاتب ہو لازم نہیں)۔

۴۳۔ترجمہ تذکرۃ الموتی والقبور

متن: جلال الدین سیوطی (م:۹۱۱ق/۱۵۰۶ء)؛ ترجمہ و شرح فارسی: محمد ثناءاللہ عثمانی پانی پتی مجددی (م:۱۲۲۵ق/۱۸۱۰ء)

مجموعہ نمبر ۱۲۵۲، مخطوطہ نمبر ۲، اوراق: ۱۳۵(ب) تا ۱۶۷(ب)

آغاز: الحمدللہ الذی لہ مافی السموات و مافی الارض...... بعد از حمد و صلواۃ فقیر حقیر......می گوید کہ مردن امری است لابدی لامفرّ منہ......لہذا بہ زبان فارسی در احوال موت و اموات......

۴۴۔تیسیر الاحکام

ملک العلماء شہاب الدین دولت آبادی

مجموعہ نمبر ۱۳۲۵، مخطوطہ نمبر ۳، اوراق: ۴۴(ب) تا ۸۷(الف)

آغاز: حمد متوافر و ثنای متکاثر مر حضرت صمدیت......

۴۵۔خلاصۃ المعارف

سید آدم بنوری نقشبندی ہندی (م:۱۰۵۳ق/۴۴-۱۶۴۳ء)

مجموعہ نمبر ۲۰۰۸، مخطوطہ نمبر ۲، اوراق: ۱۴(ب) تا ۲۳(ب)

آغاز: فصل دوم قسم اول در باب صفات حضرت رسالت مآب......

☆☆☆

تعارف و تبصرہ

نام کتاب	: مولانا جلال الدین رومی (احوال و آثار)		
مصنف	: ڈاکٹر مغیث احمد		
صفحات	: ۱۹۲	قیمت	: ۲۰۰/روپے
سال اشاعت	: ۲۰۱۹ء	مطبع	: ایم آر پبلی کیشنز، نئی دہلی
ناشر	: ایم آر پبلی کیشنز، نئی دہلی		
تبصرہ نگار	: فیضان حیدر (معروفی)		

”۔۔۔دراصل یہ کتاب دور حاضر کے تمام تنقیدی اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے مولانا کی زندگی کے بکھرے ہوئے اوراق کو یکجا کرنے کی کامیاب کوشش ہے۔ اس کتاب سے اندازہ ہوتا ہے کہ مغیث احمد نے مولانا سے متعلق تذکروں کو کھنگال کر قدیمی مبحث کے باب بند کرتے ہوئے حتمی فیصلے کی کوشش کی ہے۔ آخر میں مولانا کی حیات جاوداں کے ضامن علمی اثاثے پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے ان کے شعری شعور پر بھی ناقدانہ گفتگو کی ہے۔“ (فلیپ کی تحریر)

زیر نظر کتاب کے سلسلے میں یہ خیالات پروفیسر عراق رضا زیدی کے ہیں۔ اس سے ڈاکٹر مغیث احمد کی علمی و ادبی سرگرمیوں اور تحقیقی و تنقیدی کاوشوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر مغیث احمد نسل نو کے محققین و ناقدین میں علمی و ادبی کارناموں سے اپنی شناخت قائم کر چکے ہیں۔ فی الحال وہ بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی میں بحیثیت استاد خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ایک عمدہ استاد ہونے کے ساتھ وہ اپنے علمی و ادبی کاموں کے لیے بھی وقت نکال لیتے ہیں۔ یہ ان کے علم و ادب سے شغف کی بین دلیل ہے، ورنہ آج کی یونیورسٹیوں کے اساتذہ تو اپنے طلبہ کے لیے بھی وقت نہیں نکال پاتے۔ اس قحط الرجال (ان معنوں میں کہ علم و ادب سے شغف رکھنے والے افراد بہت کم رہ گئے ہیں) کے دور میں تدریسی فرائض کی انجام دہی کے بعد علمی و ادبی کاموں کے لیے وقت نکال لینا کارے دارد۔

زیر نظر کتاب جیسا کہ نام سے ظاہر ہے مولانا جلال الدین رومی کے حالات اور علمی و ادبی

کارناموں پر مشتمل ہے۔ مصنف نے کتاب کی ترتیب میں بھی اپنی علمی ذہانت کا مظاہرہ کیا ہے۔ عہد مولانا، نام، نسب، تخلص، ولادت، تعلیم، وطن سے ہجرت، خواجہ عطار سے ملاقات اور ازدواج اور وفات سے لے کر ان کے اقوال اور علمی و ادبی آثار کے سلسلے میں بڑی جامع اور نپی تلی گفتگو کی ہے۔ اسی طرح ان کی غزلوں اور رباعیوں کے نمونے مع ترجمہ پیش کیے ہیں، ساتھ ہی ان کے کلام میں پائی جانے والی خوبیوں کا تذکرہ بھی جامع انداز میں کیا ہے۔

مولانا روم کی شاعری میں تفکر و تخیل کے ساتھ نغمگی، موسیقیت اور ایسی روحانی خوشبو ہے جس کا مطالعہ کرتے ہوئے ہر شخص ان کی شاعری کا دلدادہ ہو جاتا ہے۔ رومی نے بہتیرے لوگوں کی زندگیوں میں انقلاب برپا کیا ہے۔ خود علامہ اقبال بھی رومی کے دل دلدادہ تھے اور ان کو اپنا معنوی پیرومرشد قرار دیتے تھے۔ جب ہم علامہ اقبال کی فارسی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ رومی سے حد درجہ متاثر ہیں۔ کہیں کہیں تو یہ فرق پیدا کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ اشعار رومی کے ہیں یا علامہ اقبال کے۔ رومی کو آج بھی وہی شہرت و مقبولیت حاصل ہے جو ان کے زمانے میں حاصل تھی۔ بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ روز بروز ان کی شہرت و مقبولیت میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وقت کی گردش نے ان کے علمی و ادبی کارناموں پر آج بھی گرد نہیں پڑنے دی۔ ان کے ۸۰۰ ویں جشن پیدائش کے موقع پر ترکی کی درخواست پر اقوام متحدہ کے ادارہ برائے تعلیم، ثقافت و سائنس یونیسکو نے ۲۰۰۷ء کو بین الاقوامی سالِ رومی قرار دیا۔ اس موقع پر یونیسکو تمغا بھی جاری کیا گیا۔

آج اکیسویں صدی کے انسان نے سائنس اور سماجی علوم میں اتنی ترقی کر لی ہے کہ ستاروں پر کمندیں ڈالی جا رہی ہیں۔ نئے سیارے تلاش کیے جا رہے ہیں۔ نئی دنیا کی تلاش میں خلانوردی کی جا رہی ہے۔ مگر افسوس کہ جہاں ہمارا علم و شعور تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے وہیں تعصب، تنگ نظری، نسل پرستی، فرقہ واریت اور برتری کی جنگ بھی جاری ہے۔ اپنی برتری ثابت کرنے کے لیے دنیا کے بازار میں انسانوں کے خون کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہ گئی۔ ایسے حالات میں رومی کے اشعار کی معنویت میں چار چاند لگ جاتے ہیں جن کی شاعری کا مذہب صلح کل ہے۔ مصنف موصوف نے ان کی شاعری کی اسی عصری معنویت کے پیش نظر اردو میں ایک جامع کتاب ترتیب دینے کا فیصلہ کیا۔ وہ عرض حال کے ذیل میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

”آج سے تقریباً آٹھ سو سال قبل مثنوی معنوی کی شکل میں جو عشق کی داستان مولانا رومی کی زبان سے کہی گئی اس کے عرفانی سمندر میں نہ جانے کتنے غواصوں نے غوطے لگائے اور اپنی

وسعت مطالعہ اور دقت نظر کے توسط سے اس کے مفاہیم کو سمجھنے سمجھانے کی کوشش کی مگر بالآخر اپنی کوتاہ دستی کے معترف ہوئے۔ مولانا کی مثنوی در اصل عمل سے عاری، مفلوک الحال اور پریشان قلوب کی تسکین کا سامان ہے۔ اس میں جہاں مریض دلوں کے لیے متاع شفا ہے وہیں منجمد قلوب کے لیے عملی حرارت پیدا کرنے والی ایک ایسی چنگاری ہے جو اپنی ابتدائے تخلیق سے تا ہنوز پیہم سلگ رہی ہے اور ہر شخص اپنی اہلیت کے بقدر اس سے حرارت حاصل کر رہا ہے۔“ [ص ۳۰]

مصنف موصوف نے اس کتاب کی تصنیف میں بڑی محنت، لگن اور دیدہ ریزی کا مظاہرہ کیا ہے۔ مولانا کے حالات زندگی کے ساتھ ان کے علمی و ادبی کارناموں کا مختصر مگر جامع انداز میں جائزہ لیا ہے۔ انھیں زبان و بیان پر مکمل دسترس حاصل ہے۔ اپنے مافی الضمیر کو کماحقہ ادا کرنے پر قادر ہیں۔ انھوں نے کتاب میں استدلالی زبان استعمال کی ہے۔ نہ لفاظی ہے نہ بے جا تفصیل۔ یہ کتاب رومی شناسی کے باب میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ مدلل انداز بیان اختیار کرنے پر ان کو دل کی گہرائیوں سے مبارک باد۔ امید قوی ہے کہ ان کا علمی و ادبی سلسلہ مزید جاری و ساری رہے گا اور اس سے تشنگان علوم و فنون کے ذوق کی آبیاری ہوتی رہے گی۔

☆☆☆

نام کتاب : طرزی شناسی
مصنف : احتشام الحق
صفحات : ۲۴۰ — قیمت : ۳۰۰/روپے
سال اشاعت : ۲۰۲۴ء — مطبع : ندارد
ناشر : دربھنگہ ٹائمز پبلی کیشنز، پرانی منصفی، دربھنگہ
تبصرہ نگار : فیضان حیدر (معروفی)

”فردوسی کا مصرعہ: ”عجم زندہ کردم بدین پارسی“ آج بھی اہل ایران کے لیے سرمایۂ افتخار ہے اور جس طرح یہ مصرعہ سرمایۂ افتخار ہے اسی طرح اس مصرعے کا خالق فردوسی بھی، اہل ایران ہی نہیں بلکہ اہل ہند کے لیے بھی اور اہل ہند ہی کیا وہاں وہاں جہاں زندگی ہے، زندہ دلی ہے، احساس ہے، شعور ہے، ذوق ہے، وجدان ہے، سرمایۂ افتخار ہے۔ فردوسی نے

شاہنامہ لکھ کر اس وقت کے ایران کو آج بھی زندہ و تابندہ رکھا ہے تو ہمارے عہد میں بہار کی ادبی روایتوں کو زندہ رکھنے اور انھیں جلا بخشنے کے لیے بہار کے دربھنگہ میں بھی ایک فردوسی پیدا ہوا ہے جسے لوگ حافظ عبدالمنان طرزی کہتے ہیں۔'' (ص ۹)

مذکورہ اقتباس مصنف کی کتاب کی 'تمہید' سے اخذ کیا گیا ہے۔ اس اقتباس کے مطالعے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پروفیسر عبدالمنان طرزی کی علمی و ادبی شخصیت کا دائرہ کتنا وسیع ہے۔ لیکن راقم السطور کو مصنف کی رائے سے اختلاف ہے۔ انھوں نے اس اقتباس میں ان کو سرزمین دربھنگہ کا فردوسی قرار دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ انھوں نے دربھنگہ کی علمی و ادبی شخصیات کو ادبی حلقوں میں متعارف کرا کر انھیں جاودانی عطا کی۔ لیکن فردوسی سے ان کی شخصیت کا تقابل کسی بھی صورت میں درست نہیں ہے۔ کیوں کہ دونوں کی خدمات کا میدان جداگانہ ہے۔

زیر نظر کتاب میں مصنف نے پروفیسر عبدالمنان طرزی کی پیدائش، نام و نسب، حلیہ، تعلیم، ملازمت، اخلاق و عادات، شاعری، علمی و ادبی خدمات کے ساتھ ان کی شاعری کے عمدہ نمونے جمع کیے ہیں۔ مزید برآں انھوں نے پروفیسر طرزی کے سلسلے میں مختلف ناقدین کی آرا کا ایک انتخاب بھی پیش کیا ہے جس سے ان کی شخصیت کے خدوخال کے ساتھ ان کی علمی و ادبی میدان میں شناخت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ ۱۹۷۱ء میں منظر عام پر آیا۔ اس کے بعد سے ان کی علمی و ادبی زندگی میں ایک خلا سا محسوس ہوتا ہے۔ تاہم 'رفتگاں و قائماں' کے نام سے ان کی دوسری کتاب ۲۰۰۱ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد سے وہ مسلسل علم و ادب کی خدمت میں مصروف و منہمک ہیں۔

کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر طرزی نے اپنی شاعری کی ابتدا نعتیہ اشعار سے کی۔ یہ تقریباً ۵۵-۱۹۵۴ء کی بات ہے۔ لیکن ان کا پہلا مجموعہ کلام جو 'لکیر' کے نام سے شائع ہوا، اس میں غزلیں، نظمیں، رباعیاں، قطعات اور سانیٹ شامل ہیں۔ ان کی غزلوں میں حلاوت، شیرینی، موسیقیت و غنائیت کے ساتھ جذبات و احساسات کا بے محابا اظہار ملتا ہے۔ ان کی غزلوں پر کلاسکیت کا رنگ چھایا ہوا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو کے کلاسیکی شعرا کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ خصوصاً اردو کے مشاہیر شعرا کا عکس اور ان کی تقلید ان کی غزلوں میں نمایاں طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ جذبات و احساسات کی شدت کے باوجود انھوں نے ابتذال اور سوقیت سے اپنا دامن بچائے رکھا اور عشق و محبت میں گزرنے والی کیفیات کے بیان میں ایسا انداز اپنایا ہے کہ جس سے وہ سطحی جذباتیت کی حدوں سے نکل کر آفاقیت کے میدان میں داخل ہو جاتے ہیں۔ زیر نظر کتاب کی پہلی غزل کے چند اشعار بطور نمونہ پیش کیے جا سکتے ہیں۔

سر مقتل اٹھیں آنکھیں نہ لب پر تیرا نام آیا — یہاں بھی پاس ناموس محبت میرے کام آیا
تبسم خیز کلیاں ہیں ترنم ریز بلبل ہے — چمن میں یا الٰہی! کون یہ مست خرام آیا
دم آخر جواب پرسش احوال کیا دیتا — کبھی اک تیغ جوہر دار بن کر بے نیام آیا
جہاں خود بڑھ کے منزل راہ روکے پاس آئی تھی — جنوں کے راستے میں ایک ایسا ہی مقام آیا

طرزی نے غزل کے ساتھ نعت گوئی میں بھی قابل رشک مقام حاصل کیا ہے۔ انھوں نے عمدہ نعتیں کہی ہیں۔ ان کی نعتیں حضور پاک سے ان کے عشق و محبت کی غماز ہیں۔ گویا نعت گوئی سے ان کو سکون قلب حاصل ہوتا ہے۔ نعت گوئی کے وقت ان پر بے خودی، وارفتگی اور جذب کی سی کیفیت طاری رہتی ہے۔ خود حقیر نے ان کو نعت پڑھتے ہوئے کئی بار سنا ہے۔ وہ اپنی نعتوں سے سامعین پر ایک سماں باندھ دیتے ہیں۔ ان کے اشعار کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اردو کے ساتھ عربی و فارسی زبان و ادب پر بھی گہری دسترس رکھتے ہیں ساتھ ہی فن عروض و بلاغت کی پاسداری بھی کرتے ہیں جو شاعری کے لیے لازمی شے ہے۔

ان کی بیانیہ شاعری خصوصاً خاص خاص موضوعات پر نظمیں اپنی زبان کی شیرینی، شگفتگی اور روانی کی وجہ دے دامن دل کھینچتی ہیں۔ انھوں نے حسین تشبیہات، خوب صورت ترکیبات اور پر لطف محاورات کا برمحل استعمال کیا ہے جس سے ان کی بیانیہ شاعری میں سحر انگیز کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ ان کی نظم 'شیر و شاعر' کے چند اشعار دیکھیے۔

شعر کہنے کی تمنا دل میں تھی — اک جنوں تھا اپنا شوق شاعری
ہیں پرانے اور نئے پرچے کئی — ان میں بھی تخلیق اپنی آئے گی
اپنی قسمت نے اگر کی یاوری — پائے گی اعزاز بھی پھر شاعری
گر کسی کو شوق کہ شاعر بنے — رام بابو وید، پٹنہ سے ملے
روڈ نمبر سات سیٹی میں نواس — شائقین شعر گوئی کی ہے آس
شاعری کے سیکھنے کی پہلی فیس — جمع کردی میں نے بھی مبلغ اکیس
یعنی میں اکیس روپے میں جناب — جارہا تھا بننے بھی اہل کتاب
کیا عجب اللہ بخشے وہ مقام — بعد غالب آئے گا اپنا بھی نام

پروفیسر عبدالمنان طرزی ایک عمدہ شاعر، نہایت متواضع اور عظیم انسان ہیں۔ اُن کی زبان شستہ اور سلیس ہے، شعری ذوق صاف ستھرا اور معیاری ہے، انھیں الفاظ کو برمحل استعمال کرنے میں زبردست ملکہ

ہے۔ موصوف کی تصانیف اُن کی علمی، ادبی اور شعری بصیرت کی آئینہ دار ہیں جو ان کو فکری و فنی بلندی اور عظمت عطا کرتی ہیں۔

احتشام الحق صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے یہ کتاب لکھ کر طرزی شناسی میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ اس میں پروفیسر موصوف کے سوانحی کوائف میں اختصار کے ساتھ جامعیت موجود ہے۔ نیز ان کی شاعری کے حسن انتخاب میں بھی ان کا ذوقِ شعر فہمی کارفرما نظر آتا ہے۔ کہیں کہیں وہ طرزی کے شعری اختصاص و انفراد کے بیان میں جانب داری کا بھی شکار ہو گئے ہیں۔ تاہم ان کے اندر ایک بہترین ناقد کا پورا ملکہ موجود ہے۔ اگر وہ اسی طرح مشق و ممارست کرتے رہے تو بہت جلد اردو تحقیق و تنقید میں اپنا جائز مقام حاصل کر لیں گے۔

☆☆☆

براہ کرم فیضان ادب میں تبصرے کے لیے کتابیں مندرجہ ذیل پتے پر ارسال فرمائیں:

Dr. Faizan Haider, Department of Urdu And Persian, C.M. College, Quila Ghat, Darbhanga - 846004, Mob.: 7388886628

مضامین، مقالات اور تخلیقات کے لیے ضروری ہدایات:

۱۔ مضمون خالص تحقیقی، تنقیدی، علمی و ادبی اور غیر مطبوعہ ہو۔ کسی رسالے میں اشاعت کی غرض سے نہ بھیجا گیا ہو۔

۲۔ اگر پندرہ دن کے بعد بھی مقالے کی منظوری اشاعت کی اطلاع موصول نہ ہو تو کسی اور مجلّے میں اشاعت کے لیے بھیجا جا سکتا ہے۔

۳۔ مضمون میں تلخیص کے ساتھ کلیدی الفاظ بھی ہونا لازمی ہے۔ تلخیص تقریباً ڈھائی سو الفاظ پر مشتمل ہو۔ مضمون کم از کم تین ہزار اور زیادہ سے زیادہ چھ ہزار الفاظ پر مشتمل ہو۔ اگر مضمون کی ضخامت چھ ہزار الفاظ سے زیادہ ہوگی تو اسے قسطوں میں شائع کیا جائے گا۔

۴۔ اگر تخلیق کار حضرات اپنی کوئی تخلیق جیسے غزل، مثنوی، قصیدہ، نعت، افسانہ، انشائیہ وغیرہ ارسال کر رہے ہوں تو براہ کرم چند سطروں میں اپنا تعارف بھی لکھ کر بھیجیں۔

۵۔ تبصرے کے لیے کتاب کی دو کاپیاں ارسال کرنا ضروری ہے یا ایک کاپی مع تبصرہ ارسال کی جائے۔ (ادارہ)

☆☆☆

Quarterly *FAIZAN-E-ADAB*
An International Refereed Research Value Journal with
Impact Factor: 3.49
Vol. IX, Issue: I, January to March 2024
RNI: UPURD/2018/74924 —— ISSN: 2456-4001
Website: www.uprorg.in

Address: Urdu And Persian Research Organization, Purana Pura, Kurthi Jafarpur, Mau, U.P. – 275305, Cell: 7388886628, E-Mail: faizaneadab@gmail.com